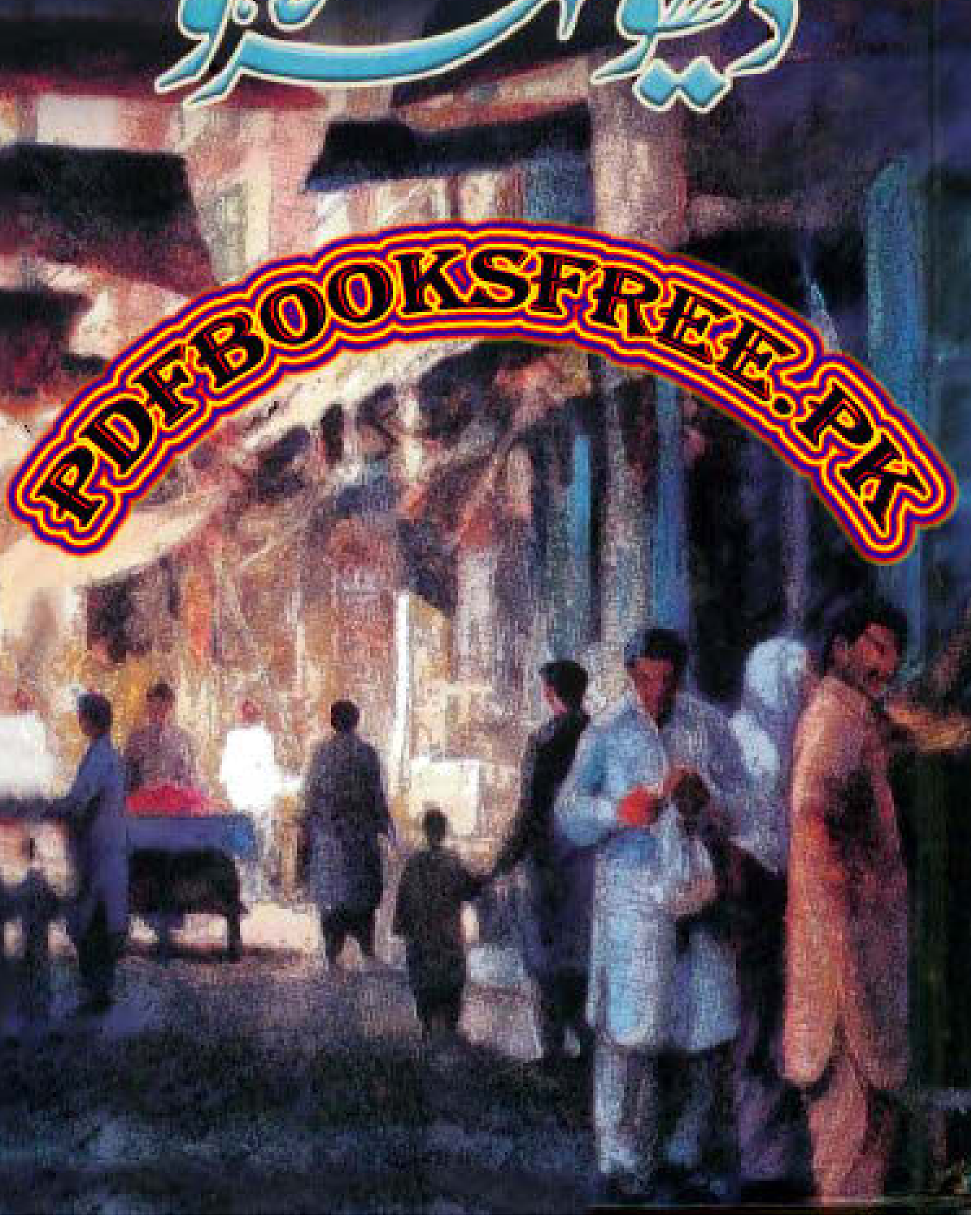
اے حمید

دیکھو شہر لاہور



بسم الله الرحمن الرحيم

دیکھو شہر لاہور

اے حمید

دیکھو شہر لاہور

اے حمید

القریش پبلی کیشنز

ملک جلال دین (وقف) ہسپتال بلڈنگ، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار۔ لاہور۔ ۲۔ فون: 7668958

www.Alquraish.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام...... محمد علی قریشی

باراوّل ـــــــ 2008ء

مطبع ـــــــ نیر اسد پریس

کمپوزنگ ـــــــ کلاسکس گرافکس

قیمت ـــــــ -/200 روپے

انتساب

بہت پیارے

اور بہت عزیز بھانجے

ندیم خواجہ ......

کے نام

۱

قیامِ پاکستان سے پہلے لاہور سے شائع ہونے والے دو انگریزی اخبار پورے برصغیر میں مشہور تھے۔ ایک ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' اور دوسرا ''ڈیلی ٹربیون''۔ ڈیلی ٹربیون اخبار کا دفتر رتن چند روڈ پر میو ہسپتال کے سامنے والی بھارت بلڈنگ میں تھا۔ بعد میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو ''امروز'' اور ''پاکستان ٹائمز'' اخباروں کے دفاتر یہاں آ گئے تھے۔ اس سے پہلے ''امروز'' اخبار ایبٹ روڈ سے نکلتا تھا۔ یہاں ایک بہت بڑا پرنٹنگ پریس ہوا کرتا تھا جو سینئر صحافی م ش صاحب کو الاٹ ہوا تھا۔ یہ نشاط سینما کے پہلو میں ایک بہت بڑا ایک منزلہ کوٹھا تھا۔ اس کے آگے ایک چھتا ہوا احاطہ تھا۔ اس احاطے سے اخبار ''امروز'' نکلا کرتا تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت اس کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ایک لمبے برآمدے کے کونے میں ان کا کمرہ تھا۔ دروازے پر چق پڑی رہتی تھی۔ اندر حسرت صاحب ٹیبل لیمپ جلائے بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔ ''امروز'' کے ادارۂ تحریر میں سید کرمانی، سید سبط حسن، عبداللہ ملک، حمید اختر، شکور احسن اور دوسرے نامور صحافی شامل تھے۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوں تو دائیں جانب ''امروز'' اخبار کا دروازہ تھا اور بائیں جانب کسی ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر تھا۔ جس کے ڈرائیور اور کاریگر باہر کسی نہ کسی ٹرک کا انجن کھول کر اس کی مرمت کرتے اکثر نظر آیا کرتے تھے۔ اس وقت بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی تھی جب ٹرانسپورٹ کمپنی کا کوئی نیا کاریگر غلطی سے مولانا چراغ حسن حسرت کے کمرے میں اس کی چق اٹھا کر انہیں ٹرانسپورٹ

کمپنی کا مینجر سمجھ کر اندر داخل ہوتا اور کہتا۔

''چھبیس اٹھتی (2638) ٹرک کے ڈرائیور نے نیا ٹائر مانگا ہے۔''

اور مولانا حسرت لکھتے لکھتے چونک کر نو وارد کی طرف دیکھتے اور حیرت سے پوچھتے۔''کیا فرمایا مولانا؟''

قیام پاکستان سے پہلے انگریزی اخبار''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے دفاتر مال روڈ کے ریگل والے چوک میں بھٹی فوٹو گرافر اور''شیزان ریسٹورنٹ'' سے ذرا آگے ایک پرانی ایک منزلہ عمارت کے لمبے برآمدے میں ہوا کرتے تھے۔ یہ انگریزی اخبار پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد تک بھی شائع ہوتا رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ شبلی بی کام اس اخبار کے کمرشل ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ میں اور ظہور الحسن ڈار ان سے ملنے وہاں جایا کرتے تھے۔ اس اخبار کی تاریخی خصوصیت یہ تھی کہ مشہور انگریز ناول نگار رڈیارڈ کپلنگ کبھی اس اخبار کے ایڈیٹر رہے تھے۔''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے لمبے برآمدے میں ایک کمرے کے باہر تانبے کی چمکیلی پلیٹ لگی تھی جس پر حروف کھود کر انگریزی میں لکھا تھا کہ''اس کمرے میں رڈیارڈ کپلنگ بیٹھ کر کام کیا کرتے تھے۔''

''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' والی عمارت کے ذرا آگے مشہور جرمن فوٹو گرافر ردلو کی دکان ہوا کرتی تھی۔ یہ فوٹو گرافر رنگین پورٹریٹ بنانے اور نئے شادی شدہ جوڑوں کی یادگار فوٹو بنانے میں ماہر تھا۔ اس سے آگے چینی دندان ساز اور جوتے بنانے والوں کی دکانیں تھیں۔ میں ان دکانوں کے نام بھول گیا ہوں۔ یہ چینی دندان ساز سونے کے خول چڑھا کر نقلی دانت لگاتے تھے۔ ان میں سے اکثر کے اپنے دانتوں پر بھی سونے کے خول چڑھے ہوتے تھے۔ شام کو دکان کے آگے کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے۔ اپنی چینی زبان میں ہنس ہنس کر جب وہ باتیں کرتے تھے تو ان کے سونے کے دانت چمکا کرتے تھے۔ چینی جوتا ساز کے جوتے بے حد مضبوط اور دیدہ زیب ہوتے تھے۔ پاؤں ٹوٹ سکتے تھے مگر ان کے جوتے نہیں ٹوٹتے تھے۔

یہ چینی جوتا ساز اور ردلو فوٹو گرافر قیام پاکستان کے بعد بھی مال روڈ پر اپنا کاروبار

کرتے رہے تھے۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ مناظر بھی غائب ہو گئے۔ اب یہاں نئے نئے شاپنگ سنٹر کھل گئے ہیں جہاں صبح سے رات تک خریداروں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور جہاں کبھی چینی دندان ساز شام کے وقت کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور گپ شپ کیا کرتے تھے وہاں اب نئے ماڈل کی گاڑیوں کا اتنا رش ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے پیدل چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے آگے فیروز سنز والی بلڈنگ آ جاتی ہے۔ اس بلڈنگ میں جہاں آج کل ماورا پبلشرز والوں کا شوروم ہے وہاں سمتھ اینڈ کیمبل کیمسٹ والوں کی دکان ہوا کرتی تھی۔ آغا بابر اپنی کتاب ''خدوخال'' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز میں لکھتے ہیں کہ یہاں تقسیم سے بہت پہلے انگریز لڑکیاں سیلز گرلز ہوا کرتی تھیں۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے کچھ عرصہ پہلے کی باتیں ہیں۔ میں نے سمتھ اینڈ کیمبل کیمسٹ کی دکان ضرور دیکھی ہے۔ میں اور ابن انشاء وہاں غیر ملکی پرفیوم وغیرہ خریدنے جایا کرتے تھے۔ مگر افسوس کہ ہمارے زمانے میں وہاں انگریز سیلز گرلز نہیں ہوا کرتی تھیں۔ آغا بابر لکھتے ہیں کہ جہاں آج کل فیروز سنز کا شوروم ہے وہاں پہلے ایک انگریز جے ریز اینڈ سنز کی کتابوں کی دکان ہوا کرتی تھی۔ جے ریز اینڈ سنز والوں کو دیکھنے کا بھی مجھے اتفاق نہیں ہوا۔

مال روڈ پر عجائب گھر سے ذرا آگے ٹولنٹن مارکیٹ لاہور کی واحد فوڈ مارکیٹ تھی جو اب بھی ہے مگر تعمیر نو کے عمل میں سے گزر رہی ہے۔ لاہور کی انتظامیہ نے اس مارکیٹ کو گرا کر یہاں ایک کمرشل کمپلیکس بنانے کا پروگرام بنایا تھا اور اس مارکیٹ کی کچھ توڑ پھوڑ بھی ہوئی تھی۔ لیکن پریس میں کنٹرووَرسی چل پڑی کہ یہ عمارت لاہور کی پرانی عمارتوں میں سے ایک یادگار عمارت ہے۔ اسے منہدم نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کی تعمیر نو کی جائے۔ چنانچہ اسے گرانے کا پروگرام روک دیا گیا اور اس کی بجائے اب ٹولنٹن مارکیٹ کو ویسی ہی شکل و صورت میں رکھ کر مارکیٹ کی دکانوں کو مزید کشادہ بنائے جانے کا پروگرام ہے۔ لاہور میں رہنے والے انگریزوں نے یہ مارکیٹ خاص اپنے لئے بنوائی تھی۔

انگریزوں نے اس قسم کی فوڈ مارکیٹیں کولمبو اور رنگون میں بھی بنوا رکھی تھیں۔ رنگون میں اسی طرح کی ایک مارکیٹ تھی جس کا نام سکاٹ مارکیٹ تھا۔ وہاں بھی گوشت، پھل فروٹ، سبزی ترکاری، پنیر، انڈے، بسکٹ وغیرہ تازہ حالت میں دستیاب تھے اور یہ ساری چیزیں انگریزوں کے واسطے انگلستان سے منگوائی جاتی تھیں۔ اس سے آگے کمرشل بلڈنگ تھی۔ اس بلڈنگ میں جو دکانیں تھیں وہاں تمام چیزیں ساختہ انگلستان کی ہوتی تھیں۔ بقول آغا بابر بٹالوی ان دکانوں کے مالک اور مینجر انگریز ہوتے تھے۔ سیلز گرلز بھی انگریز یا اینگلو انڈین ہوتی تھیں۔ جو اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے مشہور تھیں۔

انگریزوں کے چلے جانے کے بعد کمرشل بلڈنگ کی ساری دکانیں مہاجرین نے الاٹ کروا لیں۔ یہاں کہیں ریڈی میڈ گارمنٹس کی، کہیں جنرل مرچنٹس کی، کہیں کھلونوں کی اور کہیں دواؤں کی دکانیں کھل گئیں۔

یہاں کھلونوں کی ایک دکان تھی (شاید وہ اب بھی ہے) اس دکان کا ادھیڑ عمر مالک بڑا کم سخن اور خوش اخلاق تھا۔ اس دکان کے اندر افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اکثر آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے انہیں کئی بار دکان کے پچھلے حصے میں بیٹھے اور چائے وغیرہ پیتے دیکھا ہے۔ اسی کمرشل بلڈنگ میں ''ڈائریکٹر'' نام کے فلمی رسالے کا دفتر بھی تھا، جو چودھری فضل حق صاحب مرحوم کی زیر ادارت نکلتا تھا۔ شباب کیرانوی اس رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ اس رسالے میں مشہور کارٹونسٹ شوکت عرف شوکی کے دلچسپ کارٹون چھپا کرتے تھے۔ اپنے بعض بڑے ضروری اخراجات پورے کرنے کے لئے منٹو صاحب بھی اس رسالے میں لکھا کرتے تھے۔ میں کبھی کبھی پاک ٹی ہاؤس سے اٹھ کر ''ڈائریکٹر'' رسالے کے دفتر میں آ جاتا تھا۔ کئی بار منٹو صاحب کو میں نے وہاں تشریف لاتے دیکھا تھا۔ وہ آتے، خاموشی سے مضمون یا افسانے کا مسودہ چودھری صاحب کے حوالے کر کے اس کا معاوضہ وصول کرتے اور خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ یہ لاہور میں اردو کے اس عظیم افسانہ نگار منٹو کی زندگی کے آخری شب و روز تھے۔

دیال سنگھ مینشن میں ریگل سینما سے ایک بلاک چھوڑ کر ایک عمارت کی دوسری

منزل میں روزنامہ ''آفاق'' کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ یہ سن 55-1954ء کی بات ہے۔ میں، ناصر کاظمی، انتظار حسین اور علی سفیان آفاقی بھی اس اخبار سے وابستہ تھے۔ انتظار حسین اور علی سفیان آفاقی ''آفاق'' کے لئے کالم لکھتے تھے۔ ناصر کاظمی دن کی شفٹ میں ہوتا تھا، میں رات کی شفٹ میں کام کرتا تھا، جہاں خبروں کا ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ رات کی شفٹ کے انچارج قیوم قریشی صاحب تھے جنہیں خبروں کا تیز تیز ترجمہ کرنے کا بڑا تجربہ تھا۔ خبروں کے ترجمے کے معاملے میں قیوم قریشی میرے پہلے استاد تھے۔ مجھے تو پھر بھی اخباروں میں کام کرنے کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ لیکن ناصر کاظمی کو بالکل نہیں تھا۔ اس زمانے میں ان کی شفٹ میں عام طور پر خبروں کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی بلکہ قینچی چلا کرتی تھی۔ یعنی دوسرے اخباروں سے خبریں کاٹ کر کاتب کو کتابت کے لئے دے دی جاتی تھیں یا پھر دوسرے شہروں اور مضافات کے نامہ نگاروں کی آئی ہوئی خبریں کاٹ چھانٹ کر کاتب کے حوالے کر دی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں لاہور کے ایک دُبلے پتلے نوجوان نے جو حسرت تخلص کرتا تھا، اُردو پریس کے نام سے خبروں کی ایک سروس شروع کی تھی۔ گوالمنڈی کی گاندھی اسٹریٹ کے ایک مکان کی بیٹھک میں اُردو پریس سروس کا دفتر تھا۔ دفتر کیا تھا، دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک چارپائی پر حسرت خود بیٹھا شہر میں گھوم پھر کر معلوم کی ہوئی خبریں کاربن پیپر لگا کر اردو میں لکھتا جاتا تھا اور ایک چھوٹا لڑکا ان خبروں کی ایک ایک کاپی چارپائی پر ساتھ ساتھ لگاتا جاتا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خبروں کو سکھانے کے لئے ڈال رکھا ہے۔ اب یاد آیا کہ ان دنوں ''آفاق'' اخبار میں برہان الدین حسن صاحب بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ یہ بھی دن کی شفٹ میں ہوتے تھے۔ سید نور احمد اس اخبار کے جنرل مینجر تھے۔ منٹو صاحب ''آفاق'' کے سنڈے ایڈیشن کے واسطے بھی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے لکھا کرتے تھے۔ یہاں بھی ان کا یہی طریق کار تھا۔ لکشمی مینشن جہاں منٹو صاحب کا مکان تھا ''آفاق'' اخبار کے بالکل سامنے واقع تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی ایک دو صفحے کا مضمون یا افسانہ لکھ کر لاتے اور خزانچی کے حوالے کر کے

معاوضہ لے کر خاموشی سے واپس چلے جاتے۔ اخبار کے مینجر اور سید نور احمد کے صاحب زادے اقبال صاحب کی طرف سے ایک خزانچی کو خصوصی ہدایت تھی کہ منصور صاحب جب بھی کوئی مسودہ لے کر آئیں، انہیں فوراً معاوضہ ادا کر دیا جائے۔

ناصر کاظمی کو بھی میری طرح ایڈوانس لینے کی بڑی عادت تھی۔ دراصل ہمیں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پیسٹری اور سگریٹ پینے کے لئے پیسوں کی ضرورت رہا کرتی تھی۔ پبلشر سے خواہ یک مشت کتنی بھاری رقم کیوں نہ ملتی، وہ دو چار روز میں ختم ہو جاتی تھی اور اس کے بعد اگلا مسودہ مکمل کرنے تک ایڈوانس کی ضرورت ہوتی تھی۔ میرا تجربہ ہے کہ اخبار کے لئے کوئی مضمون لکھنا بڑا آسان کام ہے مگر اخبار کے خزانچی سے اس کا معاوضہ یا اگلے مضمون کے لئے ایڈوانس وصول کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے، ٹی ہاؤس میں بیٹھے ناصر کاظمی نے ایک بار مجھے کہا تھا ''اے حمید! پبلشر سے ایڈوانس وصول کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جاتے ہی کہہ دو کہ مجھے اتنا ایڈوانس چاہئے۔ جتنی دیر کرو گے اتنی ہی ہمت کمزور ہوتی جائے گی۔''

''آفاق'' اخبار کا خزانچی بھی روایتی خزانچی تھا اور ایڈوانس اتنی آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ میں ایک بار خزانچی سے پندرہ روپے ایڈوانس لینے گیا تو میں نے جاتے ہی ان کے سامنے چٹ رکھ دی جس پر لکھا تھا، میرے دادا جان کا انتقال ہو گیا ہے، مجھے پندرہ روپے ایڈوانس چاہئیں۔ خزانچی صاحب نے بڑے آرام سے ایک رجسٹر میں سے میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ چٹھی نکال کر میرے سامنے رکھ دی اور کہا۔

''آپ اپنے دادا جان کو دو مرتبہ پہلے بھی مار چکے ہیں۔''

◎......◎

لاہور میں پنجاب اسمبلی کی عالی شان عمارت کے سامنے باغیچے میں جہاں پتھر کی ایک بارہ دری میں ملکہ وکٹوریہ کا بت ہوا کرتا تھا، وہاں بے شمار درخت ساتھ ساتھ کھڑے ہوا کرتے تھے۔ ان درختوں کی وجہ سے پلازہ سینما کی طرف سے مال روڈ پر آئیں تو پنجاب اسمبلی کی پوری عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ان درختوں کی وجہ سے وہاں بڑی بہار لگی ہوتی تھی اور وہ بڑے اچھے لگتے تھے۔

قیام پاکستان کے کافی بعد تک درختوں کا یہ ذخیرہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ پھر ان درختوں کو کٹوا دیا گیا۔ ایک دن مجھے یاد ہے، میں اور منیر نیازی مال روڈ پر سے گزر رہے تھے۔ جب ہم چیئرنگ کراس کے چوک میں پہنچے تو میں نے پنجاب اسمبلی کی عمارت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہاں بڑے خوبصورت گھنے درخت ہوا کرتے تھے۔ جب سے وہ کٹوائے گئے ہیں اس جگہ کا حسن تباہ ہو گیا ہے۔''

منیر نیازی نے اسمبلی ہال کے سامنے والے درختوں سے خالی باغیچے کی طرف دیکھا اور بولا۔

''لیکن یہ بھی دیکھ کہ ان درختوں کے کٹوانے کی وجہ سے روشنی اور کشادگی کا ایک نیا در کھل گیا ہے۔''

اس کی بات میرے دل کو لگی تھی۔ جب میں نے منیر نیازی کی نظروں سے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ واقعی پنجاب اسمبلی کے سامنے والے باغیچے کا منظر پہلے سے زیادہ دلکش، روشن اور کشادہ لگنے لگا ہے۔

لاہور میں کئی جگہیں ایسی ہیں کہ جہاں پہلے وہ شان نہیں ہوا کرتی تھی جو اس کی تعمیر نو کے بعد شان نکل آئی ہے۔ مثال کے طور پر ایبٹ روڈ کی طرف سے شملہ پہاڑی کی طرف جائیں تو چوک کی بائیں جانب ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے سامنے انگریزوں کے شروع شروع کے زمانے کی زرد رنگ کی ایک خستہ حال کوٹھی کے پہلو میں ویران ویران سی کھلی جگہ ہوا کرتی تھی جہاں جگہ جگہ جھاڑ جھنکاڑ کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ اس کھلی جگہ میں ایک پھونس ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام ہی پھونس ہوٹل تھا۔ یہاں گھاس پھونس کے چھپر کے نیچے لوگ ٹوٹی پھوٹی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ نقشہ بالکل بدل گیا ہے۔

آپ ایبٹ روڈ سے چوک شملہ پہاڑی میں آئیں تو اچانک بائیں جانب بلند و بالا، جدید عمارتیں سر اٹھائے سینہ تانے کھڑی نظر آتی ہیں۔ دھوپ میں ان ہائی رائز عمارتوں کے شیشے چمک رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عمارت نہیں ہے بلکہ ساتھ ساتھ کھڑی کتنی ہی عمارتیں ہیں جنھوں نے پھونس ہوٹل کے ویران منظر کو پہلے سے زیادہ با وقار، عالی شان اور جدید ترین بنا دیا ہے۔

اسی طرح قیامِ پاکستان کے کافی بعد تک جب ہم وحدت روڈ والے چوک سے مسلم ٹاؤن والی نہر کی طرف آتے تھے تو ہمیں نہر کی بائیں جانب ایک کچا دھول اڑاتا راستہ نہر کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کیمپس کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ نہر کی دوسری جانب کوئی باقاعدہ فٹ پاتھ نہیں تھا۔ یہاں جنگلی جھاڑیاں اور بے ترتیبی سے اُگے ہوئے پتلے پتلے درخت نظر آیا کرتے تھے۔ نہر کے کنارے کٹے پھٹے تھے۔ مگر اب یہ منظر بدل گیا ہے۔ اب مسلم ٹاؤن والی نہر کی دونوں جانب پختہ کارپٹ روڈ ہے جن پر دونوں جانب اُگے ہوئے یوکلپٹس کے درختوں نے چھاؤں ڈال رکھی ہے۔ اس سڑک پر گاڑیاں آتی ہیں، دوسری سڑک پر گاڑیاں جاتی ہیں۔ نہر میں دن کے وقت سجے سجائے رنگین بجرے چلتے ہیں۔ رات کو نہر کے دونوں کناروں پر چھوٹے چھوٹے بجلی کے بلب روشن ہو کر نہر کو بھی روشن کر دیتے ہیں۔ یونیورسٹی کیمپس کے پاس نہر پر ایک

خوبصورت پُل بنا دیا گیا ہے۔ اب اس جگہ دو انڈر پاس بن گئے ہیں جن کی وجہ سے ٹریفک جام نہیں ہوتی۔ بائیں جانب ماڈرن کالونی جوہر ٹاؤن اور گارڈن ٹاؤن کی خوبصورت کوٹھیاں ٹھوکر نیاز بیگ تک بلکہ اس سے بھی آگے تک چلی گئی ہیں۔ بائیں جانب ٹریفک کا زور کم کرنے کے واسطے کئی ایک خوبصورت پکی ذیلی سڑکیں بن گئی ہیں۔ رات کے وقت یہ سارا علاقہ جگمگ جگمگ کر رہا ہوتا ہے۔ لگتا ہے چمکتے ستاروں کا جھرمٹ آسمان سے اتر کر لاہور کی سڑکوں پر آ گیا ہے۔

لاہور، قیام پاکستان کے بعد شہر کی چار دیواری کے باہر بہت بدل گیا ہے اور بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ جن لوگوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے کا بھاٹی دروازہ، شاہ عالمی دروازہ، بادامی باغ، ٹیکسالی گیٹ، گارڈن ٹاؤن، مسلم ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن کو دیکھا ہے وہ آج ان علاقوں کو دن کے وقت بھی پہچان نہیں سکیں گے۔ رات کے وقت تو گلبرگ، فیصل ٹاؤن، شادمان، علامہ اقبال ٹاؤن، جوہر ٹاؤن، ڈیفنس، جیل روڈ، ہائی وے اور کلمہ چوک میں اس قدر روشنیاں ہوتی ہیں کہ لگتا ہے بقول شاعر تنویر نقوی کی چاندنی کی برات زمین پر اتر آئی ہے۔

لاہور کی تعمیر نو کے اس عمل سے لاہور کہیں تو پہلے سے زیادہ دلفریب، دلکش اور کشادہ ہو گیا ہے لیکن کہیں کہیں کچھ ایسے تاریخی اور ثقافتی اور ادبی منظر بھی غائب ہو گئے ہیں جن کا باقی رہنا بہت ضروری تھا۔ اور جو لاہور کی صدیوں پرانی تاریخ کے نشان تھے۔ ٹولنٹن مارکیٹ کے چوک سے آپ مال روڈ پر ریگل چوک کی طرف آئیں تو بائیں ہاتھ کو شروع میں ہی مال کی ذیلی سڑک کے کونے میں سیٹلائٹ بلڈنگ ہوا کرتی تھی۔ اسی عمارت کے کونے میں انگریزی ادبی کتابوں کی دکان ہوا کرتی تھی جس کا نام کرشنا بک ہاؤس تھا۔ بعد میں جہاں تک مجھے یاد ہے اس دکان کا نام مرزا بک سینٹر ہو گیا تھا۔ اس بلڈنگ میں دو ریستوران ساتھ ساتھ تھے۔ ایک کا نام کافی ہاؤس تھا۔ اس کے ملحق جو ریستوران تھا اس کا نام چائنیز لنچ ہوم تھا۔ جس کو چینی لنچ ہوم بھی کہا جاتا تھا۔ چینی لنچ ہوم میں زیادہ تر لاہور کے وکلاء، موسیقار اور وہ لوگ آ کر بیٹھتے تھے جنہیں چینی

لنچ ہوم کے سری پائے اور تندوری روٹی پسند تھی۔ ادیب اور شاعر بھی یہاں اکثر نظر آ جاتے تھے۔ مشہور گلوکار استاد امانت علی خان اور کبھی کبھی افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی اپنے پرستاروں کے ساتھ آ کر بیٹھتے تھے۔ جبکہ کافی ہاؤس لاہور کے سینئر صحافیوں، ان کے پرستاروں، پنجاب یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں کا ٹھکانہ تھا۔ مولانا چراغ حسن حسرت، عبداللہ بٹ، باری علیگ، لاہور کالج میں انگریزی کے استاد علاؤ الدین کلیم اور صدیق کلیم، سر عبدالقادر کے صاحب زادے ریاض قادر، منظور قادر، اعجاز حسین بٹالوی، مجید نظامی، نیشنل کالج آرٹ آرٹس کے استاد اور مشہور مصور شاکر علی، علی امام، پرویز (میں اس کا اصل نام بھول گیا ہوں شاید احمد پرویز تھا) ایسے نامور مصور اکثر کافی ہاؤس آتے تھے اور اپنی محفل جماتے تھے۔

لاہور میں کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس کے بعد لٹریچر، آرٹ، صحافت اور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ پاکستان کے دوسرے شہروں سے آرٹ اور ادب کے شیدائی کافی ہاؤس کو دیکھنے اور اس میں بیٹھ کر کافی پینے کی خواہش لے کر لاہور آتے تھے۔ جس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم تھے انہوں نے کافی ہاؤس میں دانشوروں کے ساتھ کافی پینے کی خواہش ظاہر کی۔ اور پھر جب وہ لاہور آئے تو کافی ہاؤس بھی آئے۔ کافی ہاؤس پاکستان کے ادبی اور ثقافتی ورثے کی شناخت تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ کافی ہاؤس کی محفلیں بکھر گئیں۔ پرانے بادہ کش ایک ایک کر کے اٹھتے چلے گئے۔ کسی نے آب بقائے دوام کی تدبیر نہ کی اور ایک دن کافی ہاؤس بند ہو گیا۔ اس کے قینچی دار لوہے کے دروازے پر موٹا سا تالا پڑ گیا۔

کہتے ہیں کہ کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس دو سکھ بھائیوں کی ملکیت تھے۔ ان کا پہلا نام انڈیا ٹی ہاؤس اور انڈیا کافی ہاؤس تھا۔ ان دو سکھ بھائیوں نے بھارت (دہلی) میں بھی کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کی ایک ایک شاخ کھول لی تھی۔ ٹی ہاؤس کے مالک سراج صاحب مرحوم کے صاحب زادے نے ایک روز مجھے بتایا کہ میں صبح صبح حسب معمول

ٹی ہاؤس کھول کر کاؤنٹر پر بیٹھا تھا کہ میں نے ایک سکھ کو دیکھا کہ ٹی ہاؤس کے سامنے کھڑا منہ اٹھائے مسلسل ٹی ہاؤس کو تکے جارہا تھا۔ جب دس پندرہ منٹ تک وہ اس حالت میں باہر کھڑا ٹی ہاؤس کے شیشے کے دروازے اور پیشانی پر لکھے ہوئے پاک ٹی ہاؤس کو دس پندرہ منٹ تک دیکھتا رہا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اس سکھ کو اندر بلوا لیا اور پوچھا کہ وہ اتنی دیر سے ٹکٹکی باندھے کیا دیکھ رہے تھے؟ اس سکھ نے کہا: کہ دراصل میں اور میرا بڑا بھائی اس ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے مالک تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد آپ کو الاٹ ہوا ہے۔

کافی ہاؤس قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ کافی ہاؤس کی جگہ پر مہران بینک کھلا، وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب اس کے باہر صرف لوہے کا دروازہ ہے اور لوہے کا بڑا سا تالا ہے۔ کافی ہاؤس کے زندگی سے بھرپور دنوں کی بس اک یاد باقی رہ گئی ہے۔ پاک ٹی ہاؤس چل رہا ہے مگر نہ چلنے کے برابر ہے۔ نیلا گنبد میں آٹو سپیئر پارٹس اور خاص طور پر ٹائروں کے بزنس کی یلغار پاک ٹی ہاؤس تک پہنچ چکی ہے۔ لگتا ہے جلد وہ وقت آنے والا ہے جب پاک ٹی ہاؤس کی جگہ اس کی پیشانی پر ''پاک ٹائر ہاؤس'' لکھا ہو گا۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
(اقبال)

◎......◎

میکلوڈ روڈ پر چوک لکشمی سے ریلوے سٹیشن کی طرف جائیں تو رتن سینما سے ذرا آگے جا کر یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سڑک ایمپریس روڈ کراس کرتی ہوئی پرانے بوہڑ والے چوک کی طرف نکل جاتی ہے جس کا نام نکلسن روڈ ہے۔ دوسری سڑک جو مولانا ظفر علی خان کے نام سے مشہور ہے اخبار ''زمیندار'' کے آفس کے سامنے سے ہوتی ہوئی لاہور ریلوے سٹیشن کی طرف چلی جاتی ہے۔ یہ سڑک بدستور میکلوڈ روڈ ہی رہتی ہے۔ جہاں میکلوڈ روڈ دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے، وہاں بائیں جانب انگریزوں کے زمانے کا ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا جس کا نام لاہور ہوٹل تھا۔ یہ دو منزلہ ہوٹل لاہور کی مڈل کلاس کا ایک روایتی ہوٹل تھا۔ اس کی دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ پہلی منزل میں ایک کشادہ ڈائننگ روم تھا۔ لیڈیز کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے یا چائے پینے کے لئے چار نشستوں والے کیبن بنے ہوئے تھے جن کے آگے پردہ گرا رہتا تھا۔ میکلوڈ روڈ کی جانب قد آدم سے بھی بڑے شیشے لگے تھے جن کے ساتھ ساتھ آمنے سامنے بیٹھ کر چائے پینے کے لئے میز کرسیاں لگی ہوتی تھیں۔ اس علاقے میں ڈیلی اخبار ''مشرق'' اور ''زمیندار'' اخبار کے دفاتر کے علاوہ رتن سینما کے اوپر اور سامنے ہفتہ وار فلمی رسالے ''سکرین لائٹ'' اور ''جاوید'' کے علاوہ کچھ فلم پروڈکشنز اور فلم ڈسٹری بیوٹرز کے دفاتر بھی تھے۔ چنانچہ لاہور ہوٹل میں اردگرد کے محلے کے لوگوں کے علاوہ فلمی اور غیر فلمی اخباروں کے صحافی، کالم نگار اور فلمی میوزک ڈائریکٹر، شاعر اور ادیب بھی چائے پینے آ جایا کرتے تھے۔ لاہور ہوٹل کے نیچے دو دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک کا نام پارسی لانڈری تھا۔ جہاں گول کالی ٹوپی اور گردن تک

بند کالی اچکن والا ایک ادھیڑ عمر پارسی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اکثر نظر آیا کرتا تھا۔ پارسی لانڈری کے ساتھ والی دکان انگریزی کی پرانی کتابوں کی دکان تھی جہاں غیر ملکی رائٹروں کے انگریزی زبان میں ترجمہ کیے گئے ناول، افسانوں اور شاعری کے مجموعے، سوانح عمریاں، سفرنامے اور تنقیدی مضامین کی کتابیں بڑی اچھی حالت میں سستے داموں مل جاتی تھیں۔ قیامِ پاکستان سے ذرا پہلے میں نے ایک دفعہ اس دکان میں ''میں ہوں خانہ بدوش'' کے مصنف دیوندر ستیارتھی کو لٹریچر کی پرانی کتابیں چھانٹتے دیکھا تھا۔ وہ لمبی ٹیگور نما داڑھی سے صاف پہچانا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں نے اسی دکان پر سے گالز وردی کا مشہور ناول ''ایپل ٹری'' شاید دو آنے میں خریدا تھا۔

ذرا آگے ہندو کا ایک دکان نما ہوٹل تھا جس کو ڈھابہ کہتے تھے۔ یہ ایک لمبی سرنگ نما دکان تھی جس کے اندر جا کر ایک جگہ بیٹھ کر کچھ پرانے صحافی جن میں اخبار ''زمیندار'' کے مشہور فکاہیہ کالم نگار حاجی لق لق بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ اس ڈھابے میں، میں نے ان کے ساتھ ایک بار ایک دبلے پتلے، شرمیلی سی خمار آلود آنکھوں والے شاعر کو دیکھا تھا۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو ان کا اسمِ گرامی شاید دل شاہ جہانپوری تھا۔ بیٹھ کر چائے پینے سے مجھے یاد آ گیا، گوالمنڈی میں سکھ سردار جی کا ایک ہوٹل ہوا کرتا تھا جس کی پیشانی پر ایک طرف اوپر سے نیچے آتا ایک بورڈ لگا تھا جس پر اُردو میں لکھا تھا۔

''یہاں بیٹھ کر شراب پینے کی اجازت ہے۔'' ایک سکھ ہی اپنے ہوٹل کے باہر یہ لکھوا سکتا تھا۔

میں واپس لاہور ہوٹل والی بلڈنگ کی طرف آتا ہوں۔ لاہور ہوٹل میں فل سیٹ 12 آنے میں ملتا تھا۔ ایک آنے کی بڑی لذیذ اور خالص پیسٹری ہوتی تھی۔ ایک آنے کی ہی پیٹیز ہوتی تھی۔ بیرے کو چونی ٹپ ملتی تو وہ بڑا خوش ہوتا تھا۔ لاہور ہوٹل کی دم کی ہوئی چائے بڑی خوشبو دار اور رومانٹک ہوتی تھی۔ میری فیملی اور اخلاق احمد دہلوی اور ان کی فیملی اکثر شام کو لاہور ہوٹل کے کسی نہ کسی پردہ دار کیبن میں بیٹھ کر چائے پیا

کرتے تھے۔

فلم پروڈیوسر، ڈائریکٹر اسلم ایرانی کا پروڈکشن آفس لاہور ہوٹل کے قریب ہی تھا۔ اسلم ایرانی ان دنوں جو پنجابی فلم بنا رہا تھا اس کا میوزک طفیل فاروقی تیار کر رہا تھا جو میرا بڑا گہرا دوست تھا۔ چنانچہ میں اور طفیل فاروقی اکثر لاہور ہوٹل میں چائے پینے آ جاتے تھے۔ کبھی کبھی ہمارے ساتھ شاعر حبیب جالب بھی ہوتا تھا۔ میکلوڈ روڈ والی اسی قطار میں آگے جا کر مشہور زمانہ اخبار ''زمیندار'' کا آفس ہوا کرتا تھا۔ یہ بھی دو منزلہ عمارت تھی۔ ان دنوں منیر نیازی اور ظہور الحسن ڈار بھی اخبار زمیندار میں کام کیا کرتے تھے۔ یہ دوپہر کی شفٹ میں ہوتے تھے۔ دفتر میں داخل ہوں تو بائیں جانب مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی مولانا اختر علی خان کا کمرہ تھا۔ اسی کمرے میں کبھی کبھی مولانا اختر علی خان کے چھوٹے بھائی منصور علی خان بھی آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ منصور علی خان سے میری دوستی تھی۔ حاجی لق لق صاحب بھی اس دفتر میں ہوا کرتے تھے۔ زمیندار اخبار کے اس دفتر میں، میں نے پہلی اور آخری بار مولانا ظفر علی خان کو دیکھا۔ وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ جب ''زمیندار'' اخبار پر زوال آیا اور اخبار بند ہو گیا تو اسی زمیندار اخبار والی عمارت میں زمیندار ہوٹل کھل گیا۔ یہ اس مشہور زمانہ اخبار کا افسوس ناک انجام تھا جس میں شائع ہونے والی مولانا ظفر علی خان کی نظمیں دیکھ کر پنجاب کا ہندو پریس اپنے اگلے ہفتے کی پالیسی مرتب کیا کرتا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد زمیندار ہوٹل بھی بند ہو گیا اور پولیس لائن کی گراؤنڈ سے متصل اس عمارت سے وابستہ ''زمیندار'' اخبار کی باقی ماندہ یادوں کی نشانیاں ہی باقی رہ گئیں اور آج ہر لحظہ بدلتے ہوئے تیز رفتار وقت کی موجوں نے ان نشانیوں کو بھی یادِ ماضی میں بدل دیا ہے اور لاہور ہوٹل سے لے کر تاریخی اخبار ''زمیندار'' کی پرانی عمارت تک سارے کا سارا علاقہ موٹر سائیکلوں کی کمرشل مارکیٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ہم اپنے قیمتی ثقافتی اور ادبی ورثے سے اس قدر غافل کیوں ہیں؟

اسی میکلوڈ روڈ پر ''زمیندار'' اخبار کی سامنے والی قطار میں اخبار کے تقریباً سامنے

ایک پارسی ڈاکٹر بیٹھا کرتا تھا جو خاص طور پر بچوں کا علاج کرتا تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر بھڑوچہ تھا۔ درمیانے قد کا شیالی زرد رنگت اور مضبوط بدن والا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ تیز مزاج تھا اور مریضوں سے بھی شاذ و نادر ہی کبھی مسکرا کر بات کرتا تھا۔ ہر وقت تقریباً غصے میں ہوتا تھا۔ بہت کم بات کرتا تھا۔ کوئی فیس نہیں لیتا تھا۔ صرف جو دوا چار خوراکوں والی شیشی میں ڈال کر دیتا تھا اسی کے پیسے لیتا تھا جو بہت واجبی ہوا کرتے تھے۔ بچوں کے علاوہ بڑوں کے زکام، کھانسی، بخار وغیرہ کا بھی علاج کرتا تھا۔ اس کی دوا میں آبِ حیات کی تاثیر ہوا کرتی تھی۔ اس دوا کے کالے سیاہ یا سبز، نیلے محلول کی تین خوراکیں پینے کے بعد سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مریض کو آرام نہ آئے۔ اس کے کلینک میں شیشے کی بڑی بڑی بوتلیں نسواری، سبز، نیلے اور کالے رنگ کی دواؤں سے بھری ہوتی تھیں۔ سارے کلینک میں اس کی سخت کڑوی دواؤں کی تیز بُو پھیلی رہتی تھی۔ ان بڑی بڑی نسواری، سبز، نیلی، کالی دواؤں سے بھری ہوئی بوتلوں کے درمیان ناٹے قد کا ڈاکٹر بھڑوچہ ماتھے پر بل ڈالے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا۔ چلتا پھرتا اٹھارھویں صدی کے انگلستان کا کوئی جادوگر لگا کرتا تھا۔ اس کی دواؤں میں جادو کی تاثیر ہوتی تھی مگر اس کی تیز بُو والی دوائیں بڑی غضب ناک ہوتی تھیں۔ مکسچر کی چار خوراکوں والی شیشی کی گردن میں نسواری رنگ کی جھاگ آ جایا کرتی تھی۔

کوئی یقین نہیں کرے گا کہ ڈاکٹر بھڑوچہ کے مکسچر کی شیشی ہم گھر میں لا کر رکھتے تھے تو اس کا بند کارک اکثر جوشِ بادہ سے اپنے آپ چٹاخ کی آواز سے اُڑ جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس خیال سے کہ مریض دوڑ نہ جائیں، ڈاکٹر صاحب مکسچر دیتے وقت یہ ضرور کہا کرتے تھے کہ شیشی کا کارک خوراک پینے کے بعد زور سے بند کریں اور دوا کو زیادہ نہ ہلائیں۔ لیکن اس کے باوجود جب دوائی کی طبیعت جوش مارتی تو چٹاخ کی آواز سے بوتل کا کارک اُڑ جاتا تھا۔ لیکن کس غضب کا تیر بہدف ڈاکٹر تھا۔ پارسی عمدہ اخلاق کا اعلیٰ نمونہ۔ رحم دل، بے لوث، مرض کا دشمن، مریضوں کا ہمدرد۔ اسے کوئی لالچ نہیں تھا۔ اس کی کوئی فیس نہیں تھی۔ مریض کو دکھانے کے لئے کوئی ٹائم نہیں لینا پڑتا تھا۔ اللہ

تعالیٰ نے کیسی شفا دے رکھی تھی اس کے ہاتھ میں۔ بلاشبہ ڈاکٹر بھڑ وچہ کی دو چار آنے کی دوائی میں مریض کو آرام آ جاتا تھا۔ اب اس مسیحا اثر نیک دل ڈاکٹر کا کلینک بھی غائب ہو گیا ہے اور اس کی جگہ آٹو سپیئر پارٹس اور موٹر سائیکلوں کی مارکیٹ کھل گئی ہے۔ وقت نے تو بدلنا ہی ہوتا ہے۔ ایک عہد ختم ہو جاتا ہے، دوسرا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ جو آج ہے وہ کل نہیں ہو گا۔ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ لیکن کوئی عمل قابل تعریف اس وقت ہوتا ہے جب بہتر شے کے چلے جانے کے بعد اس کی جگہ پر کوئی بہترین شے آ جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر ایسا نہیں ہوتا۔ گردشِ ایام کے ساتھ جب ایک شے نظروں سے غائب ہو جاتی ہے تو نہ صرف یہ کہ اس سے بہتر شے نہیں آتی بلکہ اس جیسی شے بھی پھر دکھائی نہیں دیتی۔ پھر ان گزرے ہوئے اچھے دنوں کی، ان اچھے لوگوں کی بس ایک یاد سی رہ جاتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک کمرے میں تازہ گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھا ہو، کوئی اسے اٹھا کر کمرے سے لے جائے تو کچھ دیر تک کمرے میں گلاب کے پھولوں کی خوشبو ضرور رہتی ہے۔ پھر وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

۞......۞

مال روڈ پر ای پلومرز کیمسٹ کی دکان اب بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ مگر اب وہ بہت بدل گئی ہے۔ کہتے ہیں قیامِ پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے تک اس دکان پر انگریز لڑکیاں بطور سیلز گرلز کام کیا کرتی تھیں۔ یہ لاہور کی سب سے مشہور اور سب سے بڑی دوائیوں کی دکان تھی۔ جو دوائی کہیں سے نہ ملتی ہو، وہ ای پلومرز والوں کے ہاں سے مل جایا کرتی تھی۔ اب یہاں سے کاسمیٹکس کا سامان بھی مل جاتا ہے۔ نظر کی عینکیں بھی دستیاب ہیں۔ مگر اب انگریز سیلز گرلز غائب ہو چکی ہیں۔ ہائیکورٹ کے چوک سے لے کر جی پی او والے چوک تک یہ بلند و بالا مضبوط عمارت جنوب مشرقی ایشیا میں انگریز طرزِ تعمیر کی یادگار عمارتوں میں سے ہے۔

یہ عمارت لاہور کے شدید گرم موسم میں بھی بغیر اے سی کے اب بھی ٹھنڈی رہتی ہے۔ اس کے چھتے ہوئے برآمدے میں سے گزریں تو ای پلومرز کی دکان کے اندر سے اب بھی ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس، کولمبو، رنگون اور سنگاپور میں، میں نے ایسی عمارتیں بہت دیکھی ہیں۔ کلکتہ میں ڈلہوزی اسکوائر کے بائیں جانب میٹرو سینما والی ایسی ہی جہازی سائز کی عمارت کو میں اکثر یاد کرتا ہوں۔ اس کے اونچی چھت والے پچیس تیس فٹ چوڑے چمکیلے فٹ پاتھ میں بڑی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ رات کو یہاں محنت مزدوری کرنے والے مضافات سے آئے ہوئے لوگ قطاروں میں سویا کرتے تھے۔ اپنی آوارہ گردیوں اور خانہ بدوشیوں کے زمانے میں ایک بار رات کے ایک بجے کے قریب میں اس فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا تو نیند سے میرا برا حال تھا۔ دریائے ہگلی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر ایک تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔

رات کو سونے والے لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں بھی وہیں فٹ پاتھ پر لیٹ کر سو گیا تھا۔ میرے پاؤں سڑک کی طرف فٹ پاتھ سے تھوڑے باہر نکلے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، صبح صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب سڑک دھونے والی گاڑی نے آ کر میرے پاؤں کے اوپر پانی کی آبشار ڈالی۔ کلکتہ کے اس میٹرو سینما ہی میں، میں نے کیدار شرما کی مشہورِ زمانہ فلم ''چترلیکھا'' دیکھی تھی۔

لاہور کی مال روڈ والی ای پلومرز کیمسٹ کی دکان کے ساتھ ہی دو بھائیوں کے پرنٹنگ پریس کا آفس ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے اب ان کے بیٹے چلاتے ہوں اور وہاں ان کا آفس ہو۔ میرا اس طرف سے کبھی گزر نہیں ہوا۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں، یہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ ان بھائیوں میں سے بڑے بھائی کا نام مجید الکی اور چھوٹے بھائی کا نام حمید الکی تھا۔ دونوں بھائی شعر و ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ مجید الکی آرٹسٹ بھی تھا۔ وہ جو لائن کھینچتا تھا وہ قدیم چینی مصوروں کی طرح بڑی نازک اور حساس ہوتی تھی۔ اس کے اپنے چہرے کے نقوش بھی بڑے نازک اور حساس تھے۔ رنگ زردی مائل تھا۔ خاموش آنکھوں میں شاعرانہ گداز تھا۔ دھیمے لہجے میں اشد ضرورت کے وقت بات کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک خالص ادبی رسالہ بھی نکالا تھا جس کا نام ''نرگس'' تھا۔ اس رسالے کی تزئین و آرائش اور کیلی گرافی مجید الکی خود کرتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی دھیمی ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں حمید الکی قہقہہ لگا کر ہنستا تھا اور خوب باتیں کرتا تھا۔ میری اس سے بڑی دوستی تھی۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح حمید الکی بھی بڑا خوش لباس تھا اور امرتسر کے مشہور سیاسی لیڈر ڈاکٹر کچلو کی طرح کوٹ یا اچکن کے بائیں بازو میں کف کے اندر سفید رومال رکھتا تھا۔ کبھی ریڈیو سٹیشن آتا تو مجھ سے ضرور ملتا تھا۔ یہ دونوں بھائی ملکی برادرز کے نام سے مشہور تھے۔ افسوس کہ قاہرہ کے فضائی حادثے میں مجید الکی بھی دوسرے نامور صحافیوں کے ساتھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ای پلومرز والی بلڈنگ میں ہی ذرا آگے جا کر مشہور فوٹو گرافر زیدی کا سٹوڈیو تھا۔

زیدی صاحب گروپ فوٹو اتارنے اور پورٹریٹ بنانے کے ماہر تھے۔ انہوں نے قائد اعظم کا ایک بڑے سائز کا پورٹریٹ بنایا تھا جو بہت مشہور ہوا اور کہیں کہیں سرکاری دفاتر میں آج بھی نظر آ جاتا ہے۔

جہاں یہ جہازی بلڈنگ جنرل پوسٹ آفس کے چوک میں جا کر میکلوڈ روڈ کی طرف مڑ جاتی ہے وہاں چھت کے اوپر ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر انگریزی حروف میں لکھا تھا۔

"MURREE BEER IS THE BEST"

انگریزی کے یہ حروف ٹیوب لائٹس کے تھے اور رات کو روشن ہو جاتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کچھ دنوں تک یہ روشن رہے، پھر انہیں اتار دیا گیا۔

اسی پلومرز کے سامنے دیال سنگھ مینشن کے پیچھے آمنے سامنے کچھ فلیٹس تھے جو غالباً اب بھی ہیں۔ ان دنوں یہاں ایک فلیٹ میں بی ایس جعفری صاحب کی سٹار نیوز ایجنسی کا آفس ہوا کرتا تھا۔ انگریزی کے سینئر صحافی مرغوب صدیقی صاحب بھی نسواری رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس خاموش قدموں کے ساتھ اکثر آتے جاتے نظر آ جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے یہاں ایک فلیٹ میں عبداللہ ملک کا بھی آنا جانا تھا۔ میں کئی بار عبداللہ ملک سے ملنے وہاں گیا تھا۔ اسی جگہ ایک فلیٹ میں ایک سینئر صحافی کی بھی رہائش تھی جن کی شکل مجھے اچھی طرح یاد ہے مگر ان کا پورا نام یاد نہیں رہا۔ ان کے نام کے آخر میں صدیقی آتا تھا۔ یہ صدیقی صاحب وہ تھے جنہوں نے لاہور میں پہلی مرتبہ فرانس کی کسی نیوز ایجنسی کے ٹیلی پرنٹر لگائے تھے اور فلیٹ کی چھت پر تین چار بڑے ایریل نصب کئے تھے۔ صدیقی صاحب دُبلے پتلے، سانولے رنگ کے تھے اور بڑے جوشیلے انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔ اگر میں بھول نہیں رہا تو فرانس کی اس نیوز ایجنسی کا نام ازاں بعد فرانس پریس تھا جس کی خبریں بعد میں اردو انگریزی کے تقریباً ہر اخبار میں دیکھی جاتی تھیں۔

اس دیال سنگھ مینشن کی دوسری منزل میں دو چودھری بھائیوں نے ''نظام ویکلی''

کے نام سے ایک ہفتہ وار ادبی جریدے کا اجرا کیا تھا۔ یہ چودھری برادران قیامِ پاکستان سے پہلے ''نظام ویکلی'' بمبئی سے نکالا کرتے تھے جس کا دفتر بھنڈی بازار میں تھا۔ اس ہفتہ وار رسالے کو ہندوستان کے تمام ترقی پسند ادیبوں، شاعروں کا تعاون حاصل تھا۔ علی سردار جعفری، اختر الایمان، معین احسن جذبی، کیفی اعظمی، کرشن چندر، جوش ملیح آبادی، راجندر سنگھ بیدی اور جاں نثار اختر وغیرہ کی تخلیقات خاص طور پر ''نظام ویکلی'' میں شائع ہوتی تھیں۔ بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جو ہفتہ وار ادبی اجلاس ہوتے تھے ان کی رپورٹیں بھی اسی ''نظام ویکلی'' میں چھپا کرتی تھیں۔

حمید اختر اس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے سیکرٹری تھے۔ لیکن ''نظام ویکلی'' کا جب لاہور سے اجرا ہوا تو بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر جن کا مجھے علم نہیں، اس کی پالیسی بدل گئی اور چودھری برادران نے مجھے اس کا ایڈیٹر بنا دیا۔ بعد میں ''نظام ویکلی'' کے آفس میں ہی آزاد خیال مصنّفین کا قیام عمل میں آیا۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ میں بنیادی طور پر رومان نگار ادیب تھا۔ ترقی پسند مجھے رجعت پسند سمجھتے تھے اور رجعت پسند یعنی ادب برائے ادب کے قائل ادیب مجھے ترقی پسند کہتے تھے۔ لیکن میری دونوں سے دوستی تھی۔ ترقی پسند ادیب، شاعر بھی میرے دوست تھے اور دوسری قسم کے شاعروں اور ادیبوں سے بھی میری گہری دوستی تھی۔

آزاد خیال مصنّفین کے سیکرٹری غالباً قدوس صہبائی تھے جو بڑے اچھے ادیب تھے۔ بھوپال سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ بڑا عمدہ انگریزی لباس پہنتے تھے۔ بڑے سنجیدہ مزاج تھے۔ اُردو ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ بعد میں وہ ''شہباز'' اخبار سے منسلک ہو کر پشاور چلے گئے۔ افسوس کہ اس کے بعد ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

دیال سنگھ مینشن کی بلڈنگ کے ایک سرنگ نما تہہ خانے میں چائے کی کینٹین تھی۔ دیوار کے ساتھ آمنے سامنے تین چار میز کرسیاں لگی تھیں۔ وہاں صرف اتنی ہی جگہ تھی۔ اس کینٹین سے اوپر ''نظام ویکلی'' اور دوسرے دفاتر میں چائے جاتی تھی۔ باہر اس بلڈنگ کی سیڑھیوں کے پاس چائے کا ایک کھوکھا ہوا کرتا تھا۔ کھوکھے کے آگے لوہے کی

کرسیوں پر بیٹھ کر میں اور نوجوان ناول نگار احمد شجاع پاشا ہاف سیٹ چائے منگوا کر خوب باتیں کیا کرتے تھے۔ احمد شجاع پاشا گٹھے ہوئے جسم کا خوش شکل نوجوان تھا۔ سردیوں میں کمبینیشن کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ ہمیشہ دو ایک انگریزی کی کتابیں اس کی بغل میں ہوتی تھیں۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے میں بڑا وقار اور شائستگی تھی۔ وہ جب بھی ''نظام ریگل'' کے دفتر میں آتا تو ہم نیچے کھوکھے کے باہر بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ کبھی چائے کا ہاف سیٹ منگوا کر سامنے مال روڈ کی گرین بیلٹ کے گھاس پر بیٹھ جاتے۔

ان دنوں مال روڈ بڑی خاموش اور پُرسکون ہوتی تھی۔ ہمارے اوپر مال روڈ کے پیپل کے درختوں کی چھاؤں ہوتی۔ سڑک خالی ہوتی۔ کبھی کبھار کوئی تانگہ یا سائیکل گزر جاتا تھا۔ نہ رکشہ تھا، نہ موٹر سائیکلیں تھیں، نہ ویگنیں تھیں نہ کاروں کا اتنا رش ہوتا تھا۔ موٹر کاریں دن میں شاید تین چار ہی گزرتی تھیں۔ ابھی صرف ایک ہی دومنزلہ اومنی بس کرشن نگر حبیب جالب کے مکان والے سٹاپ سے لے کر پرانی چھاؤنی کے توپ خانہ بازار تک چلتی تھی۔ اس بس میں بھی دس بارہ سواریاں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ شاید میں کسی الف لیلوی شہر کی مال روڈ کا ذکر کر رہا ہوں۔ یقین کریں آج کی مال روڈ کے مقابلے میں اس زمانے کی مال روڈ پر کسی الف لیلوی شہر کی سڑک کا گمان ہوتا تھا۔ چیئرنگ کراس والے کسی درخت پر کوئی پرندہ بولتا تھا تو اس کی آواز چوک ریگل تک بڑی صاف سنائی دیتی تھی۔

دیال سنگھ مینشن کے باہر ایک بوڑھے آدمی کا سائیکل سٹینڈ تھا۔ وہ چمبے کا رہنے والا تھا۔ اکثر چمبہ، کلو اور پٹھانکوٹ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ باتیں کرتے کرتے وہ ماضی کی یادوں میں کھو جاتا۔ پھر اچانک آنکھیں کھول کر آہستہ سے کہتا۔

''ہمارے گاؤں سے پانچ میل پہلے چمبہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دھان کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔''

میں اس کے پاس بیٹھ جاتا اور اس کی اُکھڑی اُکھڑی باتیں سنا کرتا۔ ایک دن کہنے لگا

''وہاں کھجار جھیل تھی۔ اس کے پاس دو درخت تھے۔ کہتے ہیں ایک درخت برہمن لڑکی کا تھا اور دوسرا درخت موچی کے لڑکے کا تھا جو برہمن لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ کھجار جھیل میں ناگ دیوتا رہتا تھا۔ ناگ دیوتا اس برہمن لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ برہمن لڑکی کے پجاری باپ نے اپنی لڑکی کو جھیل میں ڈبو دیا۔ موچی کے لڑکے نے بھی جھیل میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی اور وہاں دو درخت اُگ آئے۔''

چمبے سے ہجرت کر کے آیا ہوا وہ بوڑھا باتیں کرتے کرتے ماضی کے زمانے میں چلا جاتا۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا۔

''سیبوں سے بھرے ہوئے ٹرک کلو میں کھڑے تھے۔ ہم اسے توری کہا کرتے تھے۔ اس سال بڑی بارشیں ہوئیں۔ کلو اور پٹھان کوٹ کے درمیان سارے پُل بہہ گئے۔''

پھر وہ آنکھیں بند کر کے گنگنانے لگ جاتا۔

''راجی رہنا باہمن اڑیے
جنداں جنداں ذے میلے''

◎......◎

دو عربی النسل بھائی عرب امارات سے چلے اور لاہور میں آ کر آباد ہو گئے۔ یہ بہت پہلے زمانے کی بات ہے۔ یہاں انہوں نے ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج لاہور کے صدر دروازے کے بالکل سامنے ''عرب ہوٹل'' کے نام سے ایک ہوٹل کھولا۔ یہ آج کے زمانے کی طرح کا کوئی روایتی ریستوران نما ہوٹل نہیں تھا۔ یہ ایک دکان تھی۔ دکان کی ایک جانب لکڑی کی پرانے ٹائپ کی پانچ چھ کرسیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں ایک بڑا میز تھا۔ دکان کی سامنے والی دیوار کے ساتھ ہی دو تین آمنے سامنے کرسیاں اور درمیان میں ایک میز لگی ہوئی تھی۔ دکان کے پیچھے ایک تنور تھا جہاں تازہ اور گرم گرم بڑے نان لگتے تھے۔ دوسری جانب چھوٹا سا کچن تھا جہاں سالن پکتا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں یہاں بڑی گرمی ہوتی تھی اور تنور کا دھواں بھی بھرا رہتا تھا۔ پاکستان ابھی نہیں بنا تھا۔ رنگون پر جاپانی قبضے کے بعد بھائی جان اور باری علیگ رنگون کے مشہور اخبار ''مجاہد برما'' اور ''شیر رنگون'' کی ادارت کو خیرباد کہہ کر مع فیملی رنگون سے پیدل چل کر برما کے دشوار گزار خطرناک جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے امرتسر اور لاہور پہنچ چکے تھے۔ میں بھی رنگونا سے امرتسر آ چکا تھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت اور باری علیگ صاحب سے ہمارے بڑے قریبی خاندانی مراسم تھے۔ میری سب سے بڑی ہمشیرہ شروع ہی سے لاہور میں آباد تھیں۔ دوسرے کئی رشتے دار بھی لاہور میں تھے۔ چنانچہ میرا لاہور آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ ویسے بھی مجھے لاہور سے بڑی محبت تھی۔ ایک دفعہ لاہور آنے لگا تو چھوٹی آپا نے کہا کہ واپسی پر حسرت صاحب سے مل کر، آپا زینت کی خیر خیریت دریافت کرتے آنا۔

حسرت صاحب عرب ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔

تب مجھے پہلی بار عرب ہوٹل میں داخل ہونے کا اتفاق ہوا۔ حسرت صاحب سامنے بڑی میز پر چائے کا کپ رکھے کرسی پر تشریف فرما، پاس بیٹھے ایک صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب ہوٹل کی محفلیں بکھر چکی تھیں۔ جب یہ محفلیں اپنے عروج پر ہوا کرتی تھیں، میں اس زمانے کی ایک جھلک آپ کو دکھانے کے لئے آغا بابر بٹالوی اور گوپال متل کے دو اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا اقتباس آغا بابر بٹالوی کی کتاب ''خدوخال'' میں سے ہے۔

آغا بابر بٹالوی لکھتے ہیں:۔

''ان دنوں عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں سے مولانا چراغ حسن حسرت، ن۔م راشد، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیار پوری، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، ہری چند چڑھا اور باری علیگ تھے۔ کبھی کبھی آنے والوں میں شفا الملک حکیم محمد حسن قریشی، راجہ حسن اختر کیانی، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر سید عبدالرشید شامل تھے۔ مولانا ظفر علی خان بھی کبھی کبھی تشریف لے آتے تھے۔ اس محفل کے روح رواں حسرت تھے۔ حسرت صاحب طبعاً خاموش اور کم آمیز آدمی تھے۔ بے تکلف دوستوں کے مجمع میں تو وہ باغ و بہار تھے۔ لیکن صحبت ناجنس ان پر سخت گراں گزرتی تھی۔ عرب ہوٹل کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ اخباروں کے دفتروں میں خبریں بعد میں پہنچتی تھیں اور عرب ہوٹل کی چار دیواری میں پہلے پہنچ جاتی تھیں۔

1939ء کے آخر میں، میں ٹمپل روڈ پر اٹھ آیا۔ حسرت صاحب گھر گرہستی ہو گئے، باری علیگ نے وہ محلہ چھوڑ کر پرانی انارکلی میں مکان لے لیا۔ ن۔م راشد ملتان چلے گئے۔ اختر شیرانی ٹونک اور حفیظ ہوشیار پوری اور کرشن چندر دلی چلے گئے۔ اس کے بعد عرب

ہوٹل کی محفلیں خواب ہو کر رہ گئیں۔"

گوپال مِتّل اپنی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" میں عرب ہوٹل کی اس زمانے کی محفلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اسلامیہ کالج کے سامنے عرب ہوٹل لاہور کے آڑے ترچھے ادیبوں اور اخبار نویسوں کا اڈہ تھا۔ ان میں زیادہ تر ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ یہ ایسے اداروں میں کام کرتے تھے کہ جہاں تنخواہ قلیل ملتی تھی، بروقت نہیں ملتی تھی اور کسی ماہ ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ لیکن یہ اپنے حال میں مست رہتے تھے اور اپنی زندہ دلی پر غمِ زمانہ کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیتے تھے۔ عرب ہوٹل بڑا غریب نواز ہوٹل تھا۔ دو کبابوں، آدھے نان اور چائے کی پیالی میں صبح کا ناشتہ ہو جاتا تھا اور بھنے ہوئے گوشت کی آدھی پلیٹ اور ایک نان میں ایک وقت کا کھانا ہو جاتا تھا۔ عرب ہوٹل کے بیٹھنے والے زندہ دل ادیبوں اور صحافیوں میں بھائی چارہ بھی بہت تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سگریٹ، چائے یا کھانے سے محروم رہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت اس مجلس کے میر تھے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ اخبار "الہلال" میں کام کیا تھا۔ اخبار "زمیندار" میں وہ "فکاہات" کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔

عرب ہوٹل کے حاضر باشوں میں انتہائی دلچسپ کیفیت باری علیگ کی تھی۔ باری علیگ لکھتے اُردو میں تھے لیکن پنجابی زبان کے زبردست حامی تھے۔ ترنگ میں ہوتے تو کہتے:

"جب کوئی پنجابی، اُردو بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے جھوٹ بول رہا ہو۔"

سیاسی بحث مباحثے میں عرب ہوٹل کے حاضر باش قلندر ادیبوں اور

صحافیوں کے درمیان تلخی پیدا ہوتے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی ہر چیز کو غیر حقیقی کہتے تھے۔ عرب ہوٹل کے یہ قلندر ادیب اور صحافی دنیا و مافیہا سے بیگانہ نشاطِ ناکامی سے سرشار تھے۔ زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ اپنی کج کلاہی کی روش کو زندہ رکھا جائے۔ سوسائٹی سے ان کا رابطہ صرف اس حد تک تھا جو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ یعنی پیٹ پالنے کے لئے کسی اخبار کے دفتر میں چھوٹی بڑی ملازمت کر لینا، کسی پبلشر کے لئے کوئی ترجمہ کر دینا یا کوئی کتاب یا مجموعہ مرتب کر دینا۔ کامیابی کو یہ لوگ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ طے تھا کہ کامیابی اکثر و بیشتر ناجائز طریقوں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ حاصل زندگی یہ تھا کہ محفل میں کوئی چلتا ہوا فقرہ کہہ دیا جائے یا کوئی مضمون یا کوئی نظم لکھ کر دی جائے۔ جو ادیب جتنا زیادہ غیر معروف ہوتا اتنی ہی زیادہ اسے داد ملتی۔ یہ بھی ایک طرح سے ناکامی کی پرستش تھی۔"

قیامِ پاکستان کے بعد عرب ہوٹل کی محفلیں بھی بکھر گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ادبی محفلوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بزرگ صحافیوں نے اپنے پرسمیٹ لئے۔ ان کے پاس پرانی یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔ اب ان کی مجلسیں کافی ہاؤس، لارڈز اور میسٹرو ہوٹل کے لان میں لگتیں جہاں بیٹھ کر وہ بڑی گرم جوشی سے بیتے دنوں کے قصے کہانیاں بیان کرتے۔ نوجوان اور سینئر صحافیوں کی جس نسل نے ان بزرگ صحافیوں کے زیر سایہ سنجیدہ صحافت کا درس لیا تھا اس نے صحافت کی اعلیٰ اقدار کی روایات کو آگے بڑھایا۔

دوسری طرف پاک ٹی ہاؤس میں پاکستانی ادب کے بانی ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں نے شعر و ادب کی نئی شمع روشن کی۔

لاہور کے چیرنگ کراس میں جہاں اب واپڈا ہاؤس کی عظیم الشان عمارت کھڑی

ہے وہاں پہلے میٹرو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہ ہوٹل بھی فلیٹیز اور برگینزا ہوٹل کی طرح انگریزی وضع کا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور میں ریستوران تھا اور ڈانسنگ فلور تھا جہاں شام کو انجیلا نامی ایک ڈانسر انگریزی سازوں کی دُھن پر سپاٹ لائٹ کی روشنی میں بڑا شریفانہ رقص کیا کرتی تھی۔ لان کے باغیچے میں پنجاب اسمبلی ہال کی عمارت کی طرف گارڈینیا کی سرسبز دیوار کے سائے میں میز کرسیاں بچھی ہوتی تھیں جہاں بزرگ صحافیوں کی سرِ شام چائے کی محفل گرم ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں بھی پاک ٹی ہاؤس سے اٹھ کر وہاں چلا جاتا تھا۔ میں دیکھتا کہ مولانا چراغ حسن حسرت، مظفر احسانی، وقار انبالوی، ظہور عالم شہید اور دوسرے سینئر صحافی بیٹھے ہیں۔ چائے کے دور چل رہے ہیں۔ پرانے اور نئے دنوں کی صحافت اور ادب پر باتیں ہو رہی ہیں۔ دوسری طرف لارڈز ہوٹل میں بھی پرانے اور نئی نسل کے صحافیوں نے اپنا رنگ جمایا ہوتا۔

لارڈز ہوٹل سے ذرا آگے ریگل کی جانب ایک کیفے ڈی اورینٹ نام کا ریستوران ہوا کرتا تھا۔ سرِ شام کیفے ڈی اورینٹ کے باہر کرسیاں ڈال دی جاتیں اور وہاں بزرگ صحافی جناب حمید نظامی، م شین اور کچھ دوسرے بزرگ صحافی بیٹھ جاتے اور ان کی محفل بھی دیر تک جمی رہتی۔ مال روڈ پر بڑی خاموشی ہوتی تھی۔ کسی کسی وقت کوئی تانگہ یا کوئی موٹر گزر جاتی اور اس کے بعد پھر وہی خاموشی طاری ہو جاتی۔

اسی نقی بلڈنگ میں لارڈز اور کیفے ڈی اورینٹ سے ذرا آگے ایک لمبی دکان ہوا کرتی تھی جس کے اندر ہلکا ہلکا، ٹھنڈا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اس اندھیرے میں سے کبھی کبھی آرگن باجے اور پیانو کے بجنے کی آواز آ جاتی تھی۔ اس دکان میں ایک صاحب آرگن باجے اور پیانوں کی مرمت اور اسے سُر میں کیا کرتے تھے۔ اب نہ وہ پیانو رہے نہ وہ آرگن باجے رہے اور نہ ان کی سُریلی آواز میں تانیں رہیں نہ لارڈز ہوٹل رہا نہ کیفے ڈی اورینٹ رہا اور نہ کیفے ڈی اورینٹ کے باہر بچھی ہوئی کرسیاں رہیں اور نہ ان پر بیٹھنے والے بزرگ صحافی باقی رہے۔

اب نقی ہلڈنگ کے اندر کئی بلڈنگیں بن گئی ہیں۔ ایک دکان میں جتنی دکانیں کھل سکتی تھیں کھل گئی ہیں۔ اب آپ جدید ترین ڈی ٹیکٹر لے کر بھی تلاش کریں تو آپ کو وہ پہلے والی پُرسکون، خاموشی نقی ہلڈنگ میں کہیں نہیں ملے گی۔ اب وہ تانگہ جس کی پچھلی سیٹ پر لاہور کا پرانا ادھیڑ عمر کوچوان بیٹھا اسے آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے چیئرنگ کراس لے آتا تھا اور اس کے گھوڑے کی کلپ کلوپ، کلپ کلوپ ٹولنٹن مارکیٹ تک سنائی دیتی تھی، مال کی ٹریفک کے شورِ قیامت میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ ان بیتے دنوں کی ایک یاد سی باقی رہ گئی ہے اور وہ بھی بہت یاد کرو تو آتی ہے۔

پہلوانی اور پہلوان لاہور کی ثقافت کا اہم حصہ ہیں۔ لاہور نے بڑے بڑے شہ زور اور نامور پہلوان پیدا کئے ہیں۔ رستم زماں گاماں پہلوان، رستم ہند امام بخش پہلوان، حمیدا پہلوان، لالہ راج پہلوان، کالا پہلوان، بھولو پہلوان، غوث پہلوان، بلا پہلوان چابک سوار کالا پہلوان شیش گر، اکا پہلوان، اچھا پہلوان وغیرہ۔ رستم زماں گاماں پہلوان نے جرمن پہلوان زیسکو کو تین منٹ میں چت گرا کر ساری دنیا میں پاکستان کا نام روشن کیا۔ رحیم بخش سلطان والے کے دنگل لاہور کے بزرگوں کو آج بھی یاد ہیں۔ لاہور میں گونگا پہلوان اور امام بخش پہلوان کی یادگار کشتی کی باتیں آج بھی نئی اور پرانی نسل کے لوگ بھاٹی دروازے کے اللہ وسایا گرم حمام میں بیٹھ کر شروع کرتے ہیں تو شام تک ان کی باتیں ختم نہیں ہوتیں۔

اندرون بھاٹی گیٹ کا یہ گرم حمام آج بھی لاہور کے پہلوانوں کا مرکز ہے۔ اگرچہ پہلوانی کے فن میں اب وہ جوش و خروش اور سرگرمیاں نہیں رہیں لیکن لاہور کے اکھاڑے آج بھی آباد ہیں جہاں پہلوان اور ان کے پٹھے صبح شام زور کرتے ہیں اور انہیں دیکھنے کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

جب کوئی پہلوان کشتی لڑنے کے واسطے اکھاڑے میں اترتا ہے تو سب سے پہلے اکھاڑے کے کنارے بیٹھے ہوئے سفید پگڑی والے بزرگ خلیفہ جی سے اجازت طلب کرتا ہے۔ وہ بلند آواز میں پوچھتا ہے۔

''اجازت ہے خلیفہ جی؟''

اور خلیفہ جی اکھاڑے کی مٹی اس کے بدن پر پھینک کر کہتا ہے۔

"حکم اللہ دا"

دیام شالہ بیرون ٹکسالی دروازہ کے اکھاڑے میں آج بھی ہر اتوار کو دنگل ہوتے ہیں۔ لاہور میں ایک بڑا طبقہ آج بھی موجود ہے جو یہ دنگل دیکھنے پہنچ جاتا ہے اور دنگل کے بعد گرم حماموں اور حلوائیوں کی دکانوں میں شام تک پہلوانوں اور ان کی مشہور زمانہ کشتیوں کی باتیں ہوتی ہیں۔

لاہور کے مشہور دنگل ہمیشہ سے منٹو پارک میں ہوتے تھے۔ ان دنگلوں کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر چھاپے جاتے۔ پوسٹر کی دونوں جانب کشتی لڑنے والے پہلوانوں کا خاکہ بنا ہوتا تھا جس میں انہوں نے گرز اپنے کندھوں پر رکھے ہوتے تھے۔ کسی دنگل کا نام "شاہی دنگل" تو کسی کا "کانٹے دار دنگل" یا "پوہٹ دنگل" ہوتا تھا۔

دنگل سے ایک روز قبل دنگل کے منصف (جج) اور ٹھیکیدار کی سرپرستی میں پہلوانوں کا جلوس نکالا جاتا۔ بڑے جوڑ کے پہلوان سب سے آگے تانگوں میں بنارسی، کیسری رنگ کی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہوتے۔ ان کے پیچھے چھوٹے جوڑ کے پہلوانوں کے تانگے ہوتے تھے۔ جلوس کے آگے سوہنی کا بینڈ باجہ ہوتا جو فلمی دھنیں بجاتا جلوس کے ساتھ چلتا تھا۔ لوگ سڑک کی دونوں جانب کھڑے ہو کر اپنے اپنے پسندیدہ پہلوانوں کے حق میں نعرے لگاتے۔ اگلے تانگے پر منادی کرنے والا بیٹھا سر ہلا ہلا کر ڈھول کی تال پر ٹلی بجا رہا ہوتا۔ پہلوانوں کے مداح پہلوانوں پر پھولوں کے ہار اور پھولوں کی پتیاں نچھاور کرتے۔ ہر چوک میں پہنچ کر منادی کرنے والا ٹلی والا ہاتھ اوپر اٹھا کر جلوس کو رکنے کا اشارہ کرتا اور پھر تانگے میں کھڑے ہو کر اعلان کرتا۔

"سجنو! تے مہربانو! تے جناب والا! داتا کی نگری اور آپ کے شہر لاہور کے اندر کل ایک کانٹے دار پوہٹ دنگل ہو رہا ہے۔ اس دنگل میں اچھا گوجرانوالیہ اور مست ہاتھی اکبر پہلوان میں بڑا جوڑ ہوگا۔ ہوائی جہاز پہلوان تے راکٹ پہلوان کی ہتھ جوڑی ہوگی۔ منصف کا فیصلہ آخری ہوگا۔ دنگل میں گڑبڑ کرنے والا حوالہ پولیس ہوگا۔ برائے مہربانی مفت خورے تشریف نہ لائیں۔"

نورا اس کشتی کو کہتے تھے جس میں دونوں بڑے پہلوان کشتی لڑتے لڑتے تھک کر چور ہو جاتے مگر کوئی فیصلہ نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ منصف کشتی کو برابر چھڑوا دیتے تھے۔ بعد میں ایسی کشتی کو ہی نورا کہا جانے لگا جس میں نمائشی اور غیر معروف پہلوان پہلے سے فیصلہ کر لیتے تھے کہ کس نے چاروں شانے چت گرنا ہے۔

پہلوانی کے فن کو بڑا معزز اور درویشانہ فن سمجھا جاتا ہے۔ پہلوانوں کے لئے لازم تھا کہ وہ پاکباز ہوں۔ جتی ستی ہوں اور پرہیزگار ہوں۔ رستم زماں گاما پہلوان بڑا پرہیزگار اور عبادت گزار تھا۔ کہتے ہیں اسے آدھی رات کو جنات زور کرانے آیا کرتے تھے۔ سن 50-49ء میں جب گاما پہلوان کامران کی بارہ دری میں رہتے تھے تو میں اور احمد بشیر اخبار ''امروز'' کی طرف سے ان سے انٹرویو کرنے گئے تھے۔ بڑی بڑی مونچھوں والا بڑا رعب دار چہرہ تھا لیکن چہرے پر بھولپن اور معصومیت تھی۔ باتیں کرنے کا انداز بھی بڑا بھولا بھالا تھا۔

ہوسکتا ہے آج کے زمانے میں بڑے جوڑ کے پہلوانوں کے معمولات میں کوئی تبدیلی آگئی ہو۔ لیکن آج سے کچھ عرصہ پہلے پہلوانوں کا یہ معمول ہوتا تھا کہ وہ رات کے دو بجے اٹھتے۔ ان کے پٹھے ان کے جسم کی مالش کرتے۔ اس کے بعد دو ہزار یا اس سے زیادہ بیٹھکیں لگاتے۔ پھر اپنے خلیفے کی اجازت سے اکھاڑے میں اترتے۔ اکھاڑے کی مٹی گوڑتے۔ اس کے بعد اپنی عمر کے کسی پہلوان کے ساتھ زور کرتے۔ اکھاڑے کے باہر بیٹھے خلیفہ جی انہیں داؤ پیچ بتاتے جاتے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے زور کرنے کے بعد وہ غسل کرتے۔ اتنی دیر میں ان کے پٹھوں نے ان کے لئے سردائی تیار کی ہوتی تھی۔ پہلوان سردائی پیتے۔ اس کے بعد ابال کر ٹھنڈا کیا ہوا بھینس کا تازہ دودھ پیتے۔ پھر سو جاتے۔ دوپہر کو سیر دو سیر گوشت کی یخنی پیتے اور معمول کا کھانا کھانے کے بعد سو جاتے۔ تیسرے پہر بیدار ہوتے اور اپنے پٹھوں کے ساتھ زور کرنے اکھاڑے میں آ جاتے۔

چونکہ میرا اپنا تعلق پہلوانوں کے خاندان سے ہے۔ میرے دادا جان اور پھر والد

صاحب پہلوان تھے اور آٹھویں جماعت تک وہ مجھے خود اکھاڑے میں زور کرایا کرتے تھے اس لئے میں نے جو کچھ دیکھا ہے، بیان کر رہا ہوں۔ کسی دنگل میں کشتی جیتنے کے بعد پیسے ملتے تو پہلوان سب سے پہلے بادام کی ایک دو بوریاں اور دیسی گھی کے دو کنستر گھر میں لا کر رکھ لیتے۔ اس زمانے میں، میں نے کچھ پہلوانوں کو کچا دیسی گھی بھی پیتے دیکھا ہے۔ وہ زور کرنے کے بعد سیر آدھ سیر گھی پی کر چارپائی پر لیٹ جاتے، بالکل حرکت نہ کرتے۔ دو ایک گھنٹے وہ اسی طرح لیٹے رہتے پھر اٹھ کر بیٹھ جاتے اور ایک دو لمحے توقف کرنے کے بعد بڑے خوش ہو کر ایک دوسرے سے کہتے۔

''خلیفہ! گھی بچ گیا ہے۔''

یعنی گھی ہضم ہو گیا ہے۔ ہمارے ایک رشتے دار پہلوان تھے۔ جب وہ بدن پر تیل مل کر اکھاڑے میں اترتے تو مجھے بالکل الف لیلیٰ کی کہانی کا کوئی جن لگتے تھے۔ ایک دن سخت گرمی پڑ رہی تھی، وہ زور کرنے کے بعد نہا دھو کر بیٹھ گئے۔ ان کا پٹھہ سردائی تیار کر رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔

''لاؤ، آبِ حیات کا پیالہ لاؤ کہ سینے میں ٹھنڈ پڑے۔''

پٹھہ کہنے لگا۔ ''استاد جی! سردائی تو تیار ہے مگر برف توڑنے کے لئے سُوا نہیں مل رہا۔''

پہلوان نے کہا۔ ''تو پھر کیا ہوا؟ برف کا ڈلا مجھے پکڑاؤ۔''

اور پہلوان نے برف کا ڈلا زور سے اپنے سر پر مارا۔ سر کو کچھ نہ ہوا، برف کے ڈلے کی ڈلیاں بن گئیں۔ پہلوان نے ڈلیاں دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''ڈال دو ان کو دورے میں۔''

پٹھے نے دورے میں برف کی ڈلیاں ڈال کر سردائی کو ٹھنڈا یخ کیا اور پہلوان ایک ہی سانس میں دو تین سیر کی سردائی پی گئے۔

پہلوانوں کی باتوں کا اسلوب اور ان کی ڈکشن اپنی ہوتی تھی۔ ایک ریٹائرڈ پہلوان کی گوالمنڈی میں دودھ دہی کی دکان تھی۔ اسے کلاسیکل میوزک سے بھی دلچسپی تھی۔

ایک روز میں نے پوچھا۔

''پہلوان جی! راگ بھیرویں اور مالکونس میں کیا فرق ہے؟''

پہلوان صاحب گردن ہلاتے ہوئے مسکرائے اور بولے۔

''بھولے بادشاہو! کیا بات کر رہے ہو۔ کہاں بھیرویں، کہاں مالکونس۔ ان کے تلک ہی اور ہیں۔ آب و ہوا ہی اور ہے۔''

لاہور میں ایک سابق پہلوان صاحب کوئی فلم بنا رہے تھے۔ اتفاق سے اس فلم میں جو میوزک دے رہے تھے وہ کسی زمانے میں قصائی رہ چکے تھے۔ ایک دن یہ میوزک ڈائریکٹر پہلوان صاحب کے پاس بیٹھے اپنے میوزک کی بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ پروڈیوسر پہلوان نے میوزک ڈائریکٹر کو بیچ میں روک کر کہا۔

''ماسٹر جی! میری ایک بات نوٹ کرلو۔ پیسے میں تمہیں پورے دوں گا۔ مگر فلم میں میوزک میں گردن کے گوشت کا لوں گا۔''

◎......◎

یہ قیامِ پاکستان کے شروع کے زمانے کی بات ہے۔ میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کر چکا تھا۔ نوکری میں نے کسی جگہ نہیں کی تھی۔ کسی جگہ ٹِک کر کام کرنا میرے مزاج کے خلاف تھا۔ اپنی ادبی زندگی کی ابتداء میں مجھے کسی قسم کی جدوجہد نہیں کرنی پڑی تھی۔ 1948ء کے ادبی رسالے ''ادبِ لطیف'' میں چھپی اپنی کہانی ''منزل منزل'' سے ہی میں نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا جہاں آج میں ہوں۔ مجھے میری کہانیوں، مضامین وغیرہ کا اس زمانے کے مطابق معقول معاوضہ ملتا تھا۔ میں ریڈیو، اخبارات اور ملک کے ادبی رسالوں میں لکھ کر کماتا تھا۔ ریڈیو سے میرا تعلق خاطر آٹھویں جماعت ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پہلے ریڈیو رنگون، پھر ریڈیو سیلون، جس کا پورا نام ریڈیو S.E.A.C سیلون تھا یعنی ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ کا ریڈیو سٹیشن۔ یہ اتحادیوں کا فوجی ریڈیو سٹیشن تھا جہاں سے جنگِ عظیم ختم ہو جانے کے بعد جنوب مشرقی ایشیاء میں قابض اتحادی فوجوں کے واسطے انگریزی، اُردو، تامل، تیلگو، گھورکھالی اور پنجابی کے میوزیکل اور تفریحی پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ یہ ریڈیو سٹیشن سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں تھا۔ اس زمانے میں سری لنکا کا نام ابھی سیلون ہی تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد قدرتی طور پر میرا رجحان ریڈیو پاکستان کی طرف زیادہ تھا جس کو شروع شروع میں پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کہا جاتا تھا۔

میں ابھی ریڈیو پاکستان لاہور کے ساتھ بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک نہیں ہوا تھا اور چل پھر کر ریڈیو کے لئے فیچر اور تقریریں وغیرہ لکھتا تھا۔ چار پانچ منٹ کی ریڈیائی تقریر کا معاوضہ پانچ روپے ملتا تھا اور پندرہ منٹ کے فیچر کا معاوضہ پندرہ روپے ملتا

تھا۔ اس زمانے کے حساب سے یہ معقول معاوضہ سمجھا جاتا تھا۔

ریڈیو پاکستان لاہور ابھی شملہ پہاڑی والی کوٹھی میں ہی تھا۔ یہاں میں نے پہلی بار موسیقار جیون لعل مٹو، مادھوری مٹو اور دیا ناتھ سیٹھ کو دیکھا۔ پھر یہ لوگ انڈیا چلے گئے۔ اگرچہ یہ ریڈیو پاکستان کا ابتدائی دور تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ریڈیو پاکستان کا بڑا سنہری زمانہ تھا۔ بڑے بڑے نامور گلوکار، موسیقار، ادیب، شاعر ریڈیو پاکستان کے پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ بڑے غلام علی خان ابھی لاہور میں ہی تھے۔ نزاکت علی خان، سلامت علی خان کے فن کا یہ بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ ریڈیو پاکستان سے ابھی LIVE پروگرام نشر ہوتے تھے۔ پہلے سے پروگرام ریکارڈ کرنے کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا جب ریڈیو سٹیشن کا عملہ ایمپریس روڈ والی نئی بلڈنگ میں آ گیا تھا۔ میوزک کا پروگرام ہمارے دوست اور نامور میوزک ڈائریکٹر خیام کے بڑے بھائی عبدالشکور بیدل کے پاس تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں اور عبدالشکور بیدل ریڈیو سٹیشن کے ڈیوٹی روم میں بیٹھے خان صاحب نزاکت علی خان، سلامت علی خان کا پروگرام سن رہے تھے۔ وہ میوزک کے سٹوڈیو میں غلام فریڈ کی ایک کافی گا رہے تھے جو ساتھ ساتھ نشر بھی ہو رہی تھی۔ ایک تو ویسے ہی دونوں بھائی سُر کے بادشاہ تھے اوپر سے وہ غلام فریڈ کی کافی ایسی پُرسوز اور درد بھری آواز میں گا رہے تھے کہ جب کافی ختم ہونے والی تھی تو عبدالشکور بیدل اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

''خواجہ صاحب! چلئے، سٹوڈیو چلتے ہیں۔''

ہم ڈیوٹی روم سے نکل کر سٹوڈیو کی طرف آ گئے جس کے باہر ON AIR کی سرخ بتی جل رہی تھی۔ جب LIVE پروگرام ہو رہا ہو تو کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن ایک تو ہم ریڈیو کے آدمی تھے۔ پھر عبدالشکور بیدل میوزک پروگرام کا پروڈیوسر تھا۔ دوسرے ہمیں معلوم تھا کہ جب LIVE پروگرام ہو رہا ہو تو سٹوڈیو کے ڈبل ڈور کا دروازہ کتنی احتیاط سے کھولا جاتا ہے۔ ہم نے سٹوڈیو کے دروازے کے گول شیشے میں سے اندر دیکھا۔ دونوں بھائی نزاکت علی خان اور سلامت علی خان صوفیانہ

کیفیت میں ڈوبے انتہائی موڈ کے عالم میں سُر منڈل تھامے خواجہ غلام فریدؒ کی کافی گا رہے تھے۔ کافی یہ تھی۔

سٹ سک غیر خدا دی

سب شے وہم خیال

ہم نے ڈبل ڈور کے دونوں دروازے بڑی احتیاط سے کھولے۔ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہوئی۔ چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ ہم دبے پاؤں چل کر چاندنی کے کنارے دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ دونوں بھائیوں نے ایک نظر ہمیں دیکھا اور پھر اپنے گانے میں محو ہو گئے۔ کافی ختم ہوئی تو عبدالشکور بیدل نے مجھے یاد ہے، بڑے ادب سے کہا۔ اب وہ الفاظ تو مجھے یاد نہیں رہے لیکن اس نے سلامت علی خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ خان صاحب! پلیز، کافی ختم نہ کریں۔ اسے گاتے رہیں۔ نہیں تو ہم ختم ہو جائیں گے۔

دونوں بھائی ذرا سے مسکرائے اور سُر منڈل چھیڑتے ہوئے انہوں نے کافی دوبارہ گانی شروع کر دی تھی۔ سٹوڈیو کی سبز بتی بجھ چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ اب خان صاحب کی کافی صرف ہم لوگ ہی سن رہے ہیں۔ اس وقت دونوں بھائیوں نے جس موڈ اور جس کیفیت میں ڈوب کر گایا میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہم پر اس کا کتنا اثر ہوا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ پنجابی کافی کی گائیکی اپنے تمام بناؤ سنگھار کے ساتھ ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے، میں اپنے کسی پروگرام کا چیک کیش کروانے سٹیٹ بینک آف پاکستان کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ فدا احمد کاردار سٹیٹ بینک میں ملازم تھے اور وہ فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ کسی کو چیک لے کر قطار میں کھڑے ہونے کی زحمت نہیں اٹھانے دیتے تھے۔ فوراً ان سے چیک لے کر ان کو ٹوکن دے کر کہتے تھے، آپ آرام سے بیٹھیں۔ باقی سارا کام وہ خود کیا کرتے تھے۔ اس روز بھی میرا چیک جو شاید پندرہ روپے کا تھا، فدا احمد کاردار نے لے کر مجھے

ٹوکن دے دیا تھا اور میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ بینک کی اونچی چھت والا دراٹڈا خالی خالی تھا۔ دور سے میں نے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ آدمی ذرا قریب آیا تو میں نے اسے پہچان لیا اور احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خان صاحب بڑے غلام علی خان کے منجھلے بھائی اور غزل اور ٹھمری کی دنیا کے بے تاج بادشاہ خان صاحب برکت علی خان تھے۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں میں سفیدی کی لہریں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ بوسکی کا کرتہ پہنا ہوا تھا جس کو کئی شکن پڑے ہوئے تھے۔ سرخ ٹاسے کا تہہ بند باندھ رکھا تھا۔ ایک ہاتھ سے تہہ بند کو ذرا سا اوپر اٹھا رکھا تھا۔ پاؤں میں کلکتے کے سیاہ سلیپر تھے۔ ایک پاؤں میں چاندی کا کڑا تھا۔ بوسکی کے کرتے میں ایک دو جگہوں پر پان کے سرخ داغ صاف نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ صاف لگتا تھا کہ ابھی سو کر اٹھے ہیں۔ ہاتھ میں ریڈیو کا چیک تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ خان صاحب نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میرا حال پوچھا۔ کہنے لگے۔

''ریڈیو کے چیک کے لئے آنا پڑتا ہے۔ تانگہ باہر کھڑا ہے، یہاں دیر تو نہیں لگے گی؟''

میں نے کہا۔ ''خان صاحب! چیک آپ مجھے دے دیجئے۔ آپ بنچ پر تشریف رکھیں۔''

اتنی دیر میں ندا احمد کاردار بھی خان صاحب کو دیکھ کر کاؤنٹر سے اٹھ کر آ گیا۔ اس نے چیک لے لیا اور کہا۔

''خان صاحب! آپ تشریف رکھیں۔ میں کیش لے کر ابھی آتا ہوں۔''

برکت علی خان صاحب بنچ پر بیٹھ گئے۔ خان صاحب مجھ سے کچھ باتیں کر رہے تھے جو اب مجھے یاد نہیں رہیں۔ اس کے بعد کاردار صاحب ان کا کیش جو شاید بیس پچیس روپے کا تھا، لے آئے اور خان صاحب مجھ سے علیک سلیک لے کر چلے گئے۔

شاہی محلے میں نوگزے کے مزار کے سامنے بڑے غلام علی خان صاحب کا مکان تھا۔ مکان کے دروازے کی بائیں جانب کمہار کی دکان تھی جہاں مٹی کے برتن کچھ اندر،

کچھ باہر سجے رہتے تھے۔ دکان کے ساتھ ہی تنگ ہوتا ایک زینہ اوپر جاتا تھا۔ سات آٹھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دائیں جانب ایک بیٹھک تھی جہاں بڑے غلام علی خان اور نزاکت علی خان کی رہائش تھی۔ یہاں کبھی کبھی گلوکار غلام علی بھی نظر آ جاتا تھا۔ بائیں جانب جو بیٹھک تھی وہاں مبارک علی خان رہتے تھے۔ بڑے غلام علی خان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی برکت علی خان تھے اور برکت علی خان کے بعد ان کے سب سے چھوٹے بھائی مبارک علی خان صاحب تھے۔ اس زمانے میں سلیم شاہد ریڈیو پاکستان لاہور کے اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ ان سے میری اور انور جلال شمزا کی بڑی دوستی تھی۔ بعد میں وہ بی بی سی میں چلے گئے تھے۔ میں، انور جلال شمزا اور سلیم شاہد وقت نکال کر مبارک علی خان صاحب سے ملنے شاہی محلے ان کی بیٹھک پر چلے جایا کرتے تھے۔ خان صاحب، مبارک علی خان بے حد ملنسار، خوش مزاج، دوست نواز دوستوں کے ساتھ ایثار کرنے والے تھے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ جب بھی ہم جاتے وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ سب باتیں بعد میں کرتے پہلے لڑکے کو بلا کر ہمارے لئے چائے، پان اور سگریٹ منگواتے۔ مبارک علی خان بڑے گورے چٹے اور خوبصورت تھے۔ ہمارے بچپن میں کلکتے میں ایک پنجابی فلم ''سوہنی مہینوال'' بنی تھی۔ مبارک علی خان نے اس فلم میں ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ مجھے اس فلم کا ایک سین اب بھی یاد ہے۔ خان صاحب، مبارک علی خان کیچ کے شہزادے کے روپ میں اپنے قافلے کے ساتھ سجی سجائی ڈاچی پر اس کی باگ تھامے بیٹھے تھے اور ڈاچی آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ 1948-50ء میں مبارک علی خان ویسے ہی خوبصورت اور بھرپور جوان تھے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں، سلیم شاہد اور انور جلال، خان صاحب سے ملنے ان کی بیٹھک پر پہنچے تو آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ سلیم شاہد نے یونہی کہہ دیا، خان صاحب! آج تو ہم آپ سے ملہار کی استھائی ضرور سنیں گے تاکہ بارش شروع ہو جائے۔

خان مبارک علی خان مسکرائے۔ کہنے لگے۔ ''سلیم شاہد خان! جن کے ملہار گانے سے بارش ہونے لگتی تھی، وہ بڑے عبادت گزار اور پرہیزگار لوگ ہوا کرتے تھے۔ ہم

ان بزرگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میرے ملہار گانے سے دھوپ نہ نکل آئے۔''

ہم سب ہنسنے لگے۔ مبارک علی خان بے حد دوست نواز تھے۔ کہنے لگے۔

''پھر بھی میں آپ کو ملہار راگ ضرور سناؤں گا۔ ذرا طبلے والا لڑکا آ جائے۔ اس بے چارے کی بہن بڑی بیمار ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔ میرا خیال ہے ابھی آ جائے گا۔''

کچھ دیر بعد طبلے والا لڑکا بھی آ گیا۔ مبارک علی خان نے سب سے پہلے اس سے پوچھا۔''تمہاری بہن کا کیا حال ہے اب؟''

طبلے والا لڑکا منہ لٹکائے بولا۔''ٹی بی اسے اندر ہی اندر کھا گئی ہے۔ بس چارپائی پر اس کا ایکسرے ہی پڑا ہے۔''

اس کے بعد ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ خان صاحب سے گانا سنا جائے اور ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر کسی کام کا بہانہ بنا کر اٹھ کر چلے آئے۔

مبارک علی خان جتنے خوش شکل تھے، اتنے ہی خوش لباس بھی تھے۔ گانے کی محفلوں میں کبھی کبھی تھری پیس سوٹ پہن کر بھی چلے جاتے تھے۔ ان کے جسم پر ہر لباس بڑا اچھا لگتا تھا۔

ایک بار مبارک علی خان صاحب نے میرے ساتھ جو ایثار کیا میں اسے کبھی نہیں بھلا سکتا اور میں اسے یاد کر کے ہمیشہ خان صاحب کو دعائیں دیتا ہوں۔

ان زمانے میں حلقہ اربابِ ذوق کی جانب سے یوم میرا جی بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا۔ چونکہ میرا جی کو راگ جے جے ونتی بہت پسند تھا اس لئے یوم میرا جی کی تقریب میں کسی گلوکار یا ستار نواز یا وائلن نواز کو بلا کر راگ جے جے ونتی ضرور سنوایا جاتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وائی ایم سی اے ہال میں یوم میرا جی منایا جا رہا تھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ ہمارا دوست اور خوبصورت غزل کہنے والا شاعر شہرت بخاری ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، پھر مجھ پر نظر پڑی۔ سیدھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''اے حمید! ایک مشکل آن پڑی ہے۔ اس وقت صرف تم ہی ہماری مدد کر سکتے ہو۔''

میں نے پوچھا۔''آخر ایسی کون سی بات ہے؟ مجھے بتاؤ۔''

شہرت بخاری کہنے لگا۔

''تمہیں تو پتہ ہے آج شام کو ہم یوم میرا جی منا رہے ہیں۔ اس تقریب میں امانت علی خان کو راگ جے جے ونتی گانا تھا۔ اس نے وقت پر پہنچ جانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر اسے اچانک کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ اس نے آنے سے معذوری ظاہر کی ہے۔ ہم نے سارا بندوبست کیا ہوا تھا۔ اب وقت بھی بہت کم رہ گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اس کی جگہ کس کو بلائیں۔ ہمارا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔ مبارک علی خان صاحب سے تمہاری دوستی ہے، جس طرح ہو سکے کوئی ایسا انتظام کرو کہ وہ وقت کے وقت آ کر راگ جے جے ونتی پانچ منٹ کے لئے ہی گا دیں۔ ہماری عزت رہ جائے گی۔''

میں اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور شہرت سے کہا۔

''چلو، مبارک علی خان صاحب کی بیٹھک میں چلتے ہیں۔''

اسی وقت ہم تانگے پر بیٹھے اور مبارک علی خان صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہ اپنی بیٹھک میں ہی مل گئے۔ میں نے ان سے ساری بات کہی اور آخر میں کہا۔

''خان صاحب! آپ اتنے بڑے فنکار ہیں۔ مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں آپ کو آنے کے لئے کہوں۔ لیکن اگر آپ نہ آئے تو یوم میرا جی کی تقریب ادھوری رہ جائے گی۔''

مجھے یاد ہے خان صاحب، مبارک علی خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''حمید صاحب! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں اور میں نہ آؤں۔ مجھے ٹائم بتائیں، میں صحیح ٹائم پر وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

شہرت بخاری بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"خان صاحب! ہم آپ کو لینے آجائیں گے۔"

مبارک علی خان بولے۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے وائی ایم سی اے دیکھا ہوا ہے۔ فکر نہ کریں، میں وقت سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ مبارک علی خان جلسہ شروع ہونے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے وائی ایم سی اے ہال کے باہر پہنچ گئے۔ میں اور شہرت بخاری پہلے سے وہاں کھڑے تھے۔ مبارک علی خان نے نسواری رنگ کا گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ تانپورے اور طبلے والا ان کے ساتھ تھا۔ وہ تانگے سے اترے۔ ہم نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ خان صاحب ایک چھوٹا قالین رول کر کے اپنے ساتھ لائے تھے۔ کہنے لگے۔

"میں جہاں گانے کے لئے جاتا ہوں، اپنا چھوٹا قالین ساتھ لے جاتا ہوں۔ آپ صرف اتنا کریں کہ ہمیں کوئی ایسی جگہ بتا دیں جہاں میں ذرا ریہرسل کرلوں۔"

ہم نے سارا بندوبست کر دیا۔ مجھے صرف ایک ڈر تھا کہ خان صاحب نے پکا راگ گانا ہے۔ ہال میں ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ پکے راگ سے بور ہو جائیں اور ہوٹنگ نہ شروع کر دیں۔ بس میں دعائیں ہی مانگتا رہا کہ یا خدا! ہماری اور خان صاحب کی عزت آبرو رکھ لینا۔ لیکن اس کے بالکل برعکس ہوا۔ خان صاحب جب سٹیج پر تشریف لائے تو ان کے لئے قالین پہلے سے بچھ چکا تھا۔ وہ بالکل کسی فلم کے خوبصورت ہیرو لگ رہے تھے۔ بیٹھتے ہی انہوں نے سُر منڈل چھیڑا۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد انہوں نے راگ جے جے ونتی کا الاپ شروع کیا تو لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ پھر جو انہوں نے راگ جے جے ونتی گانا شروع کیا تو لوگوں پر ایک طلسم سا طاری ہو گیا۔ خان صاحب راگ کی کلاسیکی گائیکی سے نکل کر صوفیانہ کلام کی طرف آ گئے۔ لوگ بڑھ چڑھ کر داد دے رہے تھے۔ مبارک علی خان صاحب نے محفل لوٹ لی۔

دوسرے دن میں اور شہرت بخاری کچھ تحفے لے کر خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بولے۔

''یہ کیسا تکلف کیا آپ نے؟''

میں نے اور شہرت بخاری نے مبارک علی خان صاحب کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے۔

''ہم فنکار ہیں اور پھر حمید صاحب ہمارے دوستوں میں سے ہیں۔ مجھے دوستوں کی خدمت کر کے بڑی خوشی ہوتی ہے۔''

اس بات کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ مبارک علی خان صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ کل پرسوں میں بھی اس دنیا میں نہیں رہوں گا۔ لیکن میں جہاں میں ہوں گا، مبارک علی خان صاحب نے میرے ساتھ جو ایثار کیا تھا اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا۔

۵......۵

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ریڈیو پاکستان لاہور میں بطور سٹاف آرٹسٹ ملازم ہو گیا تھا۔ یہ غالباً 1950ء، 1951ء کا زمانہ تھا۔ ہر تین ماہ بعد میرے معاہدے کی تجدید ہوتی تھی۔ میرے لئے پنشن، چھٹیوں اور علاج معالجے کی کوئی سہولت نہ تھی۔ لیکن اس کنٹریکٹ میں میرے واسطے ایک بہت بڑا فائدہ تھا وہ یہ تھا کہ اس کی رو سے مجھ پر دفتر میں وقت پر آنے اور وقت پر جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ صرف وقت پر سکرپٹ لکھ کر دینا ضروری تھا۔ سکرپٹ میں گھر سے لکھ کر لے جاتا تھا اور باقی سارا وقت میں اپنے میوزیشن دوستوں اور آرٹسٹوں کے ساتھ ریڈیو کی کینٹین میں چائے پیتے اور باتیں کرتے گزار دیتا تھا۔

صبح نو سوا نو بجے میں اپنے سمن آباد والے گھر سے نکل کر بوہڑ والے چوک میں آ کر رکشہ پکڑتا اور ریڈیو سٹیشن کی بڑی عمارت میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک دن میں بوہڑ والے چوک میں کھڑا کسی صاف ستھرے رکشے کی تلاش میں تھا کہ دور سے مجھے میرا دوست اور شاعر قتیل شفائی آتا دکھائی دیا۔ قتیل شفائی میرے پاس آ کر رک گیا۔ اس نے پوچھا۔

''اے حمید! کہاں جا رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ریڈیو سٹیشن جا رہا ہوں۔''

قتیل شفائی بولا۔ ''بس ٹھیک ہے، تم مجھے لکشمی چوک میں اتار دینا۔''

ان دنوں قتیل شفائی فلموں کے لئے گیت لکھتا تھا اور اس نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ بوہڑ والے چوک میں جہاں ہم کھڑے تھے ہمارے پیچھے ایک جو گلی تھی اس کے کونے میں اُردو کے مشہور نقاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی کا مکان تھا۔ ڈاکٹر صاحب ان

دنوں سکوٹر پر آیا جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا وجود ماشاء اللہ کافی بھاری بھر کم ہے۔ جب وہ سکوٹر پر بیٹھے ہوتے تھے تو سکوٹر کی گدی ان کے ناقابل برداشت بوجھ سے ایک طرف کو جھکی ہوئی ہوتی تھی۔

ہم نے دیکھا کہ اس گلی میں ڈاکٹر صاحب اپنے سکوٹر پر بیٹھے ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ ان کے سکوٹر کی گدی ماشاء اللہ ان کے بوجھ سے ایک طرف کو کچھ زیادہ ہی جھکی ہوئی تھی۔ ہمارے پاس آ کر انہوں نے سکوٹر روک لیا۔ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائے اور اپنے مخصوص پیار بھرے مشفقانہ لہجے میں پنجابی میں پوچھا۔

''خیر نال جوڑیاں کہاں جا رہی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں ریڈیو سٹیشن جا رہا ہوں اور قتیل شفائی چوک لکشمی تک میرے ساتھ جا رہا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کے بوجھ سے سکوٹر کی گدی جیسے بڑی تکلیف میں تھی اور ان کے بوجھ سے ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ سکوٹر بہت پرانا ہو گیا ہے۔ اب آپ موٹر کار لے لیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''آپ دعا کریں۔''

قتیل شفائی سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگا۔ ''دعا تو آپ کا سکوٹر کرے گا۔''

قتیل کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ ان دنوں وہ مصری شاہ میں عزیز روڈ پر کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ اس کا مکان سڑک کے اخیر میں تھا۔ آگے کھیت ہی کھیت تھے جو بادامی باغ تک چلے گئے تھے۔ کمیٹی کے گڈے صبح شام یہاں آ کر ان کھیتوں میں شہر کا کوڑا کرکٹ پھینک جاتے تھے۔

ایک روز میں قتیل کے ساتھ ایک فلمی دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے قتیل سے پوچھا۔ ''قتیل صاحب! آپ کا مکان کس جگہ پر ہے؟ میں آپ سے گھر میں آ کر ملنا چاہتا ہوں۔''

قتیل بولا۔ ''میں مصری شاہ میں رہتا ہوں۔ وہاں کوئی بس وغیرہ نہیں جاتی۔ آپ ایسا کریں کہ مصری شاہ کے اک موڑ پہ پل کے نیچے آ کر کھڑے ہو جائیں۔ تھوڑی دیر بعد آپ کو کوڑے کرکٹ سے لدا ہوا ایک گڈا آتا دکھائی دے گا۔ بس آپ کوڑے کرکٹ کے گڈے کے ساتھ ساتھ چلتے چلے جائیں۔ جہاں آ کر وہ گڈا کوڑا کرکٹ پھینکے گا، وہیں میرا مکان ہے۔''

ان دنوں ہم شاعر ادیبوں کو تقریباً ہر وقت ہی پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ لیکن جب کوئی کتاب وغیرہ بیچ کر ہمارے پاس پیسے آتے تھے تو ہم اسے بے دریغ خرچ کر ڈالتے تھے۔ ایک دن ہم کچھ ادیب اور شاعر دوست یوسف کامران کے کرشن نگر والے مکان میں بیٹھے تھے۔ محفل جمی ہوئی تھی کہ کسی نے پوچھا۔

''یار! حبیب جالب آج کل کہاں ہے؟ کئی روز سے اسے نہیں دیکھا۔''

اس پر کشور ناہید نے کہا۔

''اسے آج کل کسی پبلشر سے پیسے مل گئے ہیں۔ وہ ابھی نہیں آئے گا۔''

شاعر شاد امرتسری نے پوچھا۔ ''بھابی! تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

کشور ناہید نے جواب دیا۔

''کسی نے مجھے بتایا ہے کہ آج کل حبیب جالب رکشے والے کو پیسے دینے کے لئے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالتا ہے تو سو روپے کا نوٹ نیچے گرتا ہے۔''

لاہور میں ہی ہمارے ایک بزرگ استاد شاعر ہوا کرتے تھے۔ وہ شاعری کے ذریعے اپنی روزی روٹی کماتے تھے۔ لوگ ان سے قیمتاً شادی بیاہ کے موقعوں پر سہرے لکھواتے تھے۔ مدحیہ قصیدے لکھواتے تھے۔ بعض ایسے نومشق نوجوان لڑکوں اور خواتین کو ان کے تخلص کے ساتھ غزلیں، نظمیں بھی لکھ کر دیتے تھے جنہیں شعر کہنے کا سلیقہ نہیں تھا لیکن بطور شاعر مشہور ہونے اور رسالوں میں چھپنے کا بہت شوق تھا۔ یہ بزرگ شاعر ان سے فی غزل دس روپے اور فی نظم پندرہ روپے وصول کرتے تھے۔ ایک بار بڑی گڑبڑ ہو گئی۔

دروغ گو را حافظہ نہ باشد انہوں نے ایک غزل ایک شاعر کو دس روپے میں لکھ کر دی اور شام کو وہی غزل دس روپے میں ایک دوسرے شاعر کو لکھ کر دے دی۔ وہ بھول گئے کہ یہی غزل وہ پہلے ایک شاعر کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔ ستم یہ ہوا کہ اسی روز رات کو ایک شاعر نے وہ غزل ایس پی ایس کے ہال کے مشاعرے میں بڑے ترنم سے پڑھ دی اور سامعین سے داد وصول کی۔ اور وہی غزل دوسرے شاعر نے پنجاب یونیورسٹی کے مشاعرے میں بڑے رقت انگیز ترنم کے ساتھ اپنے نام سے پڑھ کر سنا دی۔ اخباروں میں کالم لکھے گئے کہ صاحب توارد تو ایک آدھ شعر کا ہو سکتا ہے یہ تو نہیں کہ پوری کی پوری غزل کا توارد ہو جائے۔ ستم پر ستم یہ کہ وہ غزل چونکہ بہت اچھی تھی، ہمارے بزرگ شاعر نے اسی رات سیالکوٹ کے ایک مشاعرے میں پڑھ کر سنا ڈالی۔ سارا معاملہ الٹ پلٹ ہو گیا۔ اس کے بعد بزرگ شاعر بڑے محتاط ہو گئے۔ انہوں نے ایک خفیہ رجسٹر بنا لیا جس پر جس نومشق شاعر کو غزل لکھ کر دیتے۔ اس کا نام وقت اور تاریخ کے ساتھ رجسٹر میں درج کر لیتے۔ ایک بار مضافات سے ایک امیر کبیر زمیندار صاحب ان کی شہرت سن کر ان کے پاس آئے اور کہا جناب شاعر صاحب! میرے بیٹے کی شادی ہے۔ اس کے لئے سہرا لکھ دیں۔ بزرگ شاعر نے کہا۔

''فی شعر پندرہ روپے لوں گا اور میرا لکھا ہوا سہرا سو شعروں کا ہوتا ہے۔''

زمیندار صاحب ترنگ میں آ کر بولے۔

''شاعر صاحب! شعر تو شاعر کی اولاد ہوتے ہیں۔ آپ اپنی اولاد فروخت کرتے ہیں؟''

بزرگ شاعر نے جواب دیا۔

''صاحب! میں تو اتنے ہی پیسے لوں گا۔ ہاں مرثیہ لکھوا لیجئے۔ مفت لکھ کر دے دوں گا۔''

⊙......⊙

ریڈیو پاکستان لاہور سے میں تقریباً پینتیس چالیس سال تک بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک رہا ہوں۔ میرا زیادہ تر ملنا جلنا اور دوستی سازندوں، گلوکاروں، موسیقاروں کے ساتھ رہی۔ اس دوران مجھے ایسے ایسے فنکاروں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ اپنے بڑے بڑے غم کسی کو نہ بتانے والے یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے خوش ہو جاتے تھے۔ ان کے دل اتنے گداز تھے کہ میوزک کا کوئی سُر ان کے دل کو چھو کر گزرتا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ بعض بالکل بچوں کی طرح معصوم تھے۔

نامور سارنگی نواز حیدر بخش بھی ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ تھے۔ میں نے انہیں پہلی بار ریڈیو سٹیشن کی شملہ پہاڑی والی پرانی عمارت میں دیکھا۔ یہ ان کی زندگی کے آخری دن تھے۔ ان کی بہت سی باتیں ایوب رومانی اور سراج نظامی صاحب کی زبانی سنیں۔ نام ان کا حیدر بخش تھا مگر فلو سے خان کے عرف سے مشہور تھے۔ بقول سراج نظامی انہوں نے کچھ عرصہ گراموفون کمپنیوں اور تھیٹروں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پھر عنایت بائی ڈھیرو والی کے ساتھ سنگت کرنے لگے تھے۔ بے حد شریف، کم زبان اور رحم دل انسان تھے۔ سانولا رنگ، بھاری بھرکم جسم، موٹے موٹے نقش، ململ کا کھلی آستینوں والا کرتہ، نیچے سفید تہمد، ہاتھ میں بیڑہ۔ چلتے وقت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ بیمار ہو گئے۔ بیوی نے محلے کے ڈاکٹر کے پاس جانے کو کہا۔ استاد کو ڈاکٹر کے پاس جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ کہا ڈاکٹر کو یہیں بلا لو۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ انہوں نے فلو سے خان کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

''ٹیکہ لگے گا۔''

ٹیکے کا سن کر بہت گھبرائے۔ بڑی عاجزی کے ساتھ ڈاکٹر سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! مجھے ٹیکہ نہ لگائیں۔ میں مرجاؤں گا۔''

ڈاکٹر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹیکے کا سامان نکالنا شروع کیا تو فلو سے خان صاحب نے حسرت بھری نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

''کیا مجھے اپنے سامنے مرواؤ گی؟''

کہتے ہیں ایک بار لاہور ریڈیو والوں نے ان کا انٹرویو لیا اور پوچھا۔

''استاد جی! آپ کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟''

فلو سے خان صاحب نے برجستہ جواب دیا۔

''میں تو یہ چاہتا ہوں جی کہ اللہ دے اور بندہ کھائے۔''

شکل و شباہت سے اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ کھاتے بہت تھے اور بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ان کی بسیار خوری کے متعلق بقول سراج نظامی ایک لطیفہ بڑا مشہور ہے۔ یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا زمانہ تھا۔ لاہور کے موری دروازے کے باہر چنگڑ محلے میں ایک ہندو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ ہوٹل والوں کی جو شامت آئی تو انہوں نے ہوٹل کے باہر لکھ کر لگوا دیا۔

''ہمارے ہوٹل میں کھانا کھائیں۔ ہم صرف سالن کے پیسے لیں گے، چپاتیاں مفت ملیں گی۔''

ایک دن استاد فلو سے خان اس ہوٹل میں جا پہنچے۔ دو تین قسم کے سالن کا آرڈر دیا اور کھانے بیٹھ گئے۔ چپاتیاں آنے لگیں۔ دو، چار، آٹھ، دس۔ ہوٹل کا بیرا جب بھی پوچھتا کہ اور لاؤں؟ تو وہ کہتے ''ہاں بھائی! لیتے آؤ۔''

ہوٹل والے اپنے اعلان کی وجہ سے مشہور تھے۔ روٹیاں دیتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ گندھا ہوا آٹا ختم ہوگیا۔

ہوٹل والے استاد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور کہا۔

''ہم سے غلطی ہو گئی۔ ہمیں معاف کر دیں۔''

چند روز کے بعد استاد فلو سے خان سارنگی نواز کی طبیعت نے پھر جوش مارا اور پھر اسی ہوٹل میں جا دھمکے لیکن انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ ہوٹل والوں نے چپاتیاں مفت والا بورڈ اتار کر پھینک دیا تھا۔

قصور گھرانے کے ایک اور بڑے نامور سارنگی نواز استاد غلام محمد ہوا کرتے تھے جنہوں نے بڑے بڑے استاد کلاسیکل گائیکوں کے ساتھ سارنگی کی سنگت کی تھی۔ لاہور کے عظیم کلاسیکی گائیک استاد کالے خان صاحب کے ساتھ بھی وہ سنگت کیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں وہ ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو گئے تھے۔ یہاں مجھے انہیں بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ رنگ گندمی تھا، سر کے بال درمیان سے غائب تھے۔ جسم بھاری تھا۔ ایک طرف ذرا جھک کر چلتے تھے۔ کم گو تھے۔

اس زمانے میں ریڈیو پاکستان اپنی نئی بلڈنگ میں منتقل ہو چکا تھا۔ اس نئی بلڈنگ کے احاطے میں ریڈیو کی کینٹین کے پیچھے سنٹرل پروڈکشن یونٹ کے دفاتر اور سٹوڈیوز بن گئے تھے جہاں روزانہ کلاسیکل، نیم کلاسیکل میوزک کے علاوہ پنجابی گیتوں کی ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ سنٹرل پروڈکشن یونٹ کے سازندوں کا اپنا یونٹ بھی تھا۔ سارنگی نواز استاد غلام محمد سنٹرل پروڈکشن یونٹ سے وابستہ تھے۔ اسی یونٹ کے سازندے ریڈیو پاکستان لاہور کے بھی ملازم تھے۔ چنانچہ جب ان کی ضرورت ہوتی تھی تو سنٹرل پروڈکشن یونٹ کے سٹوڈیو سے ریڈیو پاکستان کے ریگولر سٹوڈیوز میں بھی ریکارڈنگ کے لئے آتے جاتے رہتے تھے۔

سنٹرل پروڈکشن یونٹ کی عمارت سے ریڈیو پاکستان لاہور کے سٹوڈیوز میں جانے کے لئے پیپل کے ایک بڑے پرانے اور گنجان درخت کے نیچے سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ استاد غلام محمد سارنگی نواز جب بھی اس پیپل کے درخت کے نیچے سے گزرتے تو نگاہ اٹھا کر ایک نظر پیپل کی گھنی شاخوں کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن اور سی پی یو کی عمارت کے پچھواڑے انجینئرنگ رومز تھے۔ ان کے سامنے بھی پیپل کا ایک درخت

تھا۔ سی۔ پی یو والا پیپل کا درخت کافی گھنا تھا۔ انجینئرنگ رومز والا پیپل کا درخت زیادہ گھنا نہیں تھا۔ ان دنوں درختوں کے درمیان ڈیڑھ دو سو گز کا فاصلہ تھا۔ سارنگی نواز غلام محمد ایک دفعہ کینٹین میں بیٹھے بتا رہے تھے کہ یہ درخت نر اور مادہ ہیں۔ انجینئرنگ آفس والا پیپل کا درخت نر ہے اور سنٹرل پروڈکشن والا درخت مادہ ہے۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو دونوں کا آپس میں ملاپ ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ استاد صاحب کی ان بچوں جیسی معصوم باتوں کو لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ انجینئرنگ والوں کو مزید دو تین کمروں کی ضرورت پڑ گئی جس کی زد میں پیپل کا کم عمر درخت آتا تھا۔ ان کی جانے بلا نر اور مادہ درخت کیا ہوتے ہیں۔ انہوں نے آری منگوا کر درخت کاٹنا شروع کر دیا۔ استاد غلام محمد کو پتہ چلا تو فوراً چیف انجینئر کے پاس پہنچ گئے اور انہیں اپنی منطق سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ درخت پیپل کی مادہ پیپلی کا درخت ہے۔ اسے مت کاٹیں۔ کسی نہ کسی کی جان جائے گی۔ مگر وہ قائل نہ ہوئے، درخت کاٹ دیا گیا۔ درخت کو کٹتے میں نے بھی دیکھا اور مجھے افسوس ہوا۔ درخت کٹ گیا۔ وہاں نئے کمروں کی تعمیر شروع ہو گئی۔ استاد غلام محمد اب پیپل کے نر درخت کے نیچے سے گزرتے تو اُداس نظروں سے درخت کی شاخوں کو دیکھتے۔ کینٹین میں بیٹھے وہ اکثر یہ کہتے سنے جاتے۔

”پیپل کی پیپلی مر گئی۔ اب پیپل بھی مر جائے گا۔“

پیپل کا درخت تو نہ مرا لیکن سارنگی نواز استاد غلام محمد اس پیپل کے درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے اچانک لڑکھڑا کر گرے اور انتقال کر گئے۔

◎......◎

۲

کئی چہرے یاد آ رہے ہیں جو ٹی ہاؤس کے اُفق پر ستاروں کی طرح اُبھرے۔ کچھ دیر تک آسمان پر اپنی روشنی پھیلاتے رہے۔ پھر ایک ایک کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ یہ ان لوگوں کے چہرے ہیں جو نہ تو شاعر تھے نہ ادیب تھے نہ ادب سے ان کو بظاہر کوئی لگاؤ تھا۔ ٹی ہاؤس میں آتے تھے، چائے پیتے تھے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ ان کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مجھے ان کے نام بھی معلوم نہیں۔ ٹی ہاؤس کے شروع کے زمانے کی رونقوں میں ان کا بھی بڑا کردار رہا ہے۔ ٹی ہاؤس کے گلستان کے وہ بھی پھول اور شگوفے تھے۔ ٹی ہاؤس کی اس زمانے کی خوشبوؤں میں ان گمنام پھولوں کی مہک بھی شامل تھی۔

ٹی ہاؤس کے اس شروع شروع کے زمانے کو یاد کرتا ہوں تو روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کا احساس ہوتا ہے۔ صبح سویرے ٹی ہاؤس کے کھلتے ہی اس کی صفائی اور جھاڑ پونچھ شروع ہو جاتی۔ شطرنج نما کالے اور سفید ڈبی دار ٹائلوں کے فرش اور چھوٹی بڑی میزوں کو خوب چمکایا جاتا۔ دیوار پر لگے گلاب اور قائداعظم کی فریم میں لگی تصویر کی گرد صاف کی جاتی۔ علیم الدین کے والد حافظ صاحب ایک قاری صاحب کے ساتھ آ جاتے۔ ٹی ہاؤس میں دو چار اگر بتیاں سلگائی جاتیں اور قاری صاحب کونے والی میز کے پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دیتے۔ اتنے میں علیم الدین بھی آ جاتے اور کچن میں جا کر صفائی وغیرہ کا جائزہ لیتے اور کاؤنٹر پر آ کر ایک دو اگر بتیاں

سلگا دیتے۔

کئی بار میں، حسن طارق اور نواز صبح صبح ہی ٹی ہاؤس پہنچ جاتے تا کہ چائے کا پہلا کپ ٹی ہاؤس میں ہی پیا جائے۔ اس وقت بیکری والا کیک پیسٹریوں کا ٹرنک لے کر وہاں آ گیا ہوتا تھا اور علیم الدین صاحب اپنی نگرانی میں فروٹ کیک، پلین کیک، پیسٹریاں اور کریم رول وغیرہ کاؤنٹر کے نیچے شیشے کے خانوں میں لگوا رہے ہوتے تھے۔ قاری صاحب جا چکے ہوتے تھے۔ اگر بتیاں سلگ سلگ کر ختم ہو چکی ہوتی تھیں مگر ان کی ہلکی ہلکی خوشبو فضا میں پھیلی ہوتی تھی، جو پرانی خانقاہوں کی یاد دلاتی تھی۔ ہماری خواہش ہوتی تھی کہ صبح صبح چائے کی رسم افتتاح ٹی ہاؤس میں ہی ادا کی جائے۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ صبح صبح ٹی ہاؤس میں چائے کا پہلا کپ پینے میں کیا ارمان تھا، کیا شاعری تھی، کیا جلال و جمال تھا۔ ہاف سیٹ چائے کی چینک میں سے چائے نہیں نکلتی تھی، روشنی نکلتی تھی۔ چائے جب کپ میں گرتی تو کپ روشن ہو جاتا۔ ایسے لگتا جیسے کپ میں سورج طلوع ہو رہا ہے۔ وہ صرف چائے ہی نہیں تھی، وہ ناریل اور بانس کے درختوں میں سے گزر کر آنے والی جنوبی سمندروں کی ہوا تھی۔ بارش میں بھیگتے جنگلوں اور ان جنگلوں کی جھیلوں میں رات کے اندھیروں میں کھلنے والے کنول کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ بنگال کے دریاؤں میں طلوع ہوتے سورج کے ساتھ کشتیاں کھینے والے ملاحوں کی دور سے آتی لوک گیتوں کی اداس آواز تھی جس نے اس زمانے کے ٹی ہاؤس کی چینک میں آ کر چائے کا روپ بدل لیا تھا۔ وہ چائے باتیں کرتی تھی، شاعری کرتی تھی، رومانس کرتی تھی۔ اس کی باتوں میں مولسری، موتیے اور جنگلی گلابوں کے پھولوں کی خوشبو تھی۔ وہ سورج بن کر طلوع ہوتی اور روشنی بن کر روح کی وادیوں، پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں میں پھیل جاتی تھی۔ اسی چائے نے مجھے طوفانی سمندروں کی شور مچاتی تیز ہواؤں، پرسکون سرسبز وادیوں، دل پر ہیبت طاری کر دینے والے تاریک، سنسان میلوں پھیلے گھنے جنگلوں اور پہاڑوں کی بلندیوں سے گرتی آبشاروں اور رات کے پچھلے پہر مشرقی آسمان پر چمکنے والے ستاروں سے ملایا۔ ان سے میری

دوستی کرائی اور یہی میرے وہ دوست ہیں جنہوں نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو مجھے اور کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔

ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے تو سبھی پیتے تھے لیکن جو لوگ چائے سے محبت کرتے تھے ان میں علیم الدین صاحب، ناصر کاظمی اور شیخ خلیل احمد صاحب سرفہرست تھے۔ شیخ خلیل احمد ماشاء اللہ حیات ہیں اور اللہ انہیں تا دیر سلامت رکھے اور آج کل آواری میں ہوتے ہیں۔ وہ بھی چائے کے بڑے گرویدہ تھے۔ چائے سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس محبت کو سلامت رکھنے کے لئے وہ بہت کم چائے پیتے تھے۔ میں ایک بار انہیں آواری ہوٹل میں ملا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ شیخ صاحب اپنی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں اور دن میں دو سے زیادہ مرتبہ چائے نہیں پیتے۔ انہیں چائے کے مختلف برانڈ ملا کر نئی چائے بنانے کا بھی شوق ہے اور وہ یہ تجربے کرتے رہتے ہیں۔ ناصر کاظمی اور علیم الدین چائے جس قدر ملے، پی لیتے تھے۔

یہ تو وہ لوگ تھے جو چائے سے محبت کرتے تھے۔ لیکن ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والوں میں ایک ایسی شخصیت بھی تھی جس سے چائے کو محبت ہو گئی تھی۔ اس شخصیت کا نام م حسن لطیفی تھا۔ لطیفی صاحب کا تعلق لدھیانے کے ایک متمول اور پڑھے لکھے گھرانے سے تھا۔ انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے صحافت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انگریزی، فارسی اور فرانسیسی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا۔ بادیئر کے اشعار وہ فرنچ زبان میں مجھے سناتے اور پھر ان کا اردو میں ترجمہ بھی سناتے۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ لدھیانہ سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔ ٹی ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ چائنیز لنچ ہوم میں بھی بیٹھا کرتے تھے۔ وہ میرے بزرگ تھے اور میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ بڑے اچھے شاعر تھے اور انگریزی، فرانسیسی اور اردو ادب پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ دُبلے پتلے تھے، آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ وہ بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو چکے تھے۔ جب ہجرت کر کے لدھیانے سے لاہور آئے، انگریزی اُردو کے اخباروں میں مضامین وغیرہ لکھ کر تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔ اس

قلیل آمدنی میں بھی وہ دوستوں پر خرچ کرنے سے نہیں ہچکچاتے تھے۔

چائے بڑی پردہ دار خاتون ہے۔ وہ کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھاتی۔ وہ ان سے بھی حجاب کرتی ہے جو دن میں کئی بار اس سے ملتے ہیں۔ لیکن وہ م حسن لطیفی سے حجاب اٹھا کر ملتی تھی۔ وہ ان سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ صبح صبح ان کی تلاش میں نکل پڑتی تھی اور انہیں مکان سے اٹھا کر اپنے ساتھ ٹی ہاؤس یا چینی لنچ ہوم لے آتی تھی۔ چائے جس زبان میں بات کرتی تھی، لطیفی صاحب وہ زبان سمجھتے تھے۔ عمر کے آخری دنوں میں لطیفی صاحب چائینیز لنچ ہوم میں زیادہ بیٹھنے لگے تھے۔ میں وہیں ان سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان کو چائے سے باتیں کرتے دیکھنے آ جاتا تھا۔ وہ بڑے دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرتے تھے اور بات کرتے ہوئے اپنے مخاطب کی طرف بہت کم دیکھتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی ایسے شخص سے ہم کلام ہیں جو وہاں پر موجود نہیں ہے۔ ان کی باتیں بڑی مدلل تھیں۔ اور ساتھ ساتھ فرنچ اور انگریزی کے شاعروں کی نظموں کے حوالے دیتے جاتے تھے۔ لطیفی صاحب صحیح معنوں میں دانشور اور جینئس تھے۔

ٹی ہاؤس میں آفتاب، خورشید اور احمد بشیر کا چھوٹا بھائی اختر عکسی روزانہ آتے تھے۔ اختر عکسی سے میری، انور جلال، نصیر الحسین اور نواز کی بڑی دوستی تھی۔ آفتاب کرشن نگر میں رہتا تھا۔ کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اس کا اُردو اور انگریزی کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور شعر و ادب پر بڑی خوبصورت اور فکر انگیز باتیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے انگریزی کی ساڑھے چار سو صفحات کی ایک کتاب دی اور کہا۔

''اسے پڑھو اور اسے سنبھال کر رکھنا۔''

یہ کتاب لندن کے مشہور پبلشنگ ادارے ''تھنکرز لائبریری'' والوں نے شائع کی تھی اور اس کا پہلا ایڈیشن 1872ء میں چھپا تھا۔ کتابیں بے وفا ہوتی ہیں۔ کسی ایک کے پاس نہیں ٹھہرتیں، آتی جاتی رہتی ہیں۔ لیکن آفتاب کی دی ہوئی یہ کتاب آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ اس کتاب نے دو تین بار بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے پکڑ لیا۔ اب اس کتاب کو پتہ لگ گیا ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اب وہ

کہیں نہیں جاتی، میرے پاس ہی رہتی ہے۔ جب میں اس کتاب کو پڑھتا ہوں تو سب سے پہلے کرشن نگر والے اپنے دوست آفتاب کا چہرہ میرے سامنے آ جاتا ہے۔ درمیانہ قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ، ذہین آنکھیں، شگفتہ ادبی باتیں کرنے والا میرا دوست آفتاب!

میرے ٹی ہاؤس کے ساتھیوں اور قریب ترین دوستوں میں یونس ادیب بھی تھا۔ یونس ادیب نے جرنلزم بھی کی، افسانے بھی لکھے، مزاحیہ مضامین بھی لکھے اور درویشی بھی کی۔ لیکن جم کر اس نے کوئی کام نہ کیا۔

درویشی اور استغنا اس کی طبیعت پر ہمیشہ غالب رہا۔ وہ لاہور کا جدی پشتی رہنے والا تھا۔ وہ ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھتا اور دو چار ڈرامے یا فیچر لکھنے کے بعد ریڈیو سے غائب ہو جاتا۔ وہ بہت اچھا لکھتا تھا۔ اس کی تحریر میں ادب بھی ہوتا تھا۔ تحریر کے پردے میں چھپا ہوا بڑا تیز طنز بھی ہوتا تھا لیکن کسی صنف ادب میں مستقل مزاجی سے کام کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس پر کچھ ناگزیر گھریلو ذمے داریاں بھی تھیں جنہیں وہ بڑی ذمہ داری اور جانفشانی سے اخبار نویسی، مضمون نویسی اور ریڈیو نویسی کر کے ادا کرتا تھا۔ چوبیس گھنٹے غمِ روزگار سے نبرد آزما رہتا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی۔ خالص لاہوری انداز میں باتیں کرتا۔ اس کی باتوں میں مزاح اور ہلکے پھلکے طنز کا عنصر غالب رہتا تھا۔ اپنی باتوں سے دوسروں کو بھی ہنساتا اور خود بھی ہنستا۔ سیاست سے بھی اس نے تھوڑی بہت دوستی کر رکھی تھی اور ضرورت پڑنے پر سیاسی مضامین بھی لکھ کر چھپواتا تھا۔

میں یونس ادیب کو اکثر و بیشتر کہا کرتا تھا کہ لاہور پر ایک کتاب لکھو۔ تم جدی پشتی لاہور کے رہنے والے ہو۔ تم پر اس شہرِ بے مثال کی طرف سے حق بنتا ہے کہ لاہور پر کوئی کتاب لکھو۔ آخر یونس ادیب نے لاہور پر ایک کتاب لکھنی شروع کر دی۔ یہ کتاب چھپی اور اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اس کتاب کا نام ''میرا لاہور'' ہے۔ یہ کتاب ایک طرح سے یونس ادیب اور لاہور شہر کی آپ بیتی بھی ہے۔ مجھے آج بھی خوشی ہوتی ہے کہ میں نے یونس ادیب سے لاہور پر ایک ایسی کتاب لکھوا دی ہے جو

شاید ہی کوئی دوسرا لکھتا۔ کم از کم میں اتنی جامع اور خوبصورت کتاب نہیں لکھ سکتا تھا۔ ساغر صدیقی کی درویشی کا یونس ادیب پر بڑا گہرا اثر تھا۔ میں ساغر صدیقی کی شاعری سے بہت متاثر ہوں لیکن اس کی درویشی سے متاثر نہیں ہوں۔ مگر یونس ادیب کی شخصیت پر ساغر صدیقی کی درویشی کا بڑا اثر تھا۔ وہ ساغر صدیقی کی باتیں اسی کے لہجے میں بڑے مزے لے لے کر سناتا۔ دیکھنے والوں کو ایسے محسوس ہوتا جیسے ان کے سامنے ساغر صدیقی بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ ساغر صدیقی کے انتقال کے بعد یونس ادیب نے ان پر مضامین بھی لکھے اور انہیں کتابچوں کی شکل میں شائع بھی کیا۔ وہ ہر سال ساغر صدیقی کی برسی بڑے اہتمام سے مناتا۔ پھر ایک روز ہم نے یہ افسوس ناک خبر سنی کہ یونس ادیب بھی چل بسا ہے۔ یہ خبر میرے لئے اور اس کے تمام دوستوں کے لئے بڑی اندوہناک تھی۔ فخر زمان نے یونس ادیب کی یاد میں ایک ریفرنس کا خاص طور پر اہتمام کیا جس میں، میں بھی شریک ہوا، دوسرے دوست بھی آئے۔ یونس ادیب کی شخصیت اور اس کی کتابوں اور اس کے فن پر مضامین پڑھے گئے۔ اس تقریب میں یونس ادیب کی یادوں کو تازہ کیا گیا اور اس کے دوستوں اور اس کے مداحوں کی جانب سے اسے شایانِ شان انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

ٹی ہاؤس کے پرانے بیٹھنے والوں میں سے جو لوگ بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں ان میں اکثر و بیشتر اب ٹی ہاؤس کا رخ نہیں کرتے۔ جو لوگ شاعروں، ادیبوں کو دیکھنے، ان کی باتیں سننے کی غرض سے آتے تھے وہ بھی اب کم کم ہی آتے ہیں۔ ٹی ہاؤس کی اب وہ رونقیں نہیں رہیں۔ وہ گہما گہمی نہیں رہی۔ یہ ایک قدرتی امر ہے۔ وقت سدا ایک جیسا نہیں رہتا۔ ٹی ہاؤس کی چائے آج بھی ویسی ہی ہے جیسی کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ٹی ہاؤس کا انتظام اب سراج صاحب مرحوم کے فرزند زاہد کے ہاتھ میں ہے جس نے مقدور بھر پرانی روایات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ لیکن حالات اب وہ نہیں رہے۔ زاہد صاحب کا کہنا ہے کہ ٹی ہاؤس کی آمدنی سے بجلی اور گیس کے بل اور ملازموں کی تنخواہ کے اخراجات بڑی مشکل سے پورے ہوتے ہیں۔ ادب دوست طبقے کی طرف سے

حکومت کو یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ ٹی ہاؤس میں پاکستان کے وہ ادیب، شاعر اور نقاد آ کر بیٹھا کرتے تھے جن پر پاکستان کے ادب کو ناز ہے۔ اس اعتبار سے ٹی ہاؤس کو قومی ورثہ قرار دیا جائے۔ لیکن یہ مطالبہ بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوا۔ ٹی ہاؤس کو تھوڑی سی رقم ضرور دی گئی جس سے ٹی ہاؤس کے اُکھڑے ہوئے فرش کی مرمت کی گئی، دیواروں پر نیا رنگ و روغن کیا گیا، کچھ نیا فرنیچر لا کر رکھا گیا۔ لیکن کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ جو شخص ٹی ہاؤس کو اس زبوں حالی میں بھی چلا رہا ہے اور اس کی ساکھ کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے کچھ اس کی کاروباری مجبوریوں کا بھی خیال کیا جائے۔ پنجاب کی حکومت یہ تو نہیں کر سکتی کہ اِدھر اُدھر سے گاہک اکٹھے کر کے ٹی ہاؤس میں لائے تاکہ اس قومی یادگار کو زندہ رہنے کے لئے تھوڑے بہت وسائل میسر آ جائیں۔ لیکن وہ اتنا ضرور کر سکتی ہے کہ سرکاری تقریبات پر مہمانوں کے لئے خورد و نوش مہیا کرنے کے لئے جس طرح دوسرے ہوٹل والوں کو کنٹریکٹ دیئے جاتے ہیں اسی طرح ٹی ہاؤس کو بھی کیٹرنگ کے کنٹریکٹ دیئے جائیں۔ جبکہ ابتدائی دور میں ٹی ہاؤس کو کیٹرنگ کے باقاعدہ کنٹریکٹ ملا کرتے تھے اور اس لائن میں پاک ٹی ہاؤس کا نام بھی ہے اور تجربہ بھی ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ پاک ٹی ہاؤس کی گہما گہمی اور اس کی ساکھ زیادہ تر ان شاعروں، ادیبوں اور نقاد حضرات کی وجہ سے قائم تھی جو ٹی ہاؤس میں آ کر محفلیں لگایا کرتے تھے، شعر و ادب کی باتیں ہوتی تھیں۔ جن شعراء کا کلام لوگ ادبی رسالوں میں شوق سے پڑھتے تھے، ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر انہیں ان شاعروں کو دیکھنے اور کبھی کبھی ان کی زبان سے شعر سننے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ چنانچہ ادب دوست اور پاکستان کے نامور ادیبوں اور شاعروں کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کی خاطر لوگ بھاری تعداد میں صرف لاہور ہی سے نہیں بلکہ پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی آتے تھے۔ یہ بات میں یونہی نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں نے ادب اور ادیبوں سے محبت کرنے والے ان حضرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ان سے اس زمانے میں اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا

تھا۔ لوگ اور خاص طور پر سٹوڈنٹ آٹوگراف بکس ساتھ لے کر آتے تھے اور موقع ملتے ہی اپنے پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں سے آٹوگراف لے لیتے تھے اور یوں خوش ہوتے تھے جیسے انہیں کوئی خزانہ مل گیا ہو۔

ٹی ہاؤس کے مالک کا کہنا ہے کہ اب وہ بات نہیں رہی۔ مشہور ادیبوں میں سے اب صرف انتظار حسین صاحب آتے ہیں اور وہ بھی اتوار کی اتوار حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے آتے ہیں۔ باقی وہ ادیب، شاعر اور نقاد حضرات جنہوں نے پاکستان میں اُردو شعر و ادب اور انتقاد کی بنیاد رکھی اور جن کی ایک جھلک دیکھنے کبھی ٹی ہاؤس میں لوگ جوق در جوق آتے تھے وہ ٹی ہاؤس سے اٹھ گئے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ٹی ہاؤس کی رونقیں پہلے جیسی نہیں رہیں۔ زاہد صاحب کا کہنا ہے ٹی ہاؤس کی قلیل آمدنی سے ٹی ہاؤس کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔ کئی بار خیال آتا ہے کہ اس خسارے کے دھندے کو بند کر دوں اور اسی جگہ کوئی دوسرا کاروبار شروع کر دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل لیتا ہوں کہ ٹی ہاؤس میرے بزرگوں کی نشانی ہے اور ان ادیبوں، شاعروں کی یادگار ہے جن پر آج ہر پاکستانی کو اور اُردو ادب کو ناز ہے۔ اس کے باوجود معاشی مجبوریاں ایک بہت بڑی حقیقت ہیں۔ میں اس حقیقت کو کب تک ٹال سکتا ہوں؟ کب تک ٹال سکوں گا؟

۞......۞

اب یہ اچھی طرح سے یاد نہیں رہا کہ انور جلال سے میری پہلی ملاقات پاک ٹی ہاؤس میں ہوئی تھی یا بیڈن روڈ والے اس کے مکان میں۔ انور جلال کا چہرہ سامنے آتا ہے تو ماضی کے دھندلکوں میں پاک ٹی ہاؤس کے در و دیوار ابھرتے ہیں۔ کالی سفید ٹائلوں والا چمکیلا فرش، چوکور سفید پتھر کی میزیں، دیوار پر لگی ہوئی قائد اعظم کی تصویر، گیلری کو جاتی سیڑھیاں، بازار کے رخ پر لگی شیشے دار لمبی کھڑکیاں جو گرمیوں کی شاموں کو کھول دی جاتی تھیں اور کونے والے کاؤنٹر پر علیم الدین کا مسکراتا ہوا سانولا چہرہ بھی ابھرتا ہے۔ ریڈیو دھیمے سُروں میں بج رہا ہے اور علیم الدین بل کاٹ رہا ہے۔ کتنی دھیمی اور شگفتہ مسکراہٹ تھی علیم الدین کی۔ کیسے چمکیلے ہموار دانتوں کی قطار موتیوں کی طرح چمکتی تھی۔ فضا میں گولڈ فلیک اور تارے والا کیپسٹن میکنم کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اس خوشبو میں پاک ٹی ہاؤس کی سن 47ء کی بہترین سنہری چائے اور فروٹ کیک کی خوشبو بھی مخلوط ہو رہی ہے اور پھر گیلری کو جاتی سیڑھیوں والی میز پر سے انور جلال کا صحت مند فلک شگاف قہقہہ اُبھرتا ہے۔ علیم الدین کاؤنٹر پر بل بناتے بناتے مسکراتا ہے۔ وہ جانتا ہے انور جلال اسی طرح ہنستا ہے۔ تمام بیرے بھی انور جلال کے قہقہوں سے واقف ہیں اور کچن میں اس کے قہقہے کی آواز سن کر وہ بھی زیرِ لب مسکرا دیتے ہیں۔

شیسب، شہدا، سلو، شیدا، شجاع، ضیاء، میں اور کچھ ادیب شاعر بھی ہیں۔ منڈلی لگی ہے۔ بزم گرم ہے۔ محفل جمی ہوئی ہے، چائے کا دور چل رہا ہے، فروٹ کیک اُڑ رہے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ سگریٹ کا دھواں فضا میں خوشبوئیں پھیلا رہا ہے۔ ہماری منڈلی میں ہر شے اعلیٰ سے اعلیٰ ہوتی تھی۔ ہم سب خوش لباس تھے، خوش خوراک، خوش خیال، خوش

خصال اور خوش شکل تھے۔ صحت مند بھی تھے۔ انور جلال کا جسم کسرتی نہیں تھا۔ میں نے اسے کبھی ورزش کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا جسم بڑا سڈول اور آئیڈیل تھا۔ چوڑے شانے، مناسب قد، مضبوط اور ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے سفید چمکیلے دانت اور چوڑے صحت مند نتھنوں کے نیچے باریک مونچھیں۔ سیال بال جن کی مانگ پہلے تو نہیں بناتا تھا پھر ایک روز اس نے بائیں جانب مانگ نکال لی اور اعلان کیا کہ آج سے وہ بالوں کا سٹائل بدل رہا ہے۔

انور جلال ہر بات کا اعلان کرنے کا عادی تھا۔ اس کا لباس، جوتے، بال، مونچھیں، قلم، برش، قہقہے اور تحریریں۔ ہر شے کچھ نہ کچھ اعلان کرتی تھی۔ آنے سے پہلے بھی وہ اعلان کرتا کہ میں آ رہا ہوں۔ یعنی ٹی ہاؤس میں داخل ہونے سے پہلے اس کے قہقہے کی آواز داخل ہوتی تھی۔ کھلتا ہوا سرخی اور سفیدی مائل رنگ۔ وہ ایک ہی نظر میں پہچان لیا جاتا کہ یہ کشمیری ہے۔ وہ شملے سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا اور کبھی کبھی مجھ سے شملے کے چیڑھ کے درختوں، جنگل کو جاتی پگڈنڈیوں اور پہاڑی ڈھلانوں پر اترتے سفید بادلوں کا ذکر کیا کرتا۔ اس وقت انور جلال کی آواز دھیمی ہوتی تھی۔ وہ قہقہہ تو بہت بلند لگاتا مگر بات دھیمے لہجے میں کرتا تھا یا پھر رومانٹک ہوتا تھا تو اس کی آواز مدھم ہو جاتی تھی۔

ایک تسلسل کے ساتھ انور جلال کے ساتھ گزارے ہوئے ماہ و سال بیان کرنا شاید ممکن نہ ہو لیکن ماضی کے سمندر میں واقعات اور بھولے بسرے روز و شب کی تصویریں بے شمار جزیروں کی طرح ابھرتی ہیں جن کے رنگ اور جن کی آب و تاب روزِ اول کی طرح قائم ہے۔ کم از کم میرے لئے یہ تصویریں زندہ پائندہ اور ہر دم جوان ہیں۔ کیونکہ میں نے انور جلال سے دوستی کم کی ہے اور پیار زیادہ کیا ہے۔ اور پیار کی یادوں کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے۔ ان کے رنگ تر و تازہ، شوخ رہتے ہیں اور خوشبو کبھی لاشعور کے ایوانوں سے جدا نہیں ہوتی۔ کبھی میں انور جلال کو اپنے بیڈن روڈ والے مکان کی سب سے اوپر والی منزل میں لینڈ سکیپ بناتے دیکھتا ہوں۔ تجریدی آرٹ

سے پہلے انور جلال بڑی خوبصورت لینڈ سکیپس بنایا کرتا تھا۔ تجریدی آرٹ میرا خیال ہے اس نے جھنجھلا کر شروع کیا تھا۔ اس نے شملے کی ایک خیالی لینڈ سکیپ بنائی تھی۔ خیالی ان معنوں میں کہ جو درخت اور سرسبز ڈھلانیں اس نے شملے میں دیکھی تھیں انہیں کینوس پر رنگوں کے ساتھ منتقل کر دیا۔ اس کی یہ تصویر پاکستان آرٹ نامی ایک جہازی سائز کے انگریزی رسالے میں بھی چھپی تھی جو میرے پاس موجود ہے۔ اس روغنی لینڈ سکیپ میں ہمیں انور جلال کے آنے والے تجریدی عہد کا ایک وعدہ ملتا ہے۔ یہاں برش کا بہاؤ ایک لہر کی طرح ہے جو ہلکے سٹروک کو اپنے بہاؤ کے ساتھ بہاتی، دائروں کو توڑتی تصویر کے فریم سے باہر نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں انور جلال کی سیماب صفت طبیعت کی جھلک بھی ہے۔ عام حالات میں بھی وہ تیز چلنے کا عادی تھا۔ مال پر جب بھی ہم چہل قدمی کرنے نکلتے تو وہ مجھ سے ہمیشہ دو قدم آگے ہوتا اور مجھے اسے روک کر پیچھے بلانا پڑتا۔ یہی حال انور جلال کی تصویروں کا ہے۔ وہ اس زمانے میں بھی اس سے دو قدم آگے تھیں۔ اس کا سٹوڈیو بیڈن روڈ والے مکان کی تیسری منزل یعنی کوٹھے پر تھا۔ یہاں ایک کمرہ تھا جس کے آگے کوٹھے کی چھت اور ایک روشن دان بنا ہوا تھا۔ مئی جون میں یہ کمرہ تنور کی طرح تپنے لگتا۔ کمرے میں ایک چارپائی، ایک میز اور کچھ کینوس پڑے رہتے۔ انور جلال کبھی کبھی جب موڈ میں آتا، تصویر بنانے لگتا تھا۔ یورپ کے تجریدی مصوروں میں اسے ہسپانوی مصور ڈالی بہت پسند تھا۔ ڈالی رات کو اپنی آنکھوں میں عطر ڈال کر سویا کرتا تھا۔ انور جلال کو اس کی یہ ادا بڑی پسند تھی۔ پکاسو تو خیر سب کو ہی پسند تھا۔

مجسمہ سازوں میں ہم مُور کے شیدائی تھے اور انور جلال مُور کے مجسموں کی تصویریں لے کر ٹی ہاؤس میں آتا اور گھنٹوں ان کے فن کی باریکیوں اور تجریدی اثرات پر گفتگو کرتا۔ حسیب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا تو وہ ماچس اٹھا کر زور سے میز پر مارتا اور انور جلال کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔

''بس یار! کیہ بور کر ریا ایں۔''

تصویروں پر انور جلال اپنے نام کی جگہ "شمزا" لکھتا۔ یہ نام اس نے شاید اپنے کشمیری اجداد میں سے لیا تھا۔ لیکن ہم اسے ہمیشہ انور جلال کے نام سے ہی پکارتے تھے۔

ہم سب اپنی قمیصیں پہلے ایچ ایم حیات سے سلواتے تھے۔ پھر حسیب ایک روز گرے پاپلین کی قمیص پہن کر آیا تو اس کے کالر کی شیپ دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے۔ معلوم ہوا یہ قمیص اس نے دھنی رام روڈ کے ایک ماسٹر سے سلوائی ہے۔ بس ہم بھی ادھر کو دوڑ پڑے۔ ڈائمنڈ ٹیلرز اس دکان کا نام تھا۔ اس کا مالک قمیصوں کی کٹنگ کا بادشاہ تھا۔ برٹش اور امریکی سٹائل کو ملا کر کالر بناتا۔ اس میں ٹائی کی میڈیم ناٹ ایسی بجتی کہ بس کمال ہو جاتا تھا۔ لباس کی کاٹ تراش اور سلیقے کا ہم سب کو خبط تھا۔ گرمیوں میں بھی ہم گرے ورسٹڈ کی پتلونیں اور سمر کے شوز پہنتے تھے۔ سردیوں میں گرم چیک برٹش ٹائیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ تھری پیس سوٹ ہمیں پسند نہیں تھا۔ انور جلال کا خیال تھا کہ تھری پیس سوٹ صرف لندن کے بوڑھے سکول ماسٹروں کے لئے بنایا گیا ہے۔

انور جلال کا جسم ایسا متناسب تھا کہ اس پر سوٹ بڑا سجتا تھا۔ اس نے ایک روز مجھے کہا کہ میرا جسم ایک ماڈل کا جسم ہے۔ اگر میں یورپ میں ہوتا تو میری تصویریں فیشن رسالوں میں چھپتیں۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا۔

ہم پاک ٹی ہاؤس کی گھٹی گھٹی فضا سے بور ہوتے تو شیزان اور کیفے اور ینٹ (لارڈز) اور لورینگو میں آ کر بیٹھ جاتے۔ یہاں کا صاف ستھرا، شفاف اور چمکیلا ماحول ہمیں بہت پسند تھا۔ ان دنوں ہوٹل میں کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ یہ تقریباً 50ء یا 52ء کی بات ہے۔ میزیں اکثر خالی پڑی رہتی تھیں۔ مال روڈ والے شیزان کے کونے میں تانبے کے لمبوترے گلدان میں روز کے روز یوکلپٹس کی ٹہنیاں بدلی جاتی تھیں۔ ہوٹل کی فضا میں ان ٹہنیوں کی دھیمی دھیمی سوندھی خوشبو ہر وقت رچی رہتی۔ انور جلال، میں اور شجاع سیف بہترین لباس میں ملبوس خوبصورت، چمکیلے چہروں کے ساتھ ہنستے مسکراتے ایک کونے میں بیٹھے مصوری، اعلیٰ ترین ٹرکش سگریٹوں، والٹ ڈزنی کے کارٹونوں،

انگرڈ برگمین کی آنکھوں، کالی داس کی شکنتلا اور امریکی اداکاراؤں کے بارے میں باتیں کر رہے ہوتے اور سنہری چائے کی گرم مہک شیزان کے بہترین فروٹ کیک کے میوؤں کی خوشبو کے ساتھ مل کر فضا میں کریون اے کے فلیور میں مخلوط ہو رہی ہوتی۔

بڑا خوشبو دار زمانہ تھا۔ فروٹ کیک کے میووں اور یوکلپٹس کی ٹہنیوں سے خوشبوئیں آیا کرتی تھیں۔ آج عطر میں خوشبو نہیں رہی۔ فروٹ کیک کے میوے پپیتے کے کالے بیج بن گئے ہیں۔ شیزان کی گیلری سر کے اوپر آ گئی ہے۔ نہ شکنتلا کی بات ہوتی ہے، نہ والٹ ڈزنی کے شوخ رنگوں والے کارٹون نظر آتے ہیں اور نہ یارڈلے کریم کی ٹھنڈی مہک ہے اور نہ چائے کی سنہری خوشبو ہے اور نہ ٹرکش سگریٹوں کا فلیور ہے۔ بیرے نلکے سے بھر بھر کر چائے کی چینکیں لئے آتے ہیں۔ گاہک سیاسیات، قانون اور سرمایہ کاری پر باتیں کرتے گرم میٹھا پانی پیئے جاتے ہیں۔ نہ وہ گلدان ہے اور نہ وہ یوکلپٹس کی ٹہنیاں ہیں اور نہ ان کی پُرسکون تنہائی پسند خوشبو ہے۔

انور جلال اپنا تخلص شمزا انگریزی میں بالکل اس طرح لکھتا تھا جس طرح آج کل ہمیں شیزان لکھا نظر آتا ہے۔ مال پر شیزان والوں نے انور جلال سے کہا کہ ہمیں بورڈ پر لیٹرنگ کر دے۔ انور جلال نے مجھے کہا۔

"اے حمید! میں نے اپنے دستخط بیچ دیئے ہیں۔"

اور دوسرے دن شیزان کے ماتھے پر جو بورڈ لگا تھا اس کا ایس اے اور زیڈ بالکل جلال کے شمزا دستخطوں والا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے وہ شمزا لکھا ہوا لگا۔ ویسے انور جلال کو اس کا احساس تھا کہ اس نے اپنے دستخط فروخت کر دیئے ہیں۔ اس سے پہلے کمرشل لیٹرنگ میں لفظ ایس، اے اور زیڈ اس طرح کسی نے نہیں لکھا تھا۔ اس زمانے میں ہمارا ذریعہ معاش ہوائی تھا۔ کبھی پیسے آ گئے، کبھی نہ آئے۔ مگر ہماری جیبیں کبھی خالی نہیں ہوتی تھیں۔ بہترین چائے، خوشبو دار فروٹ کیک اور اعلیٰ ترین سگریٹوں کے لئے ہمیں ایک پل کا بھی انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے ذہن پاکیزہ، خیالات نیلے آسمان کی طرح روشن، ہمارے جذبے گرم، پُرجوش اور بھرپور تھے۔ خوبصورت لڑکی ہمیں سرِ راہ

کھلا ہوا پھول لگتی جسے ایک نظر دیکھ کر ہم مسکرا کر آگے گزر جاتے۔ ہماری کائنات اعلیٰ لباس، اعلیٰ سگریٹ، اعلیٰ چائے، حد نگاہ تک پھیلی لینڈ سکیپ، بہترین سینٹ، چیک گرم ٹائیاں، چیکوسلواکیہ کے رومال، یارڈلے کی کولڈ مہک اور اولڈ ماسٹرز کی اپنے آپ میں جذب کرنے والی پینٹنگز تھی۔ گرم، پُرجوش، بلند آرزوؤں کے چراغوں کی روشنی لئے خون ہماری رگوں میں گردش کرتا تھا اور ہم اپنی ہی خوشبو میں مست پھرا کرتے۔ گھٹیا خیالات، سفلی جذبات اور جنس زدگی کے احساس کی گرد بھی ہمیں چھو کر نہیں گزرتی تھی۔ نفس کی دلدل ہمارے اردگرد ضرور تھی لیکن ہمارے چہرے کنول پھول کی طرح اس دلدل سے باہر دھوپ کی سنہری کرنوں میں ہر وقت چمکا کرتے۔

انور جلال کمرشل کام کر لیتا تھا۔ میں افسانے لکھ کر تھوڑا بہت کما لیتا تھا۔ پھر اس نے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ میں نہیں جانتا اس نے کب اور کیوں لکھنا شروع کر دیا۔ بہرحال اس کی تحریریں خود اسی کی طرح تر و تازہ، شاداب، شگفتہ اور تیکھی تیکھی تھیں۔ انور جلال کی حسِ ظرافت کے آگے بہت کم دوست ٹھہرتے تھے۔ بات سے بات نکالتا۔ بات کو ذرا سا پھیر کر معنی بدل دیتا۔ کبھی ایسا فقرہ کہتا کہ دوسرا ہکا بکا ہو کر رہ جاتا۔ اس کی تحریروں میں بھی اس کی شخصیت کی بھرپور جھلک تھی۔ چنانچہ لوگوں نے اسے پسند کیا۔

ملک دین محمد اینڈ سنز کی جانب سے ایک پندرہ روزہ رسالہ ''احساس'' جاری ہوا تو انور جلال اور عباس احمد عباسی اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ عباسی کا نام لکھتے ہی وہ خوش پوش، خوش وضع، صاحب طرز نوجوان یاد آ گیا جو پہلی نظر میں اندلس کا شہزادہ لگتا تھا۔ وہ ہمیں چھوڑ کر جنت کو سدھار گیا۔ اس کی پیاری اور دل نشیں یادیں ہم سب دوستوں کا سرمایہ ہیں۔

انور جلال اور عباس احمد عباسی نے مل کر رسالے کو ایک خاص معیار عطا کیا۔ ملک کے نامور ادیب اور شاعر اس میں لکھنے لگے تھے۔ نل روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ میں انور جلال سے ملنے وہاں جایا کرتا۔ کھٹا کھٹ مشینیں چل رہی ہیں۔ کتابیں بوریوں میں

بھری جا رہی ہیں۔ کاتبوں کی قطار بیٹھی ہے۔ سنگ ساز پلیٹوں پر جھکے تصحیح کر رہے ہیں۔ انور جلال ایک نیچی چھت والے کمرے میں چھوٹی میز پر عباسی کے ساتھ بیٹھا ہے۔ عباسی اپنی بھاری بھر کم دھیمی آواز میں دونوں ہاتھ ہلا کر قہقہہ لگاتا اور مجھے خوش آمدید کہتا۔ انور جلال چپکے سے اپنے چمڑے کا سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیتا۔ انور جلال کو چمڑے کے سگریٹ کیس رکھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک بار میں نے اس کے پاس ایک مصری چمڑے کا سگریٹ کیس دیکھا جس کے باہر فرعون مصر کی تصویر اُبھری ہوئی تھی۔ یہ سگریٹ کیس مجھے بہت پسند تھا۔ مگر میں نے انور جلال کو نہیں بتایا۔ کیونکہ وہ اپنی چیزیں دوستوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔

شجاع سیف نے ایک اشاعتی ادارہ کھولا تو انور جلال نے اس کے دفتر کی ڈیکوریشن کے لئے ایک میز ڈیزائن کیا جس کی شکل مصوروں کے ہاتھ میں پکڑنے والے پلیٹ کی طرح تھی۔ شجاع سیف کو بھی کتابیں چھاپنے سے زیادہ دفتر کی آرائش سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ دفتر بن سنور گیا اور کتابوں کو چھاپنے کا مرحلہ آیا تو شجاع سیف بیزار ہو گیا اور ایک روز اپنے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"یار! یہ تو بڑی بک بک کا کام ہے۔"

انور جلال کی والدہ (اللہ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائے) ہم سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتیں۔ وہ انور جلال کے سبھی دوستوں کو اپنا بیٹا سمجھتی تھیں اور ہم جب بھی انور جلال کے گھر جاتے وہ ہمارے لئے خاص طور سے کشمیری چائے بنا کر کھنڈ قلچوں، باقر خانیوں کے ساتھ اوپر بھجواتیں۔ شفقت اور ایثار کے جذبے سے بھرپور وہ ایک باوقار، سنجیدہ کشمیری بزرگ خاتون تھیں۔ انور جلال بھی اپنی والدہ سے بہت پیار کرتا تھا۔

انور جلال کے والد صاحب بھی ہم سے ہمیشہ گرم جوشی اور محبت کا سلوک کرتے۔ وہ بڑے وضع دار، کم گو اور باہمت بزرگ تھے۔ انہوں نے انور جلال کے کیریئر اور اس کی ترجیحات اور عزائم میں کبھی دخل نہیں دیا۔ انہیں اپنے بچوں کی خوشنودی ہمیشہ عزیز

رہی۔ انور جلال کی طرح وہ بھی خوش پوش اور خوش وضع بزرگ تھے۔

ہم اپنے کپڑے ہال روڈ کے مولوی صاحب سے ڈرائی کلین کرواتے اور دھلواتے تھے۔ یہ مولوی صاحب بھی اپنی جگہ پر ایک سکول آف تھاٹ تھے۔ دھلائی کے بل پر اُردو کے اساتذہ کے دو تین شعر بڑے خوبصورت خط نسخ میں ضرور لکھتے۔ انہیں اردو کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ شاعروں، ادیبوں کے کپڑے دھلا کر بڑے خوش ہوتے تھے اور چھ چھ مہینے بل ادا نہ کرو، کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ بس ان کے اشعار سننا شرط تھا۔ ہماری قمیضوں پر کلف لگوا کر خود اپنی نگرانی میں استری کرواتے اور تہہ کی ہوئی استری شدہ قمیضیں ایسے لگتیں جیسے چاندنی رات میں سفید پریاں موتیے کے پھولوں کی چادر اوڑھے سو رہی ہیں۔ ہم چار چار دن ایک ہی قمیض میں گزارتے۔ کیا مجال جو کلف لگی قمیض پر گرد کا ایک ذرّہ بھی دم بھر کے لئے ٹھہر جائے۔ میں کپڑے لینے جاتا تو مولوی صاحب انور جلال کا پوچھتے کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ انور جلال جاتا تو حسیب یا شجاع یا سلو کا پوچھتے کہ وہ کیوں نہیں آئے۔ انہیں ہم سب سے بڑی محبت تھی، پیار تھا۔ بڑے محبت اور پیار کے آدمی تھے۔ ہر وقت گول مٹول سانولے چہرے پر مسکراہٹ رہتی اور دکان کے اندر شعر گنگناتے آتش پارے کی طرح گھوما کرتے۔ آج ہال روڈ پر ان کی دکان کی جگہ ایک کمرشل بلڈنگ کھڑی ہے۔ مولوی صاحب کی دکان کہیں بیچ میں ہی غائب ہوگئی ہے۔ مولوی صاحب بھی ہماری نظروں سے غائب ہو گئے ہیں۔ پیار کی نشانیاں ایک ایک کر کے غائب ہو رہی ہیں اور ان کی جگہ چھ چھ منزلہ کمرشل عمارتیں کھڑی ہوگئی ہیں۔ آج بھی میں ہال روڈ سے گزرتے ہوئے احتراماً اس بلڈنگ کی طرف ضرور دیکھ لیتا ہوں جس کے نیچے مولوی صاحب کی دکان دفن ہو چکی ہے۔ پھر مجھے انور جلال بہت یاد آتا ہے۔ اس شہر لاہور کے ہر موڑ پر میرے دوستوں کی یادیں مہر بلب کھڑی ہیں۔ ہر کمرشل بلڈنگ اور شاپنگ پلازہ کے نیچے ہمارے سنہری دنوں کی روشن شکلیں دفن ہیں۔

انور جلال گھڑی اور ڈائری کے ساتھ چلتا تھا یا شاید اسے کمرشل کام کے لئے وقت

اور تاریخ کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ میرے سامنے اس وقت انور جلال کی ایک 1951ء کی پاکٹ ڈائری پڑی ہے۔ یہ اتفاق سے میرے پاس رہ گئی ہے۔ اس کے جنوری کے مہینے کی 19 اور 20 تاریخوں میں لکھا ہے:

قندیل کے دفتر	11-AM
کریسنٹ پبلٹی	12-NOON
دین محمدی پریس	؟
مہتاب	2 بج کر تیس منٹ
اے حمید	3 بجے
ڈراما مجلس	5 بج کر تیس منٹ
رشک	؟

ایک دوسری تاریخ کے ورق پر لکھا ہے:

عباسی	ریگل
''خراشیں''	ایوب نسیم

کیفے اورینٹ اس جگہ پر تھا جہاں آج کل لارڈز ہوٹل بھی نہیں ہے۔ اس زمانے میں صحافیوں کا پسندیدہ ریسٹورنٹ تھا۔ شام کو ہوٹل کے آگے بید کی آرام کرسیاں اور میزیں باہر لگا دی جاتیں اور لاہور کے بزرگ صحافی وہاں اپنی مجلس سجاتے۔ اس زمانے میں مسجد شہداء سے نکل کر پی آئی اے کے دفتر تک جاتی سڑک پر تانگہ تو کجا سائیکل مہینے میں ایک بار دکھائی دیتی تھی۔ سڑک پُرسکون رہتی۔ صرف مال روڈ پر تانگے، سائیکل اور کبھی کبھی کوئی کار گزرا کرتی۔ بس ابھی صرف ایک یا دو نمبر ہی چلنی شروع ہوئی تھی۔ نہ شور ہوتا نہ ہنگامہ ہوتا۔ ہم لوگ بھی کبھی کبھی شام کو یہاں اپنی منڈلی لگا لیتے تھے۔

باغ جناح کے اوپن ایئر ریستوران والوں نے پہلو میں ایک بلیئرڈ روم بنوایا جہاں کی نیم روشن فضا میں ایک سبز بڑا سا بلیئرڈ ٹیبل خاموش پڑا رہتا۔ کبھی کبھار کوئی آدمی

اندر آ کر لمبی چھڑی کو چاک سے رگڑتا اور بلیئرڈ ٹیبل پر جھک کر سرخ و سفید گیندوں کو ٹھیک کرنے لگتا۔ اس بلیئرڈ روم کا ایک برآمدہ بھی تھا جو ہمیں بہت پسند تھا۔ یہاں ایک بڑا سا پیانو بھی پڑا رہتا جس پر سال میں ایک بار کوئی آدمی بیٹھا اسے بجاتا دکھائی کم اور سنائی زیادہ دیتا۔ کیونکہ پیانو بہت بڑا تھا۔

⊚……⊚

''

ٹی ہاؤس میں داخل ہوں تو دائیں جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ لگا ہے۔ سامنے ایک لمبی میز ہے۔ میز کی تینوں جانب کرسیاں رکھی ہیں۔ یہاں شام کے قت عام طور پر حلقہ ارباب ذوق والے ادیب، شاعر اور نقاد بیٹھتے تھے۔ ناصر کاظمی، نتظار حسین، سجاد باقر رضوی، سید سجاد رضوی، قیوم نظر، شہرت بخاری، انجم رومانی، امجد لطاف امجد، احمد مشتاق اور مبارک احمد کی محفل شام کے وقت اسی میز پر لگتی تھی۔ چائے کے دور چلتے تھے اور ادب کے متعلق ہر موضوع پر بڑی گرم جوشی سے بحث مباحثے وتے تھے۔ اس کے پہلو میں دوسری میزوں پر بھی بعض ادیب اور شاعر بیٹھتے تھے۔

میں، انور جلال، عباس احمد عباسی، ہیرو حسیب، سلو، شجاع، ڈاکٹر ضیاء وغیرہ قائد عظم کی تصویر کے نیچے جو لمبی میز اور صوفہ بچھا تھا وہاں اپنی محفل سجاتے تھے۔ نواز، تنصر حسنین اور جاوید افضل عام طور پر درمیان میں جو گول میزیں لگی تھیں ان میں سے کسی یز پر بیٹھتے۔ میری سب سے دوستی تھی۔ کبھی میں اٹھ کر انتظار حسین، شہرت بخاری اور اصر کاظمی کی مجلس میں شامل ہو جاتا۔ کبھی نواز اور تنصر الحسنین کی میز پر آ جاتا۔ قیوم نظر کا قہقہہ گونجتا تو ہمارے چہروں پر بھی مسکراہٹ آ جاتی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر سہیل احمد خان، پروفیسر عبدالصمد صارم بھی کالج کی صروفیات میں سے وقت نکال کر ٹی ہاؤس آ جاتے اور ادبی گفتگو میں مزید گرمجوشی پیدا و جاتی۔ یہ ٹی ہاؤس میں ادبی محفلوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور مد حسن عسکری اور مشہور ترقی پسند نقاد ممتاز حسین اور سید سبط حسن بھی دن میں ایک آدھ ر ضرور ٹی ہاؤس آتے۔ ہفتے کی شام کو وائی ایم سی اے میں انجمن ترقی پسند مصنفین

اور حلقہ علم کے ادبی اجلاس ہوتے۔ اس روز ٹی ہاؤس میں ادیبوں، شاعروں اور ادب کے پرستاروں کا ایک ہجوم ہوتا۔ ہر مکتبہ فکر کے ادیب، شاعر، نقاد اور دانشور اپنی الگ الگ محفل سجائے بیٹھے ہوتے۔ چائے کے دور چل رہے ہوتے اور بڑی پُر جوش بحثیں ہو رہی ہوتیں۔ اس روز ٹی ہاؤس میں ملک اختر، ابن انشاء، عبداللہ ملک، سید سبط حسن، صفدر میر، اصغر سلیم، احمد راہی اور دوسرے تقریباً میرے سبھی ترقی پسند شاعر اور ادیب دوست موجود ہوتے۔

تینوں ادبی جلسوں میں ادب سے محبت کرنے والوں کی بھاری تعداد موجود ہوتی۔ لوگ کمرے کی کھڑکیوں میں چڑھ کر بیٹھے ہوتے اور بڑی خاموشی اور توجہ سے ادبی مقالے، افسانے اور غزلیں، نظمیں سنتے اور بعد میں بحث میں بھی حصہ لیتے۔ یہی لوگ حقیقت میں ادب کے سرپرست تھے اور انہی لوگوں کی ادب سے محبت اور ادبی شعور نے ہم سے اپنے بہترین افسانے، نظمیں اور غزلیں تخلیق کروائیں۔

ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں میں سے سوائے چند ایک کے باقی کسی کا بھی کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا۔ کسی ادبی پرچے میں کوئی غزل، کوئی نظم، کوئی افسانہ لکھ دیا تو پندرہ بیس روپے مل گئے اور ان میں ہی گزارہ ہو گیا۔ کبھی کسی کے لب پر تنگیٔ معاش کا شکوہ نہیں آیا تھا۔ ہم لوگ ہمہ وقت شعر و ادب کے عالم سرمستی میں رہتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی دوست کی جیب خالی ہے تو وہ ٹی ہاؤس کی چائے اور سگریٹوں سے محروم رہے۔ جس کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیتا تھا۔ اگر اس کی جیب بھی خالی ہوتی تو پرواہ نہیں۔ یکے از مالکان ٹی ہاؤس یعنی علیم صاحب بڑی فراخ دلی سے ادھار کر لیتے تھے۔ اگر علیم صاحب کاؤنٹر پر نہ ہوتے تو نو پرابلم، ٹی ہاؤس کے بیروں سے بھی ہمارا ادھار چلتا تھا۔ وہ نہ صرف چائے بلکہ ہمیں ادھار سگریٹ بھی لا کر دے دیتے تھے۔ علیم صاحب سے میری دوستی بھی تھی۔ مجھے میری کسی کہانی یا ناول کے پیسے ملتے تو میں بے دریغ خرچ کرتا۔ پیسے ختم ہو جاتے تو ٹی ہاؤس سے میرا ادھار شروع ہو جاتا۔ کسی کتاب کا معاوضہ

ملتا تو سب سے پہلے میں ٹی ہاؤس کا حساب چکاتا۔ کیونکہ ٹی ہاؤس ہمارا دوسرا گھر تھا اور اس سے جدائی ہمیں گوارا نہیں تھی۔

افسانہ نگار اشفاق احمد ان دنوں نمبر 1 مزنگ روڈ والے مکان میں رہتا تھا۔ شام کو وہ بھی ٹی ہاؤس آ جاتا۔ خوش مزاج اور دوست نواز شاعر بقا نقوی شاہد ہادامی باغ سے روزانہ آتا۔ بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔ دبلا پتلا، اطالوی چہرے والا لڑکا نور چھاؤنی سے کبھی بس میں اور پیسے نہ ہوتے تو پیدل ہی لاہور چھاؤنی سے چل کر ٹی ہاؤس آتا۔

اشفاق احمد باقاعدگی سے ٹی ہاؤس میں آنے والوں میں سے نہیں تھا۔ لیکن دوسرے تیسرے شام کو ضرور آتا۔ دن کو بھی کالج کے کسی خالی پیریڈ میں ٹی ہاؤس آ جاتا۔ چراغ حسن حسرت، ریاض قادر، عبداللہ بٹ اور مصور شاکر صاحب اور معین نجمی، علی امام اور احمد پرویز کی محفل کافی ہاؤس میں لگتی تھی۔ ریاض قادر کے بڑے بھائی احسان قادر ٹی ہاؤس میں بیٹھتے تھے۔ وہ دوسری عالمی جنگ میں آزاد ہند فوج میں جا ملے تھے اور جنگ ختم ہونے کے بعد دلّی کے لال قلعے میں ان پر بھی انگریز نے مقدمہ چلایا تھا۔ ان کے بارے میں گوپال متل اپنی کتاب ''لاہور کا جو ذکر کیا'' میں لکھتے ہیں:

> ''آزاد ہند فوج میں شامل ہونے والوں میں اُردو کے مشہور ناقد سر عبدالقادر کے فرزند احسان قادر بھی تھے جو ضابطے کی کارروائی کے مرحلوں سے گزر کر بہت پہلے لاہور آ چکے تھے۔''

سر عبدالقادر کے سارے بیٹے گول مٹول اور گورے رنگ کے تھے۔ لیکن احسان قادر صاحب کی رنگت گہری سانولی تھی۔ موٹے شیشوں کی عینک لگاتے تھے۔ ادیبوں کی منڈلی میں بیٹھتے تھے۔ خاموش طبع تھے۔ کبھی کبھی دھیمے لہجے میں سبھاش چندر بوس اور جاپانیوں کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ زیادہ تر دوسروں کی باتیں سنتے تھے، خود کم بولتے تھے۔

جب تک عباس احمد عباسی کراچی منتقل نہیں ہوا تھا اور لاہور میں تھا تو وہ بھی ہماری

ٹی ہاؤس کی محفل میں شریک ہوتا تھا۔ عباس احمد عباسی کا تعلق دِلّی کے ایک ممتاز عالم دین خانوادے سے تھا۔ اس نے عربک کالج دِلّی سے گریجویشن کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے اُردو کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس کا تعلق ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی رہا اور بی بی سی میں بھی اس نے بطور براڈ کاسٹر دس گیارہ سال ملازمت کی۔ وہ رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں سے تھا اور کراچی میں اُردو سائنس کالج کے قیام میں اہم کردار ادا کرنے کے علاوہ انجمن ترقی اُردو کا سیکرٹری جنرل بھی رہا۔ جن دنوں وہ لاہور کے ایک پندرہ روزہ رسالے ''احساس'' کے حلقہ ادارت میں تھا تو اس سے روز ہی ملاقات رہتی اور جلال بھی اس کے ساتھ ہی شعبہ ادارت میں تھا۔

پندرہ روزہ ''احساس'' کا دفتر مل روڈ پر تھا۔ خالص ادبی رسالہ تھا۔ دفتر کے اوقات میں، میں بھی وہاں پہنچ جاتا۔ انور جلال اور عباس احمد عباسی پہلے سے وہاں موجود ہوتے تھے۔ دفتر کا کام ختم کر کے ہم تینوں ٹی ہاؤس کی طرف چل پڑتے۔ عباسی کا جسم اکہرا تھا۔ ہماری طرح وہ بھی خوش لباس تھا۔ نکلتا ہوا قد تھا۔ چہرے کا رنگ زردی مائل تھا۔ آواز بڑی گمبھیر تھی مگر بہت کم بولتا اور آہستہ آہستہ بولتا تھا اور بولتے وقت الفاظ کا پورا حق ادا کرتا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی ذہین چمک تھی۔ کبھی کوئی فالتو بات نہیں کرتا تھا۔ وضع داری اور خوش مزاجی کا نمونہ تھا۔ ادب آداب اور قدیم شرفاء کی روایات کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ ہماری منڈلی کے سبھی شاعر اور ادیب دوست عباسی سے بہت پیار کرتے۔ چہرے کے نقوش خوبصورت تھے۔ ناک قدیم یونانیوں کی طرح آگے سے پوائنٹڈ تھی۔ چہرے پر ذہانت کی بجائے بچوں جیسی معصومیت تھی۔ والٹ ڈزنی کے کارٹون دیکھ کر بچوں کی طرح قلقاریاں لگاتا مگر کھل کر کبھی نہیں ہنستا تھا۔ کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی کسی دور بیٹھے دوست کو اونچی آواز میں بلانا ہوتا تھا تو وہ مجھے کہتا کہ یار ذرا اس کو آواز دے کر بلاؤ۔ سر ذرا سا جھکا کر آہستہ آہستہ بات کرتا۔ اس کو باتیں کرتے دیکھ کر لگتا تھا کہ اپنے آپ سے

ہم کلام ہے۔ معاشی اعتبار سے وہ ایک خوش حال خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اپنی خوش لباسی اور لاابالی طبیعت کو برقرار رکھ سکے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ کاروبار کرنے کی انوکھی اور نئی نئی سکیمیں سوچتا رہتا۔ ہر روز وہ ایک نئی سکیم سوچتا۔ دو دن تک اس پر غور کرتا پھر اسے بھول جاتا اور کسی دوسری سکیم پر غور وفکر شروع کر دیتا۔ آدمی جو بھی سکیم سوچے جب تک اس پر عمل نہ کرے اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ شجاع کے ساتھ مصیبت یہ تھی اور یہ ہے کہ سکیم وہ بڑی عمدہ سوچتا مگر جب اس پر عمل کرنے کا وقت آتا اس کا سارا جوش فالتو بھاپ بن کر نکل جاتا۔

ایک بار شجاع نے پبلشنگ ادارہ قائم کرنے کی سکیم بنائی۔ دفتر بھی بنا لیا۔ اسے بڑے آرٹسٹک انداز میں سجا بھی دیا۔ مجھ سے ایک ناول کا مسودہ بھی لے لیا۔ لیکن جب مسودے کی لکھائی کا مرحلہ آیا تو پبلشنگ کی سکیم کے ساتھ شجاع کی ساری دلچسپیاں ختم ہو گئیں۔ دفتر چھوڑ دیا، فرنیچر اونے پونے بیچ دیا۔ ایک روز میں ٹی ہاؤس آیا تو شجاع سیف بڑا نفیس سوٹ پہنے ٹوئل کی پھولدار ٹائی لگائے اکیلا ہاف سیٹ چائے منگوا کر بیٹھا تھا اور بڑی نزاکت سے کپ میں براؤن کلر کی چائے انڈیل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بیرے کو ایک اور کپ لانے کے لئے کہا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہوئی، پبلشنگ کا ارادہ بدل دیا؟''

وہ بڑی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا۔ ''یار! بڑی بک بک ہے یہ۔''

ہم چائے پیتے ہوئے امریکی ایکٹر باب ہوپ اور والٹ ڈزنی کے کارٹونوں کی باتیں کرنے لگے۔ شجاع کی نزاکت طبع چائے پیتے وقت بھی اس پر غالب رہتی تھی۔ چائے پیتے ہوئے اس کے پتلے ہونٹ بڑے معمولی سے کھلتے۔ ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ چائے کے کپ کو بڑی شائستگی سے بوسہ دے رہا ہے۔ کپ بڑی آہستہ سے پرچ میں رکھ کر کہنے لگا۔

''میں ایک اور پروگرام بنا رہا ہوں۔ ایک اور سکیم میرے دماغ میں آئی ہے۔''

جب ہماری ٹی ہاؤس کی منڈلی بکھر گئی تو شجاع سیف لندن چلا گیا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ انور جلال اور عباس احمد عباسی پہلے سے لندن میں موجود تھے۔ وائس آف امریکہ میں نیوز ٹرانسلیٹر سنٹر میں میرا امتحان ہوا۔ حل شدہ پرچے اور میری آواز کی ٹیپ سربمہر ہو کر واشنگٹن گئی۔ تین ماہ بعد خط ملا کہ میں پاس ہو گیا ہوں۔ ایک ماہ بعد مجھے کال آ گئی اور میں امریکہ چلا گیا اور وائس آف امریکہ کی اُردو سروس جوائن کر لی۔

پہلے روز VOA کی اُردو سروس کے آفس میں پہنچا تو دیکھا کہ شجاع سیف ایک میز پر براجمان خبروں کا ترجمہ کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ شجاع کام کر رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ اسے ذمہ داری سے کوئی کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ لندن سے امریکہ آ گیا تھا اور یہاں اس نے امتحان دے کر VOA کی اُردو سروس جوائن کر لی تھی۔ لیکن اس کی طبیعت کا لاابالی پن اور کسی جگہ ٹک کر نہ بیٹھنے کی عادت اس کے ساتھ آئی تھی۔

میری فیملی کے امریکہ آنے میں ابھی ہفتہ دس دن کی دیر تھی چنانچہ میں دو دن اکمل علیمی کے پاس رہا۔ پھر شجاع سیف کے فلیٹ میں آ گیا۔ VOA کی نوکری اس اعتبار سے بڑی سخت تھی کہ منہ اندھیرے اٹھ کر پہلے بس اور پھر انڈر گراؤنڈ ٹیوب پکڑنی پڑتی تھی۔ وقت کی پابندی لازمی شرط تھی۔ عین وقت پر آفس پہنچ کر خبروں کا ترجمہ کرنا پڑتا تھا اور خبروں کا بلیٹن عین وقت پر نشر ہونا ہوتا تھا۔ مجھے اس معاملے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ مجھے بچپن ہی سے منہ اندھیرے اٹھ کر کمپنی باغ اور امرتسر کے چالیس کنوؤں پر جا کر ورزش کرنے اور سیر کرنے کی عادت تھی۔ صبح صبح ساڑھے چھ بجے کی بس پکڑ کر میٹرو ٹیوب سٹیشن اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر ٹھیک ساڑھے سات بجے دفتر پہنچنا پڑتا تھا۔ میں ٹھیک پانچ بجے الارم کے ساتھ اٹھ بیٹھتا۔ صبح کو نہانا بھی میری بچپن سے عادت ہے۔ میں ٹھیک چھ بجے نہا دھو کر کپڑے پہن کر چائے کا مگ لے کر تیار ہو کر بیٹھ جاتا اور شجاع ابھی سو رہا ہوتا تھا۔ میرے جگانے پر وائس آف

امریکہ کی نوکری کو برا بھلا کہتا غسل خانے میں گھس جاتا۔ خدا خدا کر کے غسل خانے سے نکلتا۔ بڑی مشکل سے کپڑے بدلتا، بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے بار بار منہ کھول کر اپنے دانتوں کا معائنہ کرتا۔ جب بس کے آنے میں صرف پانچ منٹ رہ جاتے تو ہم اپنی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے نکل کر سامنے فٹ پاتھ پر بنے بس سٹاپ پر آ کر کھڑے ہو جاتے۔

ایسا شاید ہی کبھی ہوا کہ شجاع آفس جاتے ہوئے کوئی شے لانی بھول نہ گیا ہو۔ کبھی وہ اپنے آفس کے دراز کی چابی لانی بھول جاتا، کبھی بس کی سلاٹ مشین میں ڈالنے کے لئے پینتیس سینٹ کا چینج ساتھ لانا بھول جاتا۔ اگر وقت ہوتا تو وہ جلدی سے فلیٹ میں جا کر مطلوبہ اشیاء لے کر آتا۔ اگر بس کے آنے میں دو تین منٹ رہتے ہوں تو مجھے کہتا۔ ''تم جاؤ، میں ٹیکسی میں آ جاؤں گا۔''

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ شجاع اکثر آفس لیٹ پہنچتا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ امریکہ میں اور خاص طور پر امریکہ کے سرکاری دفاتر میں اور پھر ریڈیو سٹیشن پر ایک ایک سیکنڈ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شجاع سیف کے لئے جم کر کام کرنے اور ریڈیو سٹیشن پر کام کرنے کا یہ پہلا تکلیف دہ تجربہ تھا۔ چنانچہ وہ زیادہ دیر وائس آف امریکہ کے ساتھ نہ چل سکا اور نوکری چھوڑ کر واشنگٹن میں ٹیکسی چلانے لگا۔ میرا وہ نہ صرف پرانا یار تھا بلکہ ننانوے فیصد ہمارے ذوق اور مزاج ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ وہ اسی فلیٹ میں رہتا تھا اور میں فیملی کے آ جانے کے بعد اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کی چوتھی منزل کے ایک فلیٹ میں آ چکا تھا۔ ہفتہ اتوار کی چھٹی کے دن میں اس کے پاس چلا جاتا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ زندگی میں شاید اس نے ایک ہی عقل مندی کا کام کیا تھا کہ شادی نہیں کی تھی۔ ہم چائے یا کافی کے مگ لے کر بیٹھ جاتے اور لاہور کی باتیں، اپنے لاہور کے ٹی ہاؤس کے دوستوں کی باتیں، انور جلال شمزا اور نواز کی باتیں کرتے رہتے۔ شجاع زیادہ دیر ٹیکسی کی دربدری نہیں کرتا تھا۔ صرف رات کو یا صبح کے وقت یورپ اور اندرون امریکہ کی دو چار فلائٹوں کی سواریاں اٹھانے جاتا اور باقی سارا دن اپنے فلیٹ پر لیٹا لیٹا

وی دیکھتا یا رسالے پڑھتا رہتا یا پھر لندن اور پیرس میں اپنے دوستوں کو ٹیلی فون کرتا رہتا۔ چنانچہ ٹیلی فون لائن پر ہی پیرس کی ایک لڑکی سے اس کی دوستی ہو گئی۔ اب شجاع کو ایک کام مل گیا۔ یہ بڑا رومانٹک کام تھا۔ وہ اس لڑکی سے گھنٹوں ٹیلی فون پر آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہتا۔

ویک اینڈ پر میں جب بھی اس کے فلیٹ پر جاتا وہ لکڑی کے فرش پر بچھے گدے پر نیم دراز اپنی پیرس کی دوست سے فون پر باتیں کر رہا ہوتا۔ ٹیکسی چلا کر وہ جتنے ڈالر کماتا اس کے آدھے ڈالر ٹیلی فون کے بل پر صرف ہو جاتے۔ لیکن اس کے دوسرے کوئی فضول قسم کے اخراجات بھی نہیں تھے۔ نہ وہ سگریٹ پیتا تھا نہ شراب اس نے کبھی پی تھی۔ اکیلا آدمی تھا۔ شاید پہلی بار کسی لڑکی سے اس کا رومانس ہوا تھا۔ بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔

ایک روز اس نے مجھے اور اکمل کو یہ دھماکہ خیز خبر سنائی کہ وہ اپنی پیرس والی محبوبہ سے شادی کرنے کی سکیم بنا رہا ہے۔ میں نے اس خبر کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ مجھے معلوم تھا کہ شجاع سیف صرف سکیمیں بناتا ہے، ان پر عمل کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ لیکن اس بار وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے باقاعدہ شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنی ہونے والی بیوی کے لئے کچھ تحفے تحائف بھی خرید کر رکھ لئے۔ اکمل نے مجھے کہا۔ ''خواجہ! شجاع تو شادی کے معاملے میں واقعی سیریس ہو گیا ہے۔''

لیکن مجھے یقین تھا کہ شجاع حسب عادت اپنی شادی کی سکیم کے ساتھ بھی زیادہ دور تک نہیں چل سکے گا۔ وہ واپس آئے ہی آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس نے اپنی شادی پر پیرس جانے کے لئے ایئر فرانس کی ایک فلائٹ پر اپنی سیٹ بھی بک کروائی تھی کہ اکمل علیمی نے مجھے دفتر پہنچنے پر یہ خبر سنائی کہ شجاع نے پیرس جانے والی فلائٹ پر اپنی سیٹ کینسل کرا دی ہے۔ اسی شام آفس سے واپسی پر میں شجاع کے اپارٹمنٹ میں اصل حقیقت معلوم کرنے گیا تو وہ لکڑی کے فرش پر بچھے ہوئے گدے پر نیم دراز کانی کا

مگ ہاتھ میں لئے کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔

''چینک میں کافی ابھی گرم ہے۔ اپنا مگ بنا کر لے آؤ۔''

میں کافی کا مگ بنا کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''پیرس کب جا رہے ہو؟''

شجاع نے کافی کا مگ اپنے ہونٹوں سے الگ کر کے کہا۔

''میں نے شادی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔''

میں نے حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''وہ کیوں؟''

شجاع نے بے نیازی سے کہا۔

''کون اس بک بک میں پڑے یار!''

وہ اپنی گزشتہ روایات اور عادت کے مطابق سب کچھ بھول کر اپنی روزمرہ کی لائن پر واپس آ گیا۔ ایک بار صبح اور ایک بار رات کو ایئرپورٹ سواریاں پکڑنے جاتا اور باقی کا وقت اپنے فلیٹ میں گدے پر نیم دراز ہو کر یا ٹیلی ویژن دیکھتا رہتا اور یا رسالے کتابیں پڑھتا رہتا۔ ویک اینڈ پر میں اس کے پاس آ جاتا۔ کبھی ہم دونوں اکمل علیمی کے ہاں چلے جاتے اور اس کے ووڈ برج والے مکان کے صحن میں اُگے ہوئے سیب کے درخت پر سے سیب توڑ کر کھاتے اور رات کا کھانا بھی وہیں کھاتے۔ واپسی پر شجاع مجھے میرے فلیٹ پر چھوڑ کر خود ایئرپورٹ کی طرف نکل جاتا۔

شجاع اپنی زندگی کے ایسے معمولات سے کبھی نہیں اُکتایا تھا۔ اس کے لئے ہر دن ایک نیا سورج لے کر طلوع ہوتا تھا۔ میں نے اسے کبھی مایوس اور غمگین نہیں دیکھا۔ جتنا خوش وہ کوئی نئی سکیم بنا کر ہوتا تھا اس سے زیادہ خوش وہ اس سکیم کو ترک کر دینے پر ہوتا تھا۔ جتنا خوش اور پُر جوش ہم نے اسے اپنی پیرس والی محبوبہ سے شادی کرنے کے فیصلے

پر دیکھا تھا اس سے زیادہ خوش وہ اس فرنچ لڑکی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر کے نظر آ رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو قدرت نے شاید شجاع کی بچوں جیسی معصومیت کے عوض اس کے مزاج کو ودیعت کر رکھی تھی۔

ایک روز میں اس کے اپارٹمنٹ میں گیا۔ وہ بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ حسب معمول فرشی گدے پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا آہستہ آہستہ کافی اس نزاکت سے پی رہا تھا کہ مجھے یقین ہے کافی کو بھی پتہ نہیں لگتا ہوگا کہ مجھے کوئی پی رہا ہے۔

مجھے دیکھ کر اس نے کافی کا مگ ایک طرف رکھ دیا۔ سرہانے کے نیچے سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اسے کھول کر دیکھو۔''

میں یہی سمجھا کہ پیرس سے اس کی محبوبہ نے خط لکھ کر اسے برا بھلا کہا ہوگا۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا۔ اس پر کافی بڑے شکستہ انگریزی میں کسی نے دستخط کیے ہوئے تھے۔ میں نے پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

کہنے لگا۔ ''یہ میرے اور تمہارے پسندیدہ ایکٹر چارلس ہیلسن کے دستخط ہیں۔ رات میں ڈلیس ایئرپورٹ کے باہر ٹیکسی میں بیٹھا تھا۔ فلائٹ کی سواریاں باہر نکل رہی تھیں کہ ایک دراز قد، چوڑے چکلے امریکی نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں ٹیکسی لے کر اس کے پاس گیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ امریکی ایکٹر چارلس ہیلسن تھا۔ وہ میری ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور مجھے ڈی سی چلنے کو کہا۔ کتنی دیر تک تو میں اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر آہستہ آہستہ میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ڈی سی پہنچ کر جب وہ اترنے لگا تو میں نے اس کاغذ پر اس کے آٹوگراف لے لئے۔ اب میں ایک آٹوگراف بک خریدوں گا اور یہ کاغذ اس میں چپکا دوں گا۔''

اپنے پسندیدہ اداکار کے آٹوگراف لے کر وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ کاغذ تہہ کر کے اس نے بڑی احتیاط سے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ امریکہ میں وقت بڑی تیزی سے گزرتا لگتا ہے۔ شاید اس

لیئے کہ وہاں ہر کوئی اپنے کام میں بے حد مصروف رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ میرا جی امریکہ سے اُکھڑنے لگا۔ مجھے لاہور کی سردیاں، لاہور کی گرمیاں اور ساون کی بارشوں میں بھیگتی زمین اور باغِ جناح کے پرانے کلاسیکل درختوں کی خوشبو اور موتیئے کے پھول اور چیت دساکھ میں گوجر خان کی ٹاہلیوں پر آئے ہوئے بور اور پوٹھوہار کی دھریکوں کے کاسنی پھولوں کی گہری خوشبوئیں اور لاہور سے راولپنڈی جاتی بارش میں بھیگتی ریل کار اور لاہور کی گلیاں اور کسی مکان سے آتی ڈھولک کی لے پر شادی بیاہ کے گیت گاتی بچیوں کی معصوم آوازیں یاد آنے لگیں اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں تخت پوش کے پاس کرسی پر بیٹھ کر دم کی ہوئی چائے پینا اور کھڑکی میں سے موتیئے کی بیل پر گرتی بارش کو دیکھتے رہنا اور بارش کی آواز سنتے رہنا یاد آنے لگا۔ میری ملازمت کی پانچ سال کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ میں VOA کی نوکری چھوڑ کر لاہور واپس آ گیا۔

شجاع سیف امریکہ میں ہی ہے۔ اکمل کا کبھی کبھی فون آ جاتا ہے تو میں اس سے شجاع کی خیر خیریت پوچھ لیتا ہوں۔ ایک بار اکمل نے بتایا کہ آج کل شجاع امریکی ٹیلی ویژن میڈیا پر اپنا اُردو سروس کا کوئی چینل شروع کرنے کی سکیم بنا رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد اکمل کا دوبارہ فون آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''شجاع کی ٹی وی چینل والی سکیم کا کیا بنا؟''

اکمل نے بتایا کہ اس نے چینل شروع کرنے کی سکیم کا خیال چھوڑ دیا ہے اور آج کل وہ ایئر پورٹ سے ڈی سی تک ٹیکسی کی بجائے ہیلی کاپٹر سروس شروع کرنے کی سکیم پر غور کر رہا ہے۔ اکمل کا پھر فون آیا تو میں نے شجاع کی خیریت معلوم کی۔ اکمل کہنے لگا۔ ''اس نے ٹیکسی چلانی چھوڑ دی تھی۔ نیو یارک چلا گیا ہے۔ وہاں کسی پھول بیچنے والی شاپ میں جاب کر رہا ہے۔''

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ دن کا بیشتر حصہ پھولوں کے گلدستوں کو سجاتے گزارتا ہو گا۔ کئی روز سے اکمل کا فون نہیں آیا۔ مجھے یقین ہے شجاع نے پھولوں والی

شاپ کو بھی خیر باد کہہ دیا ہوگا اور اب اپنی اِن ڈور پھولوں کی نرسری لگانے کی سکیم پر غور کر رہا ہوگا۔

دو روز پہلے میں اپنے کچھ پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے شجاع سیف کا ایک پرانا خط نکل آیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ شجاع کو سب سے مشکل کام کسی کو خط لکھنا لگتا تھا۔ یہ خط اس نے آج سے اٹھائیس سال پہلے کوہ مری سے مجھے لکھا تھا اور کوہ مری کے مشہور ریستوران سیمز ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ خط پر میرے گھر کا ایڈریس نہیں تھا، اس کی جگہ معرفت ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور لکھا تھا۔ نیلی پنسل سے لمبے لمبے شکستہ حروف میں یہ خط لکھا گیا تھا جسے میں یہاں نقل کر رہا ہوں:

''سیمز ریسٹورنٹ، مری

19 جولائی 1975ء

ڈیئر اے حمید!

اس وقت مری کے سیمز ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر گرم گرم کافی پیتے ہوئے تم بڑی شدت سے یاد آ رہے ہو اور میں یہیں سے تمہیں چند لائنیں لکھ رہا ہوں۔ ریستوران کی کھڑکیوں میں سے برسات کا گہرا بادل اندر داخل ہو رہا ہے اور سہ پہر کی دھوپ اچانک غائب ہو گئی ہے۔ میرے سامنے وہی پرانا چرچ ہے اور اس کے صحن میں لمبے لمبے گھنے درخت ہیں جن کے تنے بارش میں بھیگنے سے سیاہ پڑ گئے ہیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ برسوں پہلے تم، میں اور انور جلال یہیں آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ یہاں کی بہت سی چیزیں بدل گئی ہیں لیکن سامنے والا چرچ، یہاں کے چیڑھ کے درخت اور صنوبر کے جنگل ویسے ہی ہیں۔ کبھی موقع ملا تو پھر یہاں آئیں گے۔ لیکن شاید وہ پہلے والی بے فکری اور وہ باتیں نہ ہوں۔

تمہارا

شجاع سیف''

میری پہلے والی بے فکری وہی ہے۔ میری پہلے والی باتیں بھی وہی ہیں۔ صنوبر کے جنگل اور چیڑھ کے درخت بھی وہی ہیں۔ ٹی ہاؤس بھی وہی ہے لیکن وہ پہلے والے دوست ایک ایک کر کے جدا ہو گئے ہیں۔ انور جلال ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے۔ شجاع سے ملے ایک مدت گزر گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسے لکھوں کہ پاکستان آ کر ایک بار مل جاؤ۔ لیکن خدا کے لئے پاکستان آنے کی کوئی سکیم مت بنانا۔

⑤......⑤

عجیب مانوس اجنبی تھا

ناصر کاظمی کے گھر کے آنگن میں قنات لگی تھی۔ اس کے اندر اس کے جسد خاکی کو کفن پہنایا جا رہا تھا۔ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے قنات کی درز میں سے دیکھا۔ ناصر کاظمی تختے پر پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ تھوڑے سے نیم وا تھے اور اس کے دانتوں کی سفید لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ موت کے سیاہ بادلوں سے نئی زندگی کی کافوری صبح طلوع ہو رہی تھی۔ آنگن کی بیری پر کوئی چڑیا نہیں بول رہی تھی۔ اس کے کبوتر بھی خاموش تھے۔ ان سے پیار کرنے والا، ان سے باتیں کرنے والا موت کی وادی میں اُتر گیا تھا۔

چڑیاں، کبوتر اور دریا پر بہتی کشتیاں، ایک خیال سا تھا۔ ایک خواب سا تھا۔ ناصر کاظمی کی باتیں سنائی دے رہی تھیں مگر اس کے ہونٹ خاموش تھے۔ موت نے ان پر اپنا سرد ہاتھ رکھ دیا تھا۔

کوئی اشارہ نہ تھا، کوئی اُڑتا ہوا پھول نہ تھا۔ غزل کتاب مرگ کے تابوت میں سو رہی تھی۔ سوگوار لوگ کھجور کے پیڑ تلے خاموش بیٹھے تھے۔ پھر ناصر کاظمی کو اس کے دوست احباب لے کر چلے۔ سوئے عدم، سوئے گورِ غریباں! اسے لحد میں اتارا جا رہا تھا۔ قبر تیار ہو گئی تھی۔ اس پر گیندے، گلاب کے پھولوں کی چادر ڈالی گئی۔ پھولوں کی خوشبو قبر کے اندر تک اتر رہی تھی۔ آخری بار فاتحہ پڑھی گئی اور لوگ ناصر کاظمی کو بھول گئے۔ میں نے قبرستان سے باہر نکلتے ہوئے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ ناصر کاظمی کہیں نہ تھا۔

"چک چوں چک چک۔"

قبرستان کے آخری درخت پر چڑیا بول رہی تھی۔

اس چڑیا نے مجھے خبر دی کہ ناصر کاظمی ٹی ہاؤس میں بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

میں قبرستان سے نکل کر سیدھا ٹی ہاؤس آ گیا۔

ناصر کاظمی کونے والی میز پر ہاف سیٹ چائے آگے رکھے سگریٹ انگلیوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ اس کے بال گہرے سیاہ چمکیلے تھے۔ آنکھوں میں نوجوانی کی بھرپور چمک تھی۔ چہرے پر سانولا سا اجالا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور ذرا کھنکار کر بولا۔

''میرا نام ناصر کاظمی ہے۔ میں انبالے سے آیا ہوں۔ جہاں برسات میں آم کے جھنڈوں میں کوئل بولتی ہے۔''

پھر اس نے مجھے ایک شعر سنایا۔ اب بھول گیا ہوں۔ یہ 1947ء کا زمانہ تھا۔ ٹی ہاؤس کے فرش کی ٹائلیں ابھی چمک رہی تھیں۔ کرسیاں بید کی تھیں اور پیشانی پر باہر ابھی پاک ٹی ہاؤس کی جگہ ''انڈیا ٹی ہاؤس'' ہی لکھا تھا۔ ہندوستان سے آنے والے افسانہ نگار اور شاعر ایک دوسرے سے اپنا پہلا تعارف کروا رہے تھے۔ کچھ لوگ پیچھے سے لکھتے آئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ابھی پاکستان میں آ کر افسانے لکھنے تھے، شعر کہنے تھے۔ ناصر کاظمی شعر کہتا ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تھا اور اس کے سیاہ گھنگریالے بالوں میں ناریل کے تیل کی خوشبوئیں ہوتی تھیں۔

ہر کوئی گردشِ روزگار کا شکار تھا۔ مگر ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں شام کو ضرور ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی۔ وقت گزرنے لگا۔ اب دن کو بھی ٹی ہاؤس میں محفلیں جمنے لگیں۔

ناصر کاظمی کو پرانی انارکلی میں ایک کمرہ الاٹ ہو گیا تھا۔ وہاں بجلی نہیں تھی۔ وہ رات کو موم بتی جلا کر لکھتا پڑھتا۔ ایک پرانا سا پلنگ تھا، سرہانے کی طرف ایک میز تھی جس پر جلی ہوئی موم بتیوں کی موم جمع تھی۔ الماری کے دونوں پٹ غائب تھے۔ وہاں چند ایک گرد آلود کتابیں تھیں۔ بے ترتیبی تھی۔ بے یقینی تھی۔ کس ٹکڑے کو کس ٹکڑے

کے ساتھ جوڑیں؟ کس چراغ کو کس چراغ سے روشن کریں؟ کہاں تھے، کہاں آ گئے، اب کہاں جائیں گے؟

یہ سوال کسی ایک فرد کے سوال نہیں تھے، ایک پوری نسل ان سوالوں کا جواب تلاش کر رہی تھی۔ ٹی ہاؤس کے سامنے والا پیپل کا درخت ابھی جوان تھا۔ مارچ 1947ء میں پہلی بار اس پیڑ پر براؤن رنگ کی چمکیلی، نازک کونپلیں پھوٹتی دیکھ رہے تھے۔ ٹی ہاؤس کے دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھے ہم ان ننھی کونپلوں کو دیکھ رہے تھے۔ کسی کو فیروزپور، کسی کو ہوشیارپور، کسی کو دلی اور کسی کو امرتسر کا کمپنی باغ یاد آ رہا تھا۔

ناصر کاظمی ان کونپلوں کو دیکھ کر کچھ مسکرایا۔ کچھ اُداس ہو گیا۔ وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں انبالے کے آم کے جھنڈوں کی کوئلیں بول رہی تھیں اور پیلے کھیتوں میں بسنت کی زرد ہوا چل رہی تھی۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ کوئلیں اس کی آنکھوں میں بول رہی تھیں اور چائے اس کی پیالی میں ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

اس کی چائے اکثر ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھی۔ چائے منگوا کر وہ باتیں کرنے لگتا۔ بچوں ایسی باتیں، چڑیوں ایسی باتیں، کوئلوں ایسی باتیں۔ وہ باتیں جنہیں اب لوگ لکھتے ہیں مگر کرتا کوئی نہیں۔ ناصر کاظمی جیسے لکھتا تھا، ویسے ہی باتیں کرتا تھا۔ بولتے بولتے وہ اپنی کسی بات کو اپنے دیوان میں لکھ لیتا اور شعر بن جاتا۔ اناس، کبوتر، بہتی کشتیاں، نیلے آسمان پر زندہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی۔ باغ میں اناس کی خوشبو تھی۔ راوی اور بدھا کی لہروں پر سنہری دھوپ میں کشتیاں رواں تھیں۔ ٹی ہاؤس کے پیپل کے پیڑ پر چڑیاں بول رہی تھیں اور چائے کی گرم خوشبو تھی اور خوبصورت مسکراہٹوں والی لڑکیوں کے دمکتے چہرے تھے۔ ایک سرخ غبارہ اوپر آسمان پر جا رہا تھا۔ ایک بچہ باغ کی کیاریوں میں بھاگ رہا تھا۔ ایک تتلی لارنس باغ کے پھولوں پر اُڑ رہی تھی۔

ناصر کاظمی کا سگریٹ اس کی انگلیوں میں جلتے جلتے اپنے آخری مقام پر پہنچ گیا تھا اور وہ ابھی تک اسے پیئے جا رہا تھا۔ ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ ناصر سگریٹ ختم ہونے کے بعد بھی پیتا تھا۔ مجھے اس کی انگلیوں میں سگریٹ نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ سگریٹ پی رہا ہوتا تھا۔

''انبالے سے کچھ فاصلے پر آم کا باغ تھا۔ اس باغ میں ایک نہر بہتی تھی۔ اس کے کناروں پر گھاس اُگی تھی۔ اس گھاس میں ہرے ہرے ٹڈے گایا کرتے۔''

اور پھر جب کوئی آم اپنی ڈالی سے ٹوٹ کر اس نہر میں گرتا تو پانی میں ڈوب جاتا۔ پھر اُبھر کر سطح پر آتا اور لہروں پر تیرتا آگے گزر جاتا اور ناصر کاظمی اسے دُور تک دیکھا کرتا۔

وہ ٹی ہاؤس میں بیٹھا اس آم کو، اس نہر کو اور نہر کنارے کی گھاس میں گانے والے ہرے ہرے ٹڈوں کو دیکھتا۔ ہم سب ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر دیکھے ہوئے خواب دیکھتے، سنی ہوئی آوازیں سنتے، گزرے ہوئے راستے دیکھتے۔ جن صورتوں کو دیکھا کرتے تھے ان کو پھر سے دیکھتے۔ کبھی کوئی شکل بہت پیچھے چلی جاتی، کبھی اتنی قریب آجاتی کہ میز پر ہمارے پاس آکر بیٹھ جاتی اور اپنی پیالی میں چائے بنانے لگتی۔ اس کے سگریٹ کا دھواں ہمارے ہونٹوں کے قریب سے گزرتا۔ اس کا گرم محبت بھرا سانس ہمارے کانوں کی لوؤں کو چومتا محسوس ہوتا۔ اس کی باتوں کی مہک ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتی۔ کبھی دور اندھیروں میں چپ چاپ کھڑے یہ لوگ ہمیں دیکھا کرتے اور پھر آہستہ آہستہ ہاتھ ہلاتے انہی اندھیروں میں گم ہوتے چلے جاتے۔

ٹی ہاؤس ان دنوں بچوں کا چھوٹا سا بائیسکوپ تھا جس کے سوراخوں سے آنکھیں لگا کر ہم اپنی ماضی کی تصویریں دیکھا کرتے تھے۔ یہ قطب کی لاٹھ ہے، یہ تاج محل ہے، یہ امرتسر کا کمپنی باغ ہے، یہ مسجد خیر الدین ہے، یہ اسد جو تنددر میں قلچے لگا رہا ہے۔ یہ کا کا عمرہ سادار میں سبز چائے کی پتی ڈال رہا ہے۔ یہ کوئل ایک آم کے باغ سے اُڑ کر

دوسرے آم کے باغ کو گئی ہے۔ یہ لوکاٹ کے باغ میں سے گزرتی نہر ہے اور یہ بمبئی کو جاتی فرنٹیئر میل ہے۔ اور یہ ہمارا گھر آگ کے شعلوں میں جل رہا ہے۔ اور یہ کوچہ رنگریزاں کی مسجد میں مسلمان لڑکیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔

ابھی پھول تئے نئے شاخوں سے ٹوٹے تھے۔ ابھی زخم ہرے تھے۔ ابھی پاؤں پر موت کے سفر کی دھول جمی تھی۔ ابھی امرتسر، جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ سے آگ اور خون کے شعلوں کی لپک آتی تھی۔ ابھی اپنوں کے چہرے پہچانے جاتے تھے اور بالوں کا رنگ سیاہ تھا اور ان آنکھوں میں نئی صبح کی چمک باقی تھی۔

ٹھکانے دو ہی تھے۔ پاک ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس۔ ناصر کاظمی کافی ہاؤس میں بیٹھتا اور ٹی ہاؤس میں بھی۔ اس کے دوست دونوں جگہوں پر اس کا انتظار کیا کرتے۔ کافی ہاؤس میں وہ ریاض قادر کے ساتھ کافی پیتا اور ہمارے ساتھ ٹی ہاؤس میں چائے کی مہک میں کھو جاتا۔ تیز چونے والا پان کھاتے ہی لالی اس کے ہونٹوں پر کھل جاتی۔ اس کے سفید، مضبوط اور ہموار دانت ابھی زیادہ پان کھانے سے خراب نہیں ہوئے تھے۔ گیارہ بارہ بجے ٹی ہاؤس بند ہوتا تو ناصر اپنے کسی ہم نفس کے ساتھ آوارہ گردی کرنے نکل کھڑا ہوتا۔ ریلوے سٹیشن پر جا کر چائے پیتا۔

لاہور کی سنسان سڑکیں سید عابد علی عابد کے دم قدم سے، دیال سنگھ کالج کی فضائیں ادبی محفلوں سے گرم تھیں۔ مہینے میں ایک بار کالج کے ہال میں مشاعرہ ہوتا اور بعد میں رات کے کھانے کا بھی اہتمام کیا جاتا۔

عابد صاحب نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے اور رہنمائی بھی۔ ناصر کاظمی سے بھی پیار کرتے تھے لیکن وہ ہر کسی کو شعر نہیں سناتا تھا۔ تازہ غزل لکھتا تو اپنے کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کے دوستوں کو سب سے پہلے سناتا۔ شروع شروع میں وہ مشاعروں میں ترنم سے کلام سنایا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ تحت اللفظ پڑھنے لگا۔

اس کی آواز بھاری، باوقار اور پُر اثر تھی۔ اس کا پڑھنے کا انداز اپنا تھا۔ دوستوں

میں پڑھتے وقت وہ ساتھ ساتھ مسکراتا جاتا۔ پھر اپنے ہی کسی مصرعے پر اس کا چہرہ تمتما اٹھتا اور وہ پیچھے کی طرف بالوں میں بار بار انگلیاں پھیرنی شروع کر دیتا۔

ناصر کاظمی کان کے اوپر اکثر سر کو کھجاتا رہتا۔ اس کے سر میں خشکی بھی تھی مگر اس طرح سے وہ اپنے آپ میں محو بھی ہو جاتا۔ لباس کے معاملے میں وہ بے نیاز تھا۔ کوئی پتلون کوٹ اسے پورا نہ آتا تھا۔ پتلون میں بیشتر اوقات بیٹی کی جگہ نکٹائی ہوتی۔ ٹائی کی ناٹ بڑی باریک باندھا کرتا اور وہ بھی بے دھیانی سے۔

سردیوں کے لئے اس کے پاس ایک نیلے رنگ کا اوور کوٹ تھا جو ایک عرصے تک اس کے ساتھ رہا۔ سگریٹ بہت کم ماچس سے سلگاتا۔ بس سگریٹ کے ساتھ ہی سگریٹ سلگا لیتا۔ اس کی انگلیوں پر جلنے کے نسواری نشان پڑے ہوئے تھے۔ سگریٹ تمباکو کی آخری پتی تک اس کی انگلیوں میں سلگتا رہتا۔

جتنے پیسے جیب میں ہوتے، دوستوں کو چائے پلا دیتا۔ روپے پیسے نہ اسے گننا آتے تھے اور نہ جیب میں رکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ شادی کے بعد بھابی نے اسے سنبھال لیا تھا اور اس کی زندگی باقاعدہ ہو گئی تھی۔ اس کے لباس میں اب کلر میچنگ نظر آنے لگی تھی۔

وہ ٹھیک وقت پر گھر سے ناشتہ کر کے چلتا اور پھر رات کو جلدی گھر چلا جاتا۔ ان دنوں اس کی صحت بڑی اچھی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بڑا خوش تھا اور کرشن نگر والے مکان میں رہتا تھا۔ اسے مکان کا ایک درخت اور انگور کی بیل بڑی پسند تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ یہ مکان آدھا کسی دوسرے کو الاٹ ہو گیا اور ناصر کاظمی کا محبوب درخت دوسرے صاحب کے حصے میں چلا گیا۔ ناصر کاظمی کو اس درخت سے بچھڑنے کا بڑا صدمہ تھا۔ ایک روز ٹی ہاؤس میں مجھے کہنے لگا۔

"گھر سے چلتے وقت میں اس درخت کو ضرور دیکھتا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھتا ہے۔
ہم دوست ہیں، الگ ہو گئے ہیں تو کیا ہوا، ہم ایک دوسرے کے پاس تو رہتے ہیں۔
میرے کبوتر کبھی کبھی اس درخت پر میرا پیغامِ الفت مجھے لا کر سناتے ہیں۔"

اس گھر میں جو انگور کی بیل ہے وہ بھی ناصر کاظمی کو بڑا ہانٹ کرتی تھی۔

''میں اس کے نیچے سے ہو کر گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ سبحان اللہ انگور کی بیل کے نیچے سے گزر کر گھر میں جانا کس قدر خوبصورت بات ہے۔ میرے بچے اس بیل کے سائے میں کھیلتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ انگور کی خوشبو ان کے ذہنوں کی نشوونما کر رہی ہے۔''

⊚......⊚

میں ملک سے باہر جانے لگا تو اس خیال سے کہ مجھے کافی وقت پاکستان سے اور خاص طور پر اپنے پنجاب سے باہر رہنا ہے، میں نے کچھ پنجابی لوک گیت ریکارڈ کرا کر ان کی ٹیپیں ساتھ رکھ لیں۔ ان میں خواجہ غلام فریدؒ کی ایک کافی بھی ریکارڈ کروا لی۔

پچھلے دنوں امتیاز علی سے ملاقات ہوئی تو میں نے سرسری طور پر اس سے ان بھائیوں کی گائی ہوئی کافی کا ذکر کیا تو اس نے بڑے افسوس کے ساتھ بتایا کہ خواجہ فریدؒ کی وہ کافی ریڈیو والوں نے ای ریز کر دی ہے۔ یعنی ٹیپ پر سے کافی اُڑا دی ہے۔

مجھے بھی اس کا بڑا افسوس ہوا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ کافی ریکارڈ کی ہوئی میرے پاس موجود ہے، تمہیں جب بھی اس کی ضرورت پڑے مجھ سے لے لینا۔ بے چارہ آرٹسٹ اتنے میں ہی خوش ہو گیا۔ فرصت کے وقت جب بھی میں یہ کافی لگا کر سنتا ہوں تو اس میں لے اور تال کے ساتھ بجائی ہوئی شکور بیدل کی چمٹی کی آواز سن کر وہ بہت یاد آتا ہے۔

جانے والے چلے جاتے ہیں، پیچھے ان کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یادیں ان سے بڑھ کر عزیز ہو جاتی ہیں جن کی یہ یادیں ہوتی ہیں۔

ٹی ہاؤس کا ایک روشن اور خوش نما چہرہ نواز کا بھی تھا۔ نواز نے شروع شروع میں اُردو میں دو ایک کہانیاں لکھیں، پھر وہ اُردو کو چھوڑ کر پنجابی میں لکھنے لگا۔ پنجابی میں اس

نے ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھے اور ایک ناول بھی لکھا۔ پنجابی کے ریڈیائی ڈراموں میں ان کا ڈرامہ ''شام رنگی کڑی'' بہت مشہور ہوا۔ ایک بار میرے دوست محمد صفدر زیدو نے ترنگ میں آ کر مجھے کہا تھا۔

''اے حمید! تم پنجابی کے غدار ہو۔''

میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔

''تم پنجابی ہو کر اُردو لکھتے ہو۔''

میں نے بھی ترنگ میں آ کر اُسے جواب دیا تھا۔

''صفدر! میرا کوئی افسانہ اٹھا کر کسی اہل زبان کو تھوڑا سا پڑھ کر سناؤ۔ اگر وہ یہ کہہ دے کہ یہ اُردو زبان میں لکھا گیا ہے تو میں پنجابی لکھنا شروع کر دوں گا۔''

میں تو اُردو میں پنجابی لکھتا تھا۔ لیکن نواز اس کے الٹ کرتا تھا۔ وہ پنجابی میں اُردو لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یعنی وہ سوچتا اُردو میں تھا اور پھر اس کی پنجابی بنا کر لکھ دیتا تھا۔ چونکہ مجھے وہ اپنا استاد کہا کرتا تھا، اس لئے ایک بار میں نے اُسے ایسا کرنے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ تم اُردو اور پنجابی دونوں کے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔ لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا اور میری اس کی دوستی 1947ء سے شروع ہوگئی تھی جب ہم دونوں گوالمنڈی میں رہتے تھے۔ گوالمنڈی میں ہی امرتسر سے ہجرت کرنے کے بعد حسن طارق (فلم ڈائریکٹر) کے والد صاحب اور بھائیوں نے بھی مکان الاٹ کروالیا تھا۔ ہم تینوں گوالمنڈی چوک کے ایک ہوٹل میں بیٹھا کرتے تھے۔

حسن طارق بھی مجھ سے عمر میں چھوٹا تھا۔ یہ دونوں میرے اسلوب نگارش سے متاثر تھے اور شروع شروع میں نواز کی طرح حسن طارق نے بھی میرے سٹائل میں افسانہ لکھنے کی کوشش کی تھی۔

گوالمنڈی سے اٹھ کر ہم تینوں میو ہسپتال سے نکل کر پاک ٹی ہاؤس چلے جاتے تھے۔ حسن طارق بھی ٹی ہاؤس کا جانا پہچانا چہرہ تھا اور تقریباً ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے

سبھی شاعروں، ادیبوں سے اس کی دوستی تھی۔ حسن طارق بہت ذہین تھا اور اس کی حسِ ظرافت بہت تیز تھی۔ اس کا باتیں کرنے کا انداز بھی بے حد دلچسپ اور بے ساختہ تھا۔ اس کا لب و لہجہ خالص امرتسریوں والا تھا۔

اس کے والد صاحب خالص امرتسری کشمیری تھے۔ کڑاکے دار آواز، آتش مزاج اور جلد غصے میں آ جانے والے تھے۔ سبز چائے کے علاوہ وہ امرتسری کشمیری قہوے کے عاشق تھے۔ امرتسر سے ہجرت کر کے آنے کے بعد وہ خالص کشمیری قہوہ جس کا رنگ موتیئے کے پھول ایسا بلکہ خالص سونے کی طرح زردی مائل ہوتا تھا اور جس میں ہماری والدہ آپو جی کھنڈ قلچہ ڈال کر پیا کرتی تھیں، میں نے حسن صارق کے والد صاحب کے پاس بیٹھ کر ہی پیا تھا۔

حسن طارق نے میرے اور نواز کے ساتھ چلتے چلتے ٹریک یعنی لائن بدل لی اور فلمی دنیا میں داخل ہو گیا۔ لیکن نواز کا ساتھ آخر دم تک میرے ساتھ رہا۔ میرے ساتھ دوستی نبھانے میں نواز کے ایثار اور حوصلہ مندی کا زیادہ عمل دخل تھا۔ ورنہ میں اس لائق نہیں تھا کہ نواز جیسے بلند کردار، ایثار پیشہ دوست کے ساتھ دو قدم بھی چل سکتا۔ اس کا اصل نام کرم نواز تھا۔ کچھ عرصہ وہ کرم نواز ہی رہا۔ میں اسے ہمیشہ اس کے پورے نام سے بلایا کرتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس نے اپنے نام کے ساتھ لگا ہوا کرم اتار دیا اور اپنا نام صرف نواز لکھنے لگا۔

میں نے اپنے سب دوستوں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کوئی اسے کرم نواز کے نام سے نہ پکارے۔ لیکن میں اسے کرم نواز ہی کہا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے کرم نواز کہنے کا حق صرف اے حمید ہی کو ہے اور کسی کو نہیں۔ یہ بھی نواز کی فراخ دلی اور اس کے اعلیٰ کردار کی دلیل تھی۔

نواز کا جسم اس کے دراز قد کے ساتھ انتہائی موزوں تھا۔ اس کو ہر لباس بڑا سجتا تھا۔ چہرے پر مردانہ وجاہت تھی اور سفید ہموار دانت چمکا کرتے تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی میری طرح کلر میچنگ اور کمبی نیشن کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ سردیوں

گرمیوں میری طرح وہ بھی کوٹ پتلون ہی پہنتا تھا۔ وہ انگلش سوٹ بھی پہن لیتا تھا جو میں کبھی کبھار ہی پہنتا تھا۔

انور جلال سے بھی اس کی بڑی دوستی تھی۔ بلکہ انور جلال اسے مجھ سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔ نواز کا کردار ہی ایسا تھا کہ ہر کوئی اس کا گردیدہ ہو جاتا تھا۔ میرے اکثر دوست اسے مجھ سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میرے دوستوں کو میرے کردار میں وہ خوبیاں کہیں دکھائی نہیں دیتی تھیں جو نواز کے اندر پوری آب و تاب سے موجود تھیں۔

اس معاملے میں، میں نے اس سے کبھی حسد نہیں کیا تھا بلکہ مجھے خوشی ہوتی تھی کہ میرے دوستوں نے نواز کی شخصی خوبیوں کو پہچانا ہے۔ میرے لئے تو اتنا ہی بہت تھا اور بہت ہے کہ میرے دوست میرے عیب نہیں دیکھتے، میری کوتاہیوں اور خامیوں سے درگزر کرتے ہیں بلکہ انہیں معاف کر دیتے ہیں اور مجھ سے ہنس کر ملتے ہیں اور مجھ سے ایثار بھی کرتے ہیں۔ اور نواز تو مجھ سے محبت کی حد تک دوستی کرتا تھا۔ مجھے کسی بات پر پریشان دیکھ کر مجھ سے زیادہ پریشان ہو جاتا تھا۔

ٹی ہاؤس سے ہم اگر رات کے گیارہ بجے بھی اٹھتے تو میں اسے اپنے مطلب کے لئے کہ میں گھر تک اکیلا نہ جاؤں، نواز کو اپنے ساتھ ٹی ہاؤس سے مصری شاہ تک پیدل چلاتا تھا اور وہ ہنسی خوشی میرے ساتھ چلتا چلا جاتا تھا۔

دنیاوی معاملات کی اسے کافی سوجھ بوجھ تھی اور تعلقات نبھانے میں وہ بے حد احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اگر کوئی ایسا وقت آ جاتا تو نواز خود تکلیف اٹھا لیتا تھا مگر اپنی عزتِ نفس پر آنچ نہیں آنے دیتا تھا۔

مزاج اس کا بھی پورا امرتسریوں کا تھا۔ کبھی بڑی سے بڑی بات پر درگزر کر جاتا تھا اور کسی وقت ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا اور لڑنے مرنے پر اتر آتا تھا۔ لیکن میرے سامنے کبھی اونچی آواز میں نہیں بولتا تھا۔

اس کی ابھی مرنے کی عمر کہاں تھی؟ اچھا بھلا تھا۔ اچانک سانس کے عارضے میں

مبتلا ہو گیا اور ہسپتال پہنچ گیا۔ میں اس کا حال معلوم کرنے ہسپتال گیا تو وہ بستر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ شیو ذرا سی بڑھی ہوئی تھی لیکن چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ کہنے لگا۔

''ذرا سی سانس کی تکلیف ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر بڑا خیال رکھ رہے ہیں۔ کل پرسوں تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

نواز کے دوست ڈاکٹر واقعی اس کی بڑی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اس کے تین ڈاکٹر دوست امریکہ میں آباد تھے۔ انہوں نے وہاں سے اس کے لئے دوائیاں بھیج دیں اور برابر دوائیاں بھیجتے رہے۔ لیکن جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔ ایک روز خبر ملی کہ نواز اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔

اس کے انتقال سے دو تین روز پہلے میں اس کی خیر خیریت معلوم کرنے اس کے نئے گھر پر گیا۔ حسب معمول وہ شکل وصورت سے صحت مند دکھائی دیتا تھا۔ چہرے پر بھی بیماری یا پریشانی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ذرا سی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کمرے میں قالین پر ہی بیٹھ گئے۔ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اپنے امریکہ والے مخلص ڈاکٹر دوستوں کا ذکر کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''وہ تمام دوائیاں وہیں سے بھیج دیتے ہیں۔ یہاں بھی ڈاکٹر میرا بڑا خیال رکھ رہے ہیں۔''

باتیں کرتے کرتے اسے سانس ضرور چڑھ جاتا تھا۔ نواز تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا۔ سانس درست کر کے پھر باتیں کرنے لگتا۔ باتیں بھی بالکل روزمرہ کی طرح کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیماری سے پریشان ہے یا خوفزدہ ہے۔

میں کافی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ میں واپس جانے کے لئے اٹھا تو وہ سیڑھیوں تک میرے ساتھ آیا۔ مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں اس سے رخصت ہونے لگوں اور وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آیا ہو۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ مجھے

رخصت کرنے سیڑھیوں تک آیا۔ مجھے اس کا اٹھ کر سیڑھیوں تک آ کر مجھے رخصت کرنا اچھا نہ لگا۔

مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ مجھے رخصت نہیں کر رہا بلکہ میں اسے رخصت کر رہا ہوں۔

OOO

شہرت بخاری، قیوم نظر، مبارک احمد، یوسف ظفر۔ ان شعراء کا تعلق اس گروہ سے تھا جو مشہور تجریدی شاعری کرنے والے شاعر میرا جی کے مداحین کا گروپ تھا۔ اس گروہ نے ہی لاہور میں میرا جی کی سرکردگی میں حلقہ اربابِ ذوق کی بنیاد رکھی تھی۔ میرا جی اپنی عجیب و غریب ہیئت کذائی اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والی اپنی تجریدی شاعری کی وجہ سے اس زمانے میں بڑے مشہور تھے۔ میں نے میرا جی کو صرف ایک مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ یہ میری آوارہ گردی کا زمانہ تھا۔ سن شاید 1941ء کا تھا۔ ان دنوں شاعر ن۔م راشد صاحب آل انڈیا ریڈیو دِلّی میں بطور ڈائریکٹر پروگرامز تعینات تھے۔ بھائی جان کے وہ دوست تھے اور میں ان کے ساتھ کبھی اکیلا ہی راشد صاحب سے ملنے اور زیادہ اس خیال سے کہ آل انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیوز کی سیر کروں گا، وہاں چلا جایا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آل انڈیا ریڈیو دِلّی سے اُردو کے نامور ادیب اور شاعر منسلک تھے۔ ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، میرا جی، راجہ مہدی علی خان اور شاید راجندر سنگھ بیدی اور اختر الایمان بھی شامل تھے۔

آل انڈیا ریڈیو دِلّی کے سٹوڈیوز علی روڈ پر واقع تھے۔ میں ایک دن راشد صاحب کے کمرے سے نکل کر حسبِ عادت اِدھر اُدھر چکر لگانے لگا۔ ریڈیو کی کینٹین میں گیا۔ وہاں ایس ایس ماتھر کو دیکھا جو ریڈیائی ڈراموں میں اپنی آواز اور ادائیگی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ پنڈت ہری چند چڈھا کو دیکھا جنہیں میں باری صاحب کے ساتھ ایک مرتبہ پہلے بھی لاہور میں دیکھ چکا تھا۔ کینٹین کے باہر دھریک کے درخت کی چھاؤں میں ایک میز پر تان پورہ رکھے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا جے پوری سائل کی

پگڑی باندھے معمر آدمی بیٹھا چائے کپ میں سے پرچ میں ڈال کر پی رہا تھا۔ کسی نے بتایا کہ یہ گوالیار گھرانے کے بڑے مشہور کلاسیکل گائیک ہیں۔ افسوس میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔

پھرتے پھراتے میں سٹوڈیوز کی طرف آ گیا۔ کسی سٹوڈیو میں ڈرامے وغیرہ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ کسی سٹوڈیو میں گانے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ میں نے ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا کہ ایک ڈبلا پتلا آدمی گرم کوٹ، گرم پتلون میں ملبوس کرسی پہ پاؤں رکھے میز پر بیٹھا ہے۔ اس نے لال رنگ کی میلی سی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اس شخص نے مئی جون کے مہینے میں گرم سوٹ پہن رکھا ہے، اس کو گرمی نہیں لگتی۔ یہ شخص اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے دیوار کی طرف گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے راشد صاحب کے کمرے میں واپس جا کر جب ان سے اس عجیب و غریب شخص کا ذکر کیا تو راشد صاحب نے ہنس کر کہا۔

''تم اسے نہیں جانتے پہلوان؟''

راشد صاحب مجھے پتہ نہیں کیوں پہلوان کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ وہ شخص مشہور شاعر میرا جی تھا۔ اس کے بعد میں نے میرا جی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔

ذکر میں ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے میرا جی کے مداحین شعراء کا کر رہا تھا۔ میرا جی کے بارے میں گوپال متل نے ایک بڑی دلچسپ بات اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک تو میرا جی نے اپنی ہیئت کذائی ہی مجنونانہ بنا رکھی تھی۔ اس پر نظمیں وہ ایسی لکھتے تھے جو صرف چند ایک لوگوں کی سمجھ میں ہی آ سکتی تھیں۔ کسی ایڈیٹر کو نظم بھیجتے وقت ساتھ جو خط لکھتے تھے اس خط پر یہ ضرور لکھ دیتے تھے کہ یہ خط ہے، نظم نہیں ہے۔''

میرا جی کے مداحین شعرا ویسے تو شاعری میں کہیں کہیں میرا جی کا تتبع کرتے نظر آتے تھے لیکن ہیئت گذائی کے معاملے میں وہ میرا جی کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ ان شعراء میں سے کوئی بھی گرمیوں میں گرم کپڑے نہیں پہنتا تھا اور کوئی ایسی خلاف وضع حرکت نہیں کرتا تھا جس سے یہ ثابت ہو کہ وہ میرا جی کا شاگرد ہے۔ مثال کے طور پر قیوم نظر، یوسف ظفر، شہرت بخاری وغیرہ بڑی صاف ستھری شاعری کرتے تھے اور ان کی شاعری سب کی سمجھ میں آ جاتی تھی۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے چہروں میں ایک چہرہ شاعر مبارک احمد کا بھی تھا جو میرا جی کی طرز پر تجریدی نظمیں لکھتے تھے۔ اپنی نظم سنانے کے بعد مبارک احمد کو تشریح کرنی پڑتی تھی کہ اس نظم کا مطلب کیا ہے۔ لیکن اپنی وضع قطع سے مبارک احمد بھی کسی طور پر میرا جی کا شاگرد نہیں لگتا تھا۔ قد درمیانہ اور رنگت گوری چٹی تھی۔

تقریباً روزانہ شام کو مبارک احمد ٹی ہاؤس میں قیوم نظر، شہرت بخاری اور انجم رومانی وغیرہ کی منڈلی میں موجود ہوتا تھا۔ ظاہر ہے مبارک احمد سے میرا روز کا ملنا جلنا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے اپنی کوئی نظم سناتا تو میں اس انتظار میں رہتا کہ اس کی نظم کب ختم ہو گی۔ ایک بار مجھے یاد ہے اس نے مجھے ایک نظم سنانی شروع کی تو پھر اس کی تشریح کرنے لگا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کی نظم کب ختم ہوئی تھی اور اس کی گفتگو کب شروع ہوئی تھی۔

مجھے میرا جی کی نظمیں پسند نہیں تھیں۔ ان کو پڑھنے سے مجھے ایک طرح کی REPULSION محسوس ہوتی تھی۔ لہٰذا مجھے میرا جی کے گیت بہت پسند تھے اور آج بھی پسند ہیں۔ لیکن جب میں نے میرا جی کے ان مضامین کو پڑھا جو انہوں نے ''مشرق و مغرب کے نغمے'' کے عنوان سے قدیم ہندی اور کچھ یورپی شاعروں ادیبوں پر لکھے تھے تو میں حیران رہ گیا۔ حیران اس بات پر زیادہ ہوا کہ اس قدر الجھی ہوئی شخصیت کے شاعر نے اتنی سلجھی ہوئی تحریر کیسے لکھ دی۔ میرا جی کی یہ کتاب اردو ادب کا بلاشبہ ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ میرا جی کا ایک ہی شاگرد خاص مبارک احمد تھا جس کا مسکراتا

ہوا سرخ و سپید چہرہ ٹی ہاؤس کے ان درخشاں دنوں کی زینت ہوا کرتا تھا۔ اب یہ چہرہ بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

ان دنوں ٹی ہاؤس میں دو یورپی چہرے بھی اکثر دیکھنے میں آتے تھے۔ ایک جرمن بوڑھا تھا جو اکثر سہ پہر کے وقت ٹی ہاؤس آتا، پائپ سلگا کر ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیتا اور کونے والی ٹیبل پر خاموشی سے بیٹھ جاتا۔ میں نے اسے کبھی کسی سے بات چیت کرتے نہیں دیکھا تھا۔ سہ پہر کو آتا، ہاف سیٹ چائے منگوا کر خاموشی سے چائے پینے لگتا۔ بغیر ضرورت کبھی کسی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ چائے کے دونوں پیالے بڑی توجہ اور شوق سے پیتا پھر پائپ سلگا لیتا اور ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے ٹی ہاؤس کے باہر سڑک کی طرف دیکھتا رہتا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد بیرے کو اشارہ کر کے بل منگواتا، بل ادا کرتا اور خاموشی سے آہستہ آہستہ چل کر ٹی ہاؤس سے باہر نکل جاتا۔ باہر فٹ پاتھ پر پائپ منہ میں دبائے چند لمحے رک کر ٹریفک کو تکتا رہتا، پھر سڑک کراس کر کے دوسری طرف نکل جاتا۔

دوسرا یورپی چہرہ ایک درمیانی عمر کے مضبوط جسم والے انگریز کا تھا جس کے بارے میں سب کو علم تھا کہ وہ چمڑے کا کاروبار کرتا ہے اور اس کاروبار کے سلسلے میں انگلینڈ کی کسی فرم کی جانب سے لاہور میں متعین ہے۔ ایک بار میں نے اسے گرمیوں کی دوپہر میں اکبری منڈی میں بھی دیکھا تھا۔ اس کا سرخ چہرہ پسینے میں شرابور تھا اور وہ ایک گڈے پر خشک کھالیں لدوا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ قوم کس قدر محنتی ہے اور یہ شخص اس تپش اور گرم لو میں کس جانفشانی سے کام کر رہا ہے جبکہ یہ گرمی کا عادی نہیں ہے اور سرد ملک کا رہنے والا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد یہ دونوں یورپی چہرے بھی ٹی ہاؤس کے آسمان سے غائب ہو گئے۔ البتہ کبھی کبھار ہپی ٹائپ کے سیاح ضرور ٹی ہاؤس میں آ کر چائے پینے کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب اپنی دو خصوصیات کی وجہ سے ٹی ہاؤس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک تو ٹی ہاؤس کی چائے بڑی عمدہ کوالٹی کی بلینڈ کی

ہوئی ہوتی تھی۔ دوسری وجۂ شہرت یہ تھی کہ اس ریسٹورنٹ میں لاہور کے ادیب شاعر اور پینٹر بیٹھتے تھے۔ ٹی ہاؤس کی ادیبوں کا ٹی ہاؤس ہونے کی شہرت ملک سے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔

باہر سے ادیبوں کا کوئی وفد آتا تو وہ ٹی ہاؤس ضرور آتا۔ کئی لوگ مجھے فون کر کے پوچھتے کہ ادیب اور شاعر ٹی ہاؤس میں کس وقت بیٹھتے ہیں اور یہ ٹی ہاؤس مال روڈ پر کس جگہ پر واقع ہے۔ ہڑپہ، ساہیوال سے تو ایک صاحب نے کاغذ پر رسید کے طور پر مندرجہ ذیل عبارت لکھ کر مجھے پوسٹ کر دی کہ ہم نے پاک ٹی ہاؤس میں چائے پی کر تمہارا قرض اور اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ ایک اعزاز جو آج مل گیا، حسرت پوری ہو گئی۔

اتوار کے اتوار تو تقریباً میرے سبھی ترقی پسند دوست اور بزرگ ٹی ہاؤس میں موجود ہوتے۔ کیونکہ اس روز شام کو وائی ایم سی اے ہال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ادبی اجلاس منعقد ہوتا تھا۔ اس روز ٹی ہاؤس کی رونق اور چمک دمک دیکھنے والی ہوتی تھی۔ لیکن باقی کے دنوں میں بھی میرے ترقی پسند ادیب، شاعر اور نقاد دوست آتے جاتے رہتے تھے۔ ان میں احمد راہی، حمید اختر، ابنِ انشاء اور ابراہیم جلیس نمایاں تھے۔ کسی روز ایسا ہوتا کہ میں ابنِ انشاء کے ہاں پہنچ جاتا اور ہم دونوں ٹی ہاؤس آ جاتے۔ ابنِ انشا کا چینی پیگوڑا ٹائپ کا کاٹیج نما مکان ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے سامنے تھا۔ یہ مکان انہوں نے لدھیانہ سے ہجرت کر کے آنے کے بعد الاٹ کروایا تھا۔

پہلے میری اور احمد راہی کی جوڑی ہوتی تھی۔ احمد راہی کی فلمی مصروفیات بڑھ گئیں تو میری ابنِ انشاء کے ساتھ جوڑی بن گئی۔ ابنِ انشاء کے ساتھ سن 47ء ہی سے میری بڑی پکی دوستی ہو گئی تھی۔

ہمارے مزاج بہت ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ ہم دونوں لاہور کے قدیم اور پراسرار گلی کوچوں کی سیر کو نکل جایا کرتے تھے۔ اسے بھی میری طرح لاہور کے گلی

کوچوں میں ایک طلسمی اسرار محسوس ہوتا تھا۔ جبکہ دوسرا کوئی ترقی پسند ادیب یا شاعر میرے ساتھ اندرونِ شہر کی آوارہ گردی پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ احمد راہی میرا اسکول کے زمانے کا دوست تھا لیکن اسے بھی لاہور کے پراسرار طلسمی کیفیت رکھنے والے گلی کوچوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

◎......◎

۴

اس شہر میں ایک گلی تھی۔

اس گلی میں ایک درخت تھا۔ دھریک کا درخت۔ اس درخت پر بہار میں کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں کے گچھے نکلتے تو ان کی خوشبو ساری گلی میں، ہمارے سارے گھر میں پھیلی رہتی۔ منہ اندھیرے میں صبح کی سیر کو گھر سے نکلتا تو ان پھولوں کی خوشبو کھیتوں تک میرے ساتھ آتی۔ پھر یہ خوشبو مجھے سبز کھیتوں کی شبنمی مہک کے حوالے کر کے واپس چلی جاتی۔

پچھلے پہر کے ٹمٹماتے ستاروں کی نیلی روشنی میں دور تک پھیلے ہوئے کھیت دھندلے دکھائی دیتے۔ ان کھیتوں میں سے ہوتا ہوا ایک ویران کچا راستہ سچے گلاب کے کھیت اور ناشپاتیوں کے باغ اور اس سے آگے صوفی شاعر شاہ حسینؒ کے مزار کی طرف جاتا تھا۔

سچے گلابوں کے کھیت کے گرد خاردار تاروں والی دیوار کھنچی تھی۔ مگر گلاب کے پھولوں نے مجھے اپنے پاس آنے کا ایک راستہ دکھا دیا تھا۔ منہ اندھیرے سچے گلاب کے شبنم میں شرابور پھول خوابوں میں دیکھی ہوئی شہزادیوں کے چہروں کی طرح لگتے۔ اندلس کے گلاب ...... بابل و نینوا کی شہزادیاں جن کے سرخ ریشمی ملبوس وادی ایمن کے عطر کی خوشبوؤں میں بسے ہوتے۔ سچے گلابوں کے اس کھیت کے سارے بوٹے میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے مل کر خوش ہوتے اور میں اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے

ان سے رخصت ہوتا۔

مارچ اپریل میں ناشپاتی کے درختوں پر بھی پھول آتے ہیں۔ سفید سفید پنکھڑیوں والے یہ پھول چھوٹے چھوٹے گلدستوں کی شکل میں کھلتے۔ ناشپاتی کی ٹہنیاں اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتیں اور ہر ٹہنی پر کتنے ہی سفید شگوفے کھلے ہوئے ہوتے۔ منہ اندھیرے کے نیم روشن دھندلکے میں مجھے یوں لگتا جیسے شاخوں نے ہاتھوں میں پھولوں سے بھرے ہوئے پیالے تھام رکھے ہیں۔ اس باغ کو قریبی گلاب کے کھیتوں سے آنے والی مہک نے اپنی ریشمی آغوش میں لے رکھا ہوتا تھا۔ میں کچے راستے پر سیر کرتے ذرا آگے جاتا، صبح کی تازہ شبنمی ہوا میں شاہ حسینؒ کے مزار سے آنے والی اگربتیوں کی خوشبو کی لہریں مجھے چھوتی ہوئی گزر جاتیں۔ پھر مشرقی آسمان پر سورج نکلنے سے پہلے کا پھیکا نیلا غبار سا اُبھرنے لگتا۔

ایسی ہی ایک صبح میں اپنی گلی کی طرف، اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اندھیرے میں مکانوں کے خاکے اور کھیتوں میں اُگی ہوئی فصل کے خاکے ابھرنے لگے۔ ہماری گلی کے شروع میں کونے والے دومنزلہ مکان کی بیٹھک میں سے حاجی صاحب کی تلاوت کلام پاک کی آواز آ رہی ہے۔ سامنے والے مکان میں نلکے کی ٹونٹی کھلی ہے۔ پانی بالٹی میں گر رہا ہے۔ آسمان کو طلوع ہوتے سورج کی اولین سنہری کرنوں نے روشن کر دیا۔ گلی بھی روشن ہو گئی ہے۔ ہمارے گھر کے باہر والے دھریک کے درخت کی اوپر والی شاخیں سورج کی سنہری کرنوں میں روشن ہو گئی ہیں۔

میں گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ میری بہنیں اور بھائی فرش دھو رہے ہیں۔ چھوٹے سے کچن میں والدہ نے چائے دم کرنے کے لئے رکھ دی ہے۔ میں اپنے ساتھ گلاب کے پھول لایا ہوں۔ بیٹھک میں ایک بہن صفائی کر رہی ہے۔ میرے ہاتھ میں گلدستہ دیکھ کر وہ مسکراتی ہے اور شیشے کے گلدان میں تازہ پانی ڈالنے کے بعد اسے کارنس پر سجا دیتی ہے۔

دھریک کے درخت میں چڑیاں شور مچا رہی ہیں۔ درخت کے کاسنی پھولوں کو

پریشان کر رہی ہیں۔ گھر میں انگور کی ایک بیل نے آدھے آنگن پر چھت سی ڈال رکھی ہے۔ دادا جان انگور کی بیل کے نیچے بوریا بچھا کر بیٹھ گئے ہیں اور بڑے شوق سے چائے کا انتظار کر رہے ہیں۔ انگور کی شاخیں چوڑے سبز پتوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس میں زمرد جیسے رنگ کے انگوروں کے سب گچھے لٹک رہے ہیں۔ جب یہ انگور پک جاتے ہیں تو والدہ انہیں پرات میں پانی سے دھوتی ہیں اور پھر رکابیوں میں ڈال کر یہ انگور محلے میں بانٹے جاتے ہیں۔

باورچی خانے میں سے والدہ کی آواز آتی ہے۔ وہ چھوٹی بہن کو کہہ رہی ہیں کہ چائے دم ہوگئی ہے، ساوار لے جاؤ۔

یہ سبز کشمیری چائے ہے۔ آنگن میں لکڑی کا تخت بچھا ہے۔ ساوار تخت پر لا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ دادا جان ساوار میں سے نکلتی چائے کی بھاپ کو دیکھ کر بڑے خوش ہو رہے ہیں۔ بھائی تندور سے کلچے لے آیا ہے۔ تخت پر سبز پھولوں والی جاپانی پیالیاں رکھی جا رہی ہیں۔ ایک کلچہ دادا جان کے ہاتھ میں ہے۔ چڑیاں انگور کی شاخوں سے اتر کر صحن میں آ گئی ہیں اور دادا جان کی طرف گردنیں ہلا ہلا کر تک رہی ہیں۔ دادا جان ان کی طرف مسکرا کر کہتے ہیں۔

''آ گئی ہو بھئی چڑیو!''

اور وہ کلچہ توڑ کر اس کے بورے بنا کر چڑیوں کو ڈالتے ہیں۔ بڑی بہن دھریک کے پھولوں کا گچھا توڑ کر لے آئی ہے۔ اس نے یہ کاسنی پھول پلیٹ میں ڈال کر ساوار کے پاس رکھ دیئے ہیں۔ سب بہن بھائی تخت پوش پر بیٹھ گئے ہیں۔

والدہ ساوار میں سے چائے پیالیوں میں انڈیل رہی ہیں۔ پہلی پیالی دادا جان کو دی جاتی ہے۔ دادا جان بڑے مسرور ہیں۔ دونوں ہاتھ سفید داڑھی پر پھیرتے ہیں، چائے کی گرم پیالی کو اپنے بائیں ہاتھ کی صرف تین انگلیوں سے اس طرح تھام لیتے ہیں کہ پیالے کی گرمی زیادہ محسوس نہ ہو۔ پہلا گھونٹ بھر کر وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

"سبحان اللہ۔"

پھر وہ پیالی اپنے سامنے بوریئے پر رکھ دیتے ہیں۔ اس میں کلچہ توڑ توڑ کر ڈبوتے ہیں۔ تین چوتھائی کلچہ وہ پہلے ہی چڑیوں کو ڈال چکے ہیں۔ پیالی ایک بار پھر بائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں تھام لیتے ہیں اور چمچے سے چائے میں ڈبویا ہوا کلچہ مزے سے کھانے لگتے ہیں۔ بیچ بیچ میں وہ چائے کے گھونٹ بھی بھرتے جاتے ہیں اور سبحان اللہ کا ورد کرتے جاتے ہیں۔

میں تیار ہو کر پاک ٹی ہاؤس جانے کے لئے گھر سے نکل پڑتا ہوں۔ یہ لاہور کی آبادی مصری شاہ کا علاقہ ہے۔ سڑک پر کوئی رش نہیں ہے۔ ابھی رکشہ، ٹیکسی، ویگنیں اسکوٹر چلنا شروع نہیں ہوئے۔ ہمارے محلے سے مصری شاہ کے اک موریا پل تک جانے والی سڑک پر ٹریفک کا شور اور افراتفری بالکل نہیں ہے۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل سوار گزر جاتا ہے۔ دکانیں کھلی ہیں۔ ابراہیم عطار اپنی دکان کے آگے پانی کا چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ حلوائی کی دکان کے باہر بنچ پر دو چار آدمی بیٹھے بڑے سکون سے لسی پی رہے ہیں۔ میں مصری شاہ کے پل کے نیچے سے گزرتا ہوا اکبری منڈی والے باغ میں داخل ہو جاتا ہوں۔ باغوں باغ پیدل چلتا سہگل، مکیش کا کوئی فلمی گانا گنگناتا، سگریٹ پیتا، سوچی گیٹ کے باہر نکل آتا ہوں۔ یہاں جی ٹی روڈ بڑے آرام سے عبور کر کے اپنے دوست نواز کے محلے کی گلی میں داخل ہو جاتا ہوں۔

وہ پہلے سے تیار ہے۔ ہم گلی میں سے گزرتے، ہنسی مذاق کی باتیں کرتے گوالمنڈی آ جاتے ہیں۔ یہاں ایک گلی میں حسن طارق کا مکان ہے۔ ابھی حسن طارق صرف تارا ہے۔ نواز اسے تارا کہتا ہے۔ میں اسے طارق کہتا ہوں۔ ابھی وہ فلمی دنیا کی طرف نہیں گیا۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ لاہور کے اسٹوڈیوز میں داخل ہو جائے گا، پھر انجمن، نیند، پھنے خان، ایک گناہ اور سہی اور امراؤ جان ادا جیسی فلمیں بنائے گا اور جوانی میں ہی فلمی دنیا کے تاریک اجالوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے گا۔ مگر ابھی وہ زندہ ہے۔ ابھی وہ حسن طارق نہیں بلکہ طارق اور

تارا ہے۔ میرا یہ تقریباً روز کا معمول ہے کہ میں مصری شاہ سے نکل کر پہلے نواز کو ساتھ لیتا ہوں، پھر حسن طارق کے گھر جاتا ہوں اور یہاں سے ہم تینوں پاک ٹی ہاؤس آ جاتے ہیں۔

حسن طارق ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔ وہ نیند بھری آنکھوں سے کھڑکی میں سے دیکھتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے۔

''یار! تم اباجی کے پاس بیٹھو۔ میں ابھی ایک منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں۔''

حسن طارق کے والد صاحب امرتسر کے بڑے خالص اور روایتی کشمیری بزرگ ہیں۔ بیٹھک میں تخت پوش پر بیٹھتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ نوکر قہوے کی ٹرے لئے داخل ہوتا ہے۔ حسن طارق کے والد یعنی خواجہ صاحب کہتے ہیں۔

''یار! اچھا ہوا تم آ گئے۔ بیٹھو، قہوہ پیو۔''

یہ کشمیری قہوہ ہے۔ بیٹھک میں دار چینی اور بادیان خطائی کی مہک اُڑنے لگی ہے۔ مجھے جنوب مشرقی ایشیا کے جنگل یاد آ رہے ہیں۔ ساون کی اندھیری تاریک راتوں میں موسلادھار بارشوں میں بھیگتے جنگل......!

خواجہ صاحب پیالیوں میں قہوہ ڈال رہے ہیں۔ حسن طارق تیار ہو کر آ گیا ہے۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ہر وقت ایک شرارتی مسکراہٹ رہتی ہے۔ ہم تینوں دوست گلی میں سے بازار میں آتے ہیں۔ سامنے دودھ دہی والے پہلوان کی دکان ہے۔ پہلوان کو کلاسیکی موسیقی سے بھی شغف ہے۔ مگر راگوں سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ حسن طارق میرے کان میں کہتا ہے۔

''حمید! اس سے پوچھو، بھیرویں راگ اور مالکونس میں کیا فرق ہے؟''

میں پہلوان سے پوچھتا ہوں تو وہ گردن کو بڑی مایوسی کے انداز میں ایک طرف جھٹک کر کہتا ہے۔

''کیا بات کرتے ہو باؤ؟ کہاں بھیرویں، کہاں مالکونس۔ بھیرویں ملک ہی ا''

ہے۔ اس کی آب د ہوا ہی اور ہے۔''

ہم ہنستے، قہقہے لگاتے گوالمنڈی چوک میں آ جاتے ہیں۔ شیھو پان والے کے ساتھ ہمارے بزرگ دوست حاجی امرتسری کی سری پائے کی دکان ہے۔ دکان پر کافی رش ہے۔ ایک سال پہلے حاجی امرتسری ریڑھی پر چانپیں لگایا کرتا تھا۔ ایک سرد رات کا ذکر ہے کہ میں، حسن طارق اور نواز گوالمنڈی کے ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ اچانک فلم سٹوڈیو جا کر شوٹنگ دیکھنے کا پروگرام بن گیا۔ ہم نے تانگہ کرایا اور پنچولی آرٹ سٹوڈیو پہنچ گئے۔

وہاں ہمیں رات کے بارہ بج گئے۔ واپسی پر کوئی سواری نہ ملی تو ایک گڈے کو دیکھا. کہ اس پر گوبھی کے پھول لدے ہوئے ہیں اور وہ مزنگ چونگی کی طرف جا رہا ہے۔ ہماری منزل بھی اسی طرف تھی۔ میں، نواز اور حسن طارق ہم تینوں گوبھی کے پھولوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔

بیل آہستہ آہستہ اندھیری ویران سڑک پر چل رہے تھے۔ گڈے کا مالک کمبل کی بکل مارے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ گڈے کے نیچے جلتی لالٹین جھکولے کھا رہی تھی۔ مزنگ چونگی پہنچ کر ہم چھلانگیں لگا کر گڈے سے اترے اور پیدل ہی گوالمنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ سب دکانیں، ہوٹل بند تھے۔ ہمیں بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی۔ دیکھا چوک میں حاجی امرتسری اپنی ریڑھی کے پاس کھڑا پرچ پیالے دھو رہا ہے۔

نواز نے خوش ہو کر کہا۔

''حاجی کے پاس دو چار کلیجے اور چانپیں ضرور بچی ہوئی ہوں گی۔''

حاجی امرتسری ہمارا بے تکلف بزرگ دوست تھا۔ ہم نے جاتے ہی رومال میں سے کلیجے نکالے۔ پرات میں چار پانچ ٹھنڈی چانپیں پڑی تھیں۔ حاجی سے کوئی بات نہ کی اور چانپیں کھانی شروع کر دیں۔ حاجی امرتسری نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک طرح سے دکان بڑھا رہا تھا اور بالٹی میں پلیٹیں دھو رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ہمیں دیکھا

اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔

"یار حاجی! معاف کرنا، بڑی بھوک لگی تھی، تمہاری چاپنیں کھا رہے ہیں۔"

حاجی نے بالٹی کا پانی سڑک پر اچھالتے ہوئے کہا۔

"کھاؤ، کھاؤ۔ کوئی بات نہیں۔ میں بھی اب یہ چاپنیں کتوں کو ہی ڈالنے والا تھا۔"

ہم گوالمنڈی سے نکل کر میو ہسپتال میں سے ہوتے ہوئے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے باغ میں سے گزر رہے ہیں۔ یہاں ایک پتلی سی روش کی دونوں جانب سرد کے درخت کھڑے ہیں۔ آگے کالج کا وہ گیٹ ہے جو نیلا گنبد اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف کھلتا ہے۔

گیٹ کی بائیں جانب ایک قطعہ ہے جہاں انگریزی گلاب کے پودے لگے ہیں۔ ان پودوں پر زرد، سرخ، پنیلے، پیازی اور سفید گلاب کھل رہے ہیں۔ اسی قطعے میں ایک زرد گلاب کو دیکھ کر مجھے زرد گلاب کہانی لکھنے کا خیال آیا تھا۔

ہم پاک ٹی ہاؤس میں آ گئے ہیں۔ ٹی ہاؤس کی فضا چائے، سگریٹ اور ادیب و شاعر دوستوں کی باتوں سے مہک رہی ہے۔ دروازے کے پاس والے صوفے پر ڈاکٹر انور سجاد، انتظار حسین، شہرت بخاری، قیوم نظر، احمد مشتاق بیٹھے ہیں۔ دیوار کے ساتھ والی میز پر صفدر میر، سید سبط حسن، حمید اختر، سید کرمانی، ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف اور ابن انشاء بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، چائے پی رہے ہیں۔ سب سے مسکراہٹوں بھری سلام علیک ہوتی ہے۔ ہم کونے والی میز کے گرد جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اتنے میں آرٹسٹ انور جلال شمزا، افسانہ نگار اشفاق احمد اور شاعر ناصر کاظمی ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے ہیں۔ کوئی کسی منڈلی میں اور کوئی کسی میز پر بیٹھ جاتا ہے۔ ناصر کاظمی ہمارے پاس آ جاتا ہے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ملبوس ہے۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا ہے۔ یہ ہاتھ ہونٹوں کے قریب ہے۔ سیاہ بال چمک رہے ہیں۔ آنکھوں میں شباب کی روشنی ہے۔ چہرے پر مسکراہٹ ہے۔ چائے آ گئی ہے۔ باتیں شروع ہو گئی ہے۔ شعر و ادب کی باتیں، موسموں کی باتیں، خزاں میں جھڑنے والے زرد

پتوں کی باتیں، بہار میں کھلنے والے شگوفوں کی باتیں، ان لوگوں کی باتیں جو پاکستان کی خاطر شہید ہو گئے، ترقی پسند تحریک کی باتیں۔ آنے والے دور کے پاکستانی ادب کی بنیادیں رکھی جارہی ہیں۔ تانا بانا بُنا جارہا ہے۔

ناصر کاظمی وہ غزلیں تخلیق کر رہا ہے جنہیں پڑھ کر آنے والی نسل کو حیران ہونا ہے۔ ناصر کاظمی کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ابھی ہم میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی۔ ناصر کاظمی کرشن نگر کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ وہاں بجلی نہیں ہے۔ وہ رات کو موم بتیاں جلا کر پڑھتا اور غزلیں لکھتا ہے۔ ایک روز کہنے لگا۔

''میری میز پر بڑی موم اکٹھی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی ایک موٹی موم بتی بنا ڈالی ہے۔''

رات ناصر کاظمی نے ایک غزل لکھی تھی۔ وہ اپنی تازہ غزل سنا رہا ہے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
اب کی فصلِ بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ
کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو!
جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ
دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ

یہ پاکستان میں ہجرت کے فوراً بعد کا زمانہ ہے۔ چمن لٹ جانے کا غم اور نیا گلستان پانے کی خوشی۔ یہ دونوں جذبے شعر و نثر میں ساتھ ساتھ بہہ رہے ہیں۔ پاکستان کی خاطر دی گئی بے مثال قربانیوں کا احساس ابھی تازہ ہے۔

پاک ٹی ہاؤس کے باہر سائیکل اسٹینڈ ہے۔ جمے کا ایک بوڑھا یہاں بیٹھا سائیکلوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ اسے ابھی تک اپنے بیٹے کا انتظار ہے جو جمے سے کلو کے ٹھیکیدار

کے ساتھ لکڑیوں کے شہتیر لینے گیا تھا، پھر واپس نہیں آیا۔ کس وقت وہ خود فراموشی کے عالم میں بڑبڑانے لگتا ہے۔

"وہ ٹھیکیدار کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر نکلو گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہمارے گاؤں پر ڈوگروں نے حملہ کر دیا۔ آدھا گاؤں شہید ہو گیا۔ ان میں میری بیوی بھی تھی۔ میں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ میں پاکستان پہنچ گیا۔ میرا بیٹا ابھی تک نہیں آیا۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ شاید کسی قافلے کے ساتھ پاکستان جائے۔"

مجھے پنجابی ماہیے کے بول یاد آ رہے ہیں۔

بازار وکیندا ای لاچا
مٹی نہ پھرول جوگیا
تیرا لبھنا ئیں لعل گواچا

(بازار میں ریشمی لاچے بک رہے ہیں اے جوگی! تو مٹی میں کیا تلاش کر رہا ہے؟ تیرا کھویا ہوا لعل اب تمہیں نہیں ملے گا)

چھے کا یہ بوڑھا پاک ٹی ہاؤس کے باہر سائیکل اسٹینڈ کے پاس بیٹھا اپنے اکلوتے جوان بیٹے کے غم میں گھلتا چلا گیا۔ پھر ایک روز وہ وہیں بیٹھے بیٹھے فٹ پاتھ پر لڑھک گیا۔ اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ دوسرے روز وہ انتقال کر گیا۔

ٹی ہاؤس کے مالک علیم الدین نے ہمیں بتایا کہ بوڑھے نے مرنے سے پہلے مجھے کہا تھا۔ "میرا بیٹا ایک نہ ایک دن ضرور پاکستان آئے گا۔ وہ آئے تو اسے کہنا تیرا باپ تیری راہ دیکھتے دیکھتے مر گیا۔ اسے میری قبر پر ضرور لانا۔"

بیٹا پاکستان نہ آ سکا اور باپ کی قبر کا نشان بھی مٹ گیا۔ کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں ہم نے اپنے وطن پاک کو حاصل کرنے کے لئے ...... کس قدر قیمتی ہے یہ ہمارا پاک وطن!

ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی تھوڑی دیر کے بعد بج اٹھتی ہے۔ ایک بار گھنٹی بجتی ہے تو علیم صاحب ریسیور کان سے لگائے کوئی بات کرتے ہیں

اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور ہاتھ سے آنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت آواز کا فون ہے جس کے چہرے پر بہار کی صبحوں کا نکھار ہے۔ شبنم میں بھیگے پھولوں کی تازگی ہے۔

میں ٹی ہاؤس سے نکل کر لارنس باغ کی طرف چل پڑتا ہوں۔ مال روڈ بڑی پُرسکون ہے۔ کوئی ویگن، اسکوٹر یا رکشہ شور مچاتا بھاگتا دکھائی نہیں دیتا۔ فٹ پاتھ کے اوپر پیپل کے درخت مارچ اپریل کی خوشگوار ہوا میں اپنے سبز پتوں کو جھلا رہے ہیں۔ ابھی کہیں کوئی شاپنگ پلازا، کوئی شاپنگ سینٹر نہیں بنا۔ پرانی عمارتیں اپنی نیم وا کھڑکیوں میں سے مال روڈ کے درختوں کو خاموشی سے دیکھ رہی ہیں۔

لارنس باغ کے تمام رنگ بہار کی سنہری دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ ایک پرندہ کسی درخت سے اُڑ کر نہر کی طرف پرواز کر جاتا ہے۔ اس کی آواز دیر تک سنائی دیتی رہتی ہے۔ لاہور شہر کی طرح لارنس باغ بھی اپنی کلاسیکل خوبصورتی کے ساتھ ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ابھی اس کی روشوں پر سیر کرنے والوں کو گیس ٹربل شروع نہیں ہوئی۔ ابھی ہارٹ نے اٹیک کرنے بھی شروع نہیں کیے۔ ابھی کوئی شوگر کا مریض اپنی گاڑی باغ کے گیٹ پر کھڑی کر کے باغ میں ناتوانی سے ٹہلتا نظر نہیں آتا۔ ابھی دولت کی ہوس نے دلوں میں شگاف نہیں ڈالے تھے۔ ابھی مال روڈ کے درختوں کے پتوں کو ڈیزل کے دھوئیں نے سیاہ پوش نہیں کیا تھا۔ ابھی دلوں میں سوز و گداز کی شمع روشن تھی۔ ابھی آنکھوں میں حیا تھی۔ نگاہوں میں پاکیزگی تھی۔ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر شاخوں پر کھلے شگفتہ پھولوں کا خیال آتا تھا۔

میں اپنے شگفتہ پھول کے پاس لارنس باغ کے ریستوران کے کیبن میں بیٹھا ہوں۔ پھول کی مہک شگفتہ چائے کی خوشبو سے مل گئی ہے۔ یہ چائے پھر نہیں ملے گی۔ یہ پھول پھر نہیں کھلے گا۔ زمین کی گردش ان دونوں کو مجھ سے اور مجھے ان دونوں سے دور لے جائے گی۔ ہم باغ سے نکل رہے ہیں۔ یوکلپٹس کی نازک ٹہنیاں بہار کی ہوا میں آہستہ آہستہ لہرا رہی ہیں۔ ہم تانگے میں بیٹھے مال روڈ پر سے گزر

رہے ہیں۔ میں ٹی ہاؤس میں اتر گیا ہوں، تانگہ میرے شگفتہ پھول کو لے کر آگے گزر گیا ہے۔

ٹی ہاؤس ادیبوں، شاعروں سے بھرا ہوا ہے۔ بحثیں ہو رہی ہیں، باتیں ہو رہی ہیں، ہلکے ہلکے قہقہے بھی بلند ہو رہے ہیں۔ فضا میں چائے کی خوشبو، سگریٹوں کے دھوئیں کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔ ناصر کاظمی نے مجھے تانگے سے اترتے دیکھ لیا ہے۔ وہ زیر لب مسکرا رہا ہے۔

ابن انشا کونے والی میز کے پاس بیٹھا ہے۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ ان دنوں ''بغداد کی ایک رات'' نظم لکھ رہا ہے۔ ہماری بے تکلف باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ لال نامی بیرا چائے کا بل لے آتا ہے۔ ابن انشا بل کو کبھی عینک اتار کر، کبھی عینک لگا کر غور سے دیکھتا ہے۔ بیرا لال مسکرا رہا ہے۔ وہ ہم سب کا مزاج آشنا ہے۔ ابن انشا کہتا ہے۔

''یہ ایک کباب کس نے منگوایا تھا؟''

لال بیرا مسکراتے ہوئے کہتا ہے۔

''آپ نے منگوایا تھا جی۔''

میں ابن انشا سے کہتا ہوں۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا ابن انشا! یہ بل تمہیں ادا کرنا ہی ہوگا۔''

ابن انشا کوٹ کی اندرونی جیب میں سے ریزگاری نکال کر بڑی احتیاط سے گننے لگتا ہے، ساتھ ساتھ ہنس بھی رہا ہے۔ شرارت سے آہستہ آہستہ گردن بھی ہلا رہا ہے۔ بل ادا کرنے کے بعد وہ اٹھتے ہوئے کہتا ہے۔ ''چلو بغداد شہر کی سیر کو چلیں۔''

ابن انشا اندرون لاہور کو بغداد کہا کرتا ہے۔ ہم دونوں پاک ٹی ہاؤس سے نکلتے ہیں اور انارکلی میں سے پیدل ہوتے ہوئے لوہاری دروازے کے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ لاہور شہر کا گنجان تاریخی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ لاہور کے گلی کوچے میرے جانے پہچانے ہیں۔ پھر بھی کچھ تنگ و تاریک گلیاں میرے لئے بھی اجنبی ہیں۔ ہم

دونوں ایک ایسی ہی گلی کے مکانوں کی محرابی کھڑکیوں اور چھجوں کو دیکھتے آگے بڑھتے ہیں تو گلی بند ہو جاتی ہے۔ آگے ایک مکان کا آنگن آ جاتا ہے۔ مرغیاں ہمیں دیکھ کر بھاگ کر دیوار پر چڑھ جاتی ہیں۔ ایک عورت ہم سے پوچھتی ہے۔

''کس سے ملنا ہے؟''

میں جلدی سے کہتا ہوں۔ ''بہن جی! ناصر کاظمی کا مکان یہی ہے؟''

عورت پوچھتی ہے۔ ''یہ کون ہے؟''

ابنِ انشا میری طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

''میرا خیال ہے ہم غلط گلی میں آ گئے ہیں۔ وہ ساتھ والی گلی میں رہتا ہوگا۔''

اور ہم تیزی سے واپس مڑتے ہیں اور گلی میں سے نکل آتے ہیں۔ ابنِ انشا مجھے ڈانٹ کر کہتا ہے۔

''کمینے! تم تو لاہور کے کاکروچ ہو۔ تمہیں بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ گلی آگے جا کر بند ہو جاتی ہے؟''

میں اسے آنکھ مار کر کہتا ہوں۔

''لاہور پراسرار ہے۔ الف لیلہ کے بغداد سے بھی زیادہ پراسرار.......''

سید مٹھا بازار سے گزرتے ہوئے ہم چوک رنگ محل میں آ جاتے ہیں۔ یہاں سے چوک مسجد وزیر خان کے پاس کھڑے ہو کر ایک مکان کی محراب دار گیلری کو دیکھتے ہیں جس پر مینا کاری کی ہوئی ہے۔ اب ہم دلی دروازے سے باہر آ گئے ہیں۔ بائیں جانب مصری شاہ والے پل کے اوپر سے ریل گاڑی گزر رہی ہے۔ ابنِ انشا کہتا ہے۔

''چلو اسٹیشن پر چل کر ریل گاڑیاں دیکھتے ہیں۔''

مجھے بھی ریل گاڑیاں دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ ہم پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر تین نمبر پلیٹ فارم کے پل پر آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سامنے اسٹیشن کا وسیع یارڈ پھیلا ہوا ہے۔ ایک ریل گاڑی پلیٹ فارم سے نکل کر سانپ کی طرح بل کھاتی پل کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کا چھک چھک کرتا انجن دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا ہے۔ ابھی

گاڑیاں ڈیزل سے چلنا شروع نہیں ہوئیں۔ٹرین پل کے نیچے سے گزرنے لگتی ہے تو ہم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔کالا سیاہ دھواں غبار کی شکل میں پل کی دونوں جانب بلند ہوتا ہے۔ایک ٹرین پنڈی کی طرف سے ریلوے یارڈ میں داخل ہو رہی ہے۔ہم دوڑ کر پل کی دوسری طرف آ جاتے ہیں اور اس ٹرین کو آتے دیکھنے لگتے ہیں۔اس کے بعد ہم پلیٹ فارم نمبر ایک کے ریلوے ریفریشمنٹ روم میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ان دنوں وہاں اورنج پیکو چائے ملا کرتی تھی۔اس چائے کی خوشبو ہمیں کھینچ کر اکثر وہاں لے آیا کرتی تھی۔

ریلوے اسٹیشن سے ہم واپس پاک ٹی ہاؤس میں آ جاتے ہیں۔یہاں انور جلال شمزا بھی موجود ہے۔شام تک ہماری محفل جمتی ہے۔پھر میں اور شمزا میٹرو ہوٹل کی طرف چل پڑتے ہیں۔اب اگر آپ میٹرو ہوٹل کو دیکھنا چاہیں تو آپ کو واپڈا ہاؤس کی عظیم الشان سنگین بلڈنگ کو اپنی جگہ سے ہٹانا ہوگا اور زمین کی کھدائی کرنی ہوگی۔مگر جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت نہ کوئی واپڈا تھا اور نہ کوئی واپڈا ہاؤس تھا۔جہاں اب واپڈا ہاؤس ہے وہاں ایک خالص مغربی بلکہ انگریزی طرز کا پائیں باغ اور ڈانس ہال والا میٹرو ہوٹل ہوتا تھا۔اس ہوٹل میں صرف انگریزی لباس پہن کر آنے کی اجازت تھی۔

میں اور انور جلال شمزا بھی موتیے کے پھولوں کی جھاڑی کے پاس بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے ہیں۔میٹرو کی چائے بھی ہوٹل کی ڈانسر انجیلا کے رقص کی طرح خوبصورت تھی۔یہاں پیالہ و ساغر بھی گردش میں رہتے۔مگر ہمیں صرف چائے سے دلچسپی تھی اور میں ان سرسبز جھاڑیوں کے لئے آتا جن پر موتیے کے، سیب کے شگوفوں جتنے بڑے بڑے گہری خوشبو والے پھول کھلا کرتے تھے۔

میں نے بنگال میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا۔وہ اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھی بالوں میں روپل کے سفید پھول سجا رہی تھی۔میٹرو ہوٹل کے باغیچے میں موتیے کی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے مجھے بے اختیار بنگال کی وہ لڑکی یاد آ جاتی تھی۔اس لڑکی

کی یاد آج بھی شگفتہ ہے۔ مگر میٹرو ہوٹل کے باغیچے کی خوشبودار چائے اور موتیے کے پھول مصر و یونان کے پری خانوں کی طرح واپڈا ہاؤس کے نیچے ہزاروں ٹن مٹی میں دفن ہیں۔ کبھی کبھی واپڈا ہاؤس کے قریب سے گزرتا ہوں تو ٹریفک کے شور میں انجیلا کے رقص کے آرکسٹرا کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دیتی ہے جیسے چاہِ بابل کی تاریک گہرائیوں میں دفن کسی شہزادی کی روح پکار رہی ہو۔

"رات ہو گئی ہے۔"

میں اپنے مصری شاہ کی گلی والے مکان میں آ گیا ہوں۔ یہاں دیوان خانے میں سبز چائے کی محفل گرم ہے۔ چائے کو ابھی سماوار میں جوش نہیں آیا۔ گلی والی کھڑکی کھلی ہے۔ بہار کی ہوا کے جھونکے دھریک کے کاسنی پھولوں کی مہک کمرے میں اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔ چھوٹی بہن نے باقر خانیوں سے بھرا ہوا طشت لا کر سماوار کے پاس رکھ دیا ہے۔ یہ خالص امرتسری کشمیری باقر خانیاں ہیں جو والد صاحب گوالمنڈی سے لگوا کر لاتے ہیں۔ بچپن میں عمدہ کاکا کی دکان پر باقر خانیاں تیار ہوتے اور لگتے بڑی دلچسپی سے دیکھا کرتا۔ گندھے ہوئے میدے کے بڑے بڑے پیڑے کو کاکا جی لکڑی کے بڑے تختے پر ڈال کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پھیلاتے چلے جاتے۔ پھر اس میں دیسی گھی لگاتے اور تہہ کر کے دوبارہ پھیلاتے چلے جاتے۔ یوں گھی میدے کی پرتوں میں جذب ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ میدے کے بڑے پیڑے کو تختے پر پھیلا کر اتنا بڑا کر دیتے کہ وہ چادر کی طرح بن جاتا۔ کاکا جی چادر کے پٹ کو بازو پر ڈال کر زور سے تختے پر دے مارتے۔ یہ عمل بار بار کیا جاتا۔ اس کے بعد میدے کی گھی ملی چادر کو دوبارہ تہہ کرنے کا عمل شروع ہوتا اور میدہ ایک بار پھر بڑے پیڑے کی شکل اختیار کر جاتا۔ تب اس بڑے پیڑے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے کئے جاتے اور دوسرا نانبائی انہیں تنور میں لگاتا چلا جاتا۔ کاکا جی خود بڑی احتیاط سے سیخ کے ساتھ باقر خانیوں کو تنور میں سے نکال کر باہر رکھتے جاتے۔ باقر خانیاں اتنی خستہ، بادامی اور خوشبودار ہوتیں کہ لگتا آسمان سے پریاں اتر آئی ہیں۔

دادا جان ساوار کے سامنے صدر مجلس بن کر بیٹھے ہیں۔ وہ طشت میں رکھی باقر خانیوں میں سے ایک کو انگلی سے ذرا سا دبا کر والد صاحب سے کہتے ہیں۔

''یار! یہ عمدہ کاکا کی باقر خانیاں نہیں ہیں۔''

امرتسری، کشمیری گھرانوں میں اکثر باپ، بیٹے کو بے تکلفی سے یار کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ باپ بیٹوں میں دوستی بھی بہت ہوا کرتی تھی۔ بڑی بہن نیلے پھولوں والی جاپانی پیالیاں لے آئی ہے۔ کمرے میں بجلی کا بلب جل رہا ہے لیکن ایک بہن نے پلیٹ میں موم بتی روشن کر کے کارنس پر رکھ دی ہے۔

''سبز چائے کے ساتھ روشن موم بتی اچھی لگتی ہے۔''

یہ ہماری چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہیں۔ ہم ان میں بڑے خوش ہیں۔ ابھی بڑی خوشیوں کے بڑے عذاب سر پر نہیں پڑے۔ ابھی کسی نے کینسر کا نام نہیں سنا۔ گیس ٹربل کیا ہے؟ ہارٹ اٹیک کیا ہوتا ہے؟ بائی پاس کس بلا کا نام ہے؟ کسی کو ان کی خبر نہیں۔ ابھی تو گلی والی دھریک پر کاسنی پھول خوشبو دیتے ہیں۔ دیوان خانے کے کارنس پر موم بتی روشن ہے۔ طشت میں باقر خانیاں رکھی ہیں اور ساوار میں سبز چائے پک رہی ہے اور ہم سب دری کے فرش پر بیٹھے ہیں اور دادا جان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور وہ بے اختیار کہتے ہیں۔

''یار! اب چائے برتانی شروع کرو۔ کافی جوش آ گیا ہے اسے۔''

چائے کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ امرتسر میں گزارے ہوئے دنوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ وہاں کی گلی کے لوگوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ دادا جان سبز چائے میں ڈبوئی ہوئی باقر خانی بڑے شوق سے کھا رہے ہیں۔ پلیٹ میں رکھی موم بتی آہستہ آہستہ پگھل رہی ہے۔ رات گزرتی چلی جا رہی ہے۔ گلی میں اندھیرا ہے۔ گہری خاموشی ہے۔ دھریک کی ٹہنیوں پر سر رکھ کر کاسنی پھولوں کے گچھے سو گئے ہیں۔ اب وہ اذان کے وقت جاگیں گے اور اللہ کی حمد و ثنا کریں گے۔ پھول سو کر بھی خدا کی حمد کرتے ہیں اور جاگ کر بھی۔

رات کے بارہ ساڑھے بارہ بلکہ ایک بجے تک یہ محفل جمی رہتی ہے۔ پھر برتن سمیٹے جاتے ہیں۔ جس کا جہاں جی چاہتا ہے، کشمیری شال اوڑھ کر سو جاتا ہے۔

خود جاگتی، سب کو سلاتی، کچھ ٹھنڈی، کچھ گرم نیلی رات شبنم کا عطر چھڑکتی گلیوں، بازاروں، بستیوں، کھیتوں، باغوں میں سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ میں گرم شال اوڑھے دری پر دیوار کی طرف منہ کئے لیٹا ہوں۔ رات کے سناٹے میں دور مادھو لال حسین کے مزار کی طرف سے کسی فقیر کے گانے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے۔ وہ شاہ حسین کی کافی گا رہا ہے۔ کافی کے الفاظ مجھ تک نہیں پہنچ رہے مگر کافی کی طرز سے مجھے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔

مائے نی میں کینھوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال
جنگل بیلے پھراں ڈھونڈیندی
اجے نہ پایو لال
مائے نی میں کینھوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال

(میں جنگل جنگل، بستی بستی اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ مجھے ابھی تک میرا لعل نہیں ملا۔ اے ماں! میں دردِ فراق کا حال کس کے آگے بیان کروں؟)

مزار شاہ حسین سے آنے والی فقیر کی غم انگیز آواز دور ہوتی جا رہی ہے۔ آواز دور نہیں ہو رہی، مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں غافل ہو رہا ہوں۔

اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ نہ وہ گلی تھی اور نہ کاسنی پھولوں والا دھریک کا درخت نہ وہ انگور کی بیل والا آنگن تھا اور نہ ساوار کے گرد بیٹھ کر سکون سے چائے پینے والے وہ لوگ باقی تھے۔ کہاں گئے وہ حاجی صاحب جو فجر کی اذان کے وقت تلاوت کلامِ پاک کیا کرتے تھے۔ ان کے مکان کے نیچے اب موٹر ورکشاپ کھلا ہے۔ ہر طرف شور ہی شور ہے۔ یہاں ایک نکلنے والی چھوٹی سی گلی تھی جو آگے آم کے

باغ میں جاتی تھی، وہ کہاں چلی گئی؟ آم کے باغ کہاں گئے؟ اب وہاں مکان ہی مکان ہیں، بازار ہی بازار ہیں جہاں دن رات رکشے شور مچاتے ہیں، گرد اڑاتے ہیں۔ باہر لٹکے ہوئے مسافروں سے بھری ویگنیں چلتی ہیں۔ آگے سچے گلابوں کا کھیت تھا، وہ کہاں چلا گیا؟ پھر ناشپاتی کا باغ آتا تھا، یہ سب میرے دوست تھے۔ یہ میرے دوست مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ شہر میں شور مچا ہے، آسمان چپ ہے۔ ٹی ہاؤس خاموش ہے۔ میں جنگل جنگل، بستی بستی اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ مجھے میرا لالر نہیں مل رہا۔ اے ماں! میں دردِ فراق کا حال کس کے آگے بیان کروں؟

◎……◎

۴

گورنمنٹ ڈگری کالج مخدوم رشید ملتان سے پروفیسر سیّد شمس الاسلام کاظمی صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

''محترم اے حمید صاحب! ''نوائے وقت'' میگزین کے صفحات پر ہر ہفتے آپ سے یکطرفہ ملاقات تو ہوتی رہتی ہے مگر میں اس ملاقات کو دوطرفہ بنانے کے لئے قلم و قرطاس کا ذریعہ اختیار کر رہا ہوں۔ آپ کی تحریر ''لاہور کے بھولے بسرے ادبی مراکز'' باقاعدہ پڑھ رہا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی لاہور کے بارے میں آپ کی تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ محترم! کیا آپ کے دور والا لاہور مجھے واپس نہیں مل سکتا جس میں امن اور سکون تھا۔ پیار تھا۔ ایک دوسرے کا احساس تھا۔ رواداری تھی۔ میں آپ کی تحریر پڑھتے پڑھتے آپ کے ساتھ ہی چل پڑتا ہوں۔ جہاں آپ چائے پیتے ہیں، میں بھی چائے پیتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کے ہمراہ قدیم لاہور کی سیر کر رہا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر میں افسردہ ہو جاتا ہوں کہ وہ خوبصورت رومانوی لاہور اپنے خوبصورت روایت پسند باشندوں سمیت اب ایک خواب بن چکا ہے۔ میں اس اعلیٰ پائے کے ادبی اور ثقافتی ماحول سے محروم ہوں جس کا آپ اپنے مضامین میں ذکر کرتے ہیں۔ کاش! میں اس وقت کے لاہور میں پیدا ہوتا۔ اُس وقت کے باغِ جناح کی سیر کرتا۔ مختلف ادبی ٹھکانوں پر جا جا کر بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا۔ میں یہ خط لکھتے وقت بھی آپ کے ساتھ لاہور کی اس رومانوی فضا

میں موجود ہوں جسے آپ بھی لکھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور جس فضا میں آپ رہ چکے ہیں۔ موجودہ لاہور سے مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ شور وغل، ٹریفک کا ہجوم، ہر قسم کے دھوئیں سے آلودہ فضا، افراتفری، تیز رفتاری۔ ہر کوئی بھاگا جا رہا ہے۔ میں اب لاہور آتے گھبراتا ہوں۔

محترم! یونیورسٹی کیمپس والی چھوٹی سی نہر اب وہ منظر پیش نہیں کرتی جو آپ کی تحریروں میں ابھرتا ہے۔ یہ شہر سیلاب کی لہروں کی مانند پھیلتا جا رہا ہے۔ میں تقسیم سے پہلے کے مسلمانوں کے امرتسر کو یاد کرتا ہوں جس کا آپ ذکر کرتے رہتے ہیں۔ میں امرتسر کے ان مسلمانوں کو یاد کرتا ہوں جو امرتسر کے خوبصورت باغ، اپنے جدی پشتی مکان، گھر بار، کیا کچھ لکھوں؟ سب کچھ ہی وہاں چھوڑ آئے۔ محترمی! میں ماجھے کے علاقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ امرتسر سے پٹی اور پٹی سے آگے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اور قدیم گاؤں گھڑیالہ تھا۔ اس کا ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔ میرے دادا مرحوم جناب سید محمد شریف شاہ صاحب گھڑیالوی اسی گاؤں میں آسودۂ خاک ہیں۔ میرے دادا مسلم امرتسر کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ امرتسر کی ادبی اور ثقافتی محفلوں کو یاد کر کے وہ اُداس ہو جایا کرتے تھے۔ میرے دادا خود بہت عالم فاضل تھے۔ میں بزرگوں کی باتوں اور تحریروں میں جس لاہور کو دیکھتا ہوں، اسے ہمیشہ یاد کرتا ہوں اور یاد رکھتا ہوں اور آپ کی تحریریں اس قدیم لاہور کے ادب و ثقافت اور علمی فضاؤں کے مناظر کو ہم تک پہنچاتی رہیں گی۔ آپ کی درازیٔ عمر کے لئے دعا گو ہوں کہ یہ تاریخی اور علمی، ادبی سلسلہ چلتا رہے۔ مجھے نہیں امید کہ آپ کے بعد کوئی لاہور کو اس انداز میں یاد کرے گا اور گرد اور دھواں اڑاتی فضاؤں میں لاہور کے کھوئے ہوئے حُسن کو تلاش کرے گا۔

محترم! میں پاپ سنگروں کی دنیا کا باشندہ ہوں۔ مگر ہنگامہ خیز موسیقی کے بے ہنگم شور شرابے کی بجائے حقیقی موسیقی کے دل گداز اور روح کو تسکین پہنچانے والے میوزک کی تلاش میں ہوں۔ مجھے وہی لاہور چاہئے جس میں آپ نے اپنا بچپن اور جوانی گزاری ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی آج کی مصنوعی زندگی کے سیلاب میں

بہہ رہا ہوں۔

فقط دعا گو

سید شمس الاسلام کاظمی

گورنمنٹ ڈگری کالج مخدوم رشید، ملتان۔"

محترمی کاظمی صاحب! آپ نے بالکل صحیح کہا کہ لاہور اب وہ لاہور نہیں رہا۔ اس کی فضا ٹریفک کے شور وغل، گرد وغبار اور ڈیزل و پٹرول کے دھوئیں سے اس قدر آلودہ ہو چکی ہے کہ صاف ہوا میں سانس لینا ناممکن بات ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں لاہور شہر کی پلاننگ اور اس کی تزئین و آرائش اور دیکھ بھال کی ذمے داری ہے، یہ شہر ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ آبادی سیلاب کی طرح بڑھ رہی ہے۔ کوئی چیک کرنے والا نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ آبادی کے سیلاب کی وجہ سب کو معلوم ہے مگر اس سیلاب کو روکنے کی کسی میں ہمت نہیں ہے۔ جو کوئی آتا ہے، سڑکیں چوڑی کر کے، ایک دو پل بنا کر، ایک دو انڈر پاس اور فلائی اوور بنا کر چلا جاتا ہے۔ اس بارے میں کوئی نہیں سوچتا کہ یہ سیلاب کہاں سے آ رہا ہے؟ کیوں آ رہا ہے؟ اس کو روکا جانا چاہیے۔ بسیں، ویگنیں، رکشے دھواں چھوڑتے ہیں تو بے شک چھوڑیں۔ فضا آلودہ ہو رہی ہے تو ہوتی رہے۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ چھ چھ کنال کی سرکاری کوٹھیوں کے صاف ستھری فضا والے ایئر کنڈیشنڈ کمروں سے نکل کر یہ دیکھے کہ ویگنوں میں بوریوں کی طرح بھرے ہوئے سکولوں کے بچے جلتے ہوئے ڈیزل کے زہریلے دھوئیں میں کس حالت میں اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ ہر طرف ایسی ہی نفسا نفسی کا عالم ہے، ہر طرف یہی افراتفری مچی ہوئی ہے۔

لاہور سے محترم قاری نور احمد صاحب نے بھی اپنے خط میں ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"محترمی اے حمید صاحب! "نوائے وقت" کے سنڈے میگزین میں آپ کو پڑھتا ہوں اور یادِ ماضی میں کھو جاتا ہوں بلاشبہ آپ لاہور کی آج کی نسل کو لاہور کے درخشاں

ماضی کے بارے میں بہت کچھ دے رہے ہیں۔ وہ ماضی ہی کا لاہور تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لاہور لاہور ہی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی سے لے کر اسمبلی کی عمارت تک مال روڈ کے دونوں طرف کی شامیں بھلائی نہیں جا سکتیں۔ ہوٹل، ریسٹورنٹ اور فٹ پاتھ کے سایہ دار پیپل کے درخت بھلا کوئی بھلا سکتا ہے۔ اسی طرح لکشمی چوک کے ریستوران، سینما ہاؤس اور سر شام پُر سکون رونقیں تو کل کی باتیں لگتی ہیں۔ لاہور کی کبھی کوئی شام اُداس نہیں ہوتی۔ آپ کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ ابھی بہت کچھ بتانے کے لئے باقی ہے۔ آج کی نسل کو کیا پتہ کہ وہ لاہور کیا تھا اور وہ لوگ کیسے تھے اور ان کی ثقافت اور تمدن کس قدر قابل قدر اور بے مثال تھی اور ان کی وضع داریوں کی ایک دنیا تعریف کرتی تھی۔ لاہور تاریخی شہر ہے۔ ثقافتی شہر ہے۔ ماضی میں بھی تھا اور حال میں بھی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ لاہور کی حقیقی ثقافت اور وضع داریوں کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا ہے۔ ہم بے شک جتنی چاہیں فوڈ سٹریٹس بنا لیں لیکن گوالمنڈی کی فوڈ سٹریٹ میں وہ سماں پیدا نہیں کر سکتے جو آج سے پہلے ہوتا تھا جب حاجی کے سری پایوں اور ہریسے کی دکانوں پر لوگوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں اور فجر کی نماز سے لے کر صبح آٹھ بجے تک حاجی کے سری پائے اور ہریسہ ختم ہو جاتا تھا۔

حمید صاحب! آپ نے ادبی ٹھکانوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ آپ ایک ایسے ادارے کو بھول گئے جو مشہور رسالے ''شمع'' سے وابستہ تھا۔ ماہنامہ ''شمع'' خواتین کا رسالہ ''بانو آئینہ'' اور ''بچوں کی دنیا'' اس ادارے کے مشہور رسالے تھے۔ اس ادارے کے بارے میں ضرور کچھ لکھئے گا۔

آپ کا قاری۔ نور احمد۔''

محترم نور احمد صاحب! آپ نے خط لکھا۔ آپ میرے مضامین شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں اس کے لئے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے رسالے ''شمع'' کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، بجا طور پر وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ بلاشبہ اپنے زمانے میں

''شمع'' رسالے کا بڑا شہرہ تھا۔ اگر چہ یہ رسالہ ادبی رسالہ نہیں تھا لیکن اس میں جو کچھ بھی چھپتا تھا وہ کسی طرح سے بھی ادبی معیار سے کم تر نہیں تھا۔ لاہور کے ادبی اور نیم ادبی رسالوں کے بارے میں ابھی میں نے لکھنا شروع نہیں کیا۔ جب لکھا تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماہنامہ ''شمع'' کا تذکرہ نہ ہو؟

آپ نے آج سے کچھ عرصہ پہلے کے لاہور کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے یقیناً ہمارے دیگر قارئین کرام بھی متفق ہوں گے۔ خاص طور پر آپ نے گوالمنڈی کے سری پایوں اور ہریسے کا ذکر کیا ہے تو اس کی صداقت کا عینی شاہد میں بھی ہوں۔ بلکہ ہم نے تو پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی گوالمنڈی میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو طلوع ہوتے دیکھا ہے جب امرتسر سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں نے گوالمنڈی کو اپنا نیا مسکن بنایا تھا اور حاجی امرتسری نے پہلی بار گوالمنڈی کے چوک میں سری پائے لگائے تھے۔ حاجی بھی اس زمانے میں جوان تھا اور امرتسر کے شاعروں، ادیبوں یعنی احمد راہی، سیف الدین سیف، ظہیر کاشمیری وغیرہ کا دوست تھا۔ امرتسر میں اس کا محلہ ہمارے محلے سے کافی فاصلے پر تھا۔ کامریڈ ہوٹل اور صوفی ترک ہوٹل ہمارے محلے میں تھا۔ سیف، احمد راہی اور حاجی دوسرے محلے سے وہاں آیا کرتے تھے۔ مگر مجھے پتہ نہیں کہ حاجی امرتسر میں کیا کرتا تھا۔ ویسے وہ جینئس آدمی تھا۔ چھ سات جماعتیں پاس تھا مگر نطشے کے نظریہ فوق البشر اور ہیگل کے نظریہ جدلیات پر بحثیں کیا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ کوئی بھی کام کر سکتا تھا۔ اسے ہر کام کرنا آتا تھا۔ کوئی فکر فاقہ اسے نہیں تھا۔ شادی وادی اس نے نہیں کی تھی۔ اکیلی جان تھی۔ جو کام بھی شروع کرتا اسے عروج پر پہنچا کر چھوڑ دیتا تھا۔ گوالمنڈی میں جب اس کے سری پایوں کی شہرت اپنے عروج پر پہنچی تو ایک دن پتہ چلا کہ حاجی سری پایوں کی دکان بیچ باچ کر کسی گاؤں میں چلا گیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ ٹی ہاؤس میں بیٹھتا تھا اور شعر و ادب پر باقاعدہ بحث کرتا تھا۔ ایک مدت کے بعد وہ گاؤں سے واپس آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ کہنے لگا ایک گاؤں میں نہر کے کنارے میں نے ایک کھیت

خرید کر وہاں بانس کے پودے لگا دیئے ہیں اور انہیں دیکھتا رہتا ہوں کہ بانس کیسے زمین سے نکل کر جنگل بن جاتا ہے۔

جب ہماری گوالمنڈی کی محفلیں ختم ہوگئیں اور وقت بدل گیا تو دو ایک سال ہوئے ہیں مجھے ایک دوست نے بتایا کہ حاجی گوالمنڈی میں اچانک نمودار ہو گیا۔ ایک دکاندار نے کہا۔

''حاجی! آخر تمہیں دوستوں کی یاد کھینچ کر لے ہی آئی۔''

حاجی بولا۔ ''میں دوستوں سے ملنے نہیں آیا۔ میں یہ پتہ کرنے آیا ہوں کہ کون کون مر گیا ہے۔''

گوالمنڈی میں امرتسری شاعروں، ادیبوں کی وہ محفلیں تو نہیں رہیں لیکن گوالمنڈی میں امرتسری کلچر، امرتسری کلچے اور ہریسہ اور باقر خانیاں، کھنڈ کلچے اور تافتانے اسی طرح زندہ سلامت ہیں اور زندہ سلامت رہیں گے۔ گوالمنڈی کی ایک شاخ نسبت روڈ پر ہریسے کی پرانی دکان پر صبح دم پہلے دن کی طرح خوش خوراک امرتسریوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ خدا غریق رحمت کرے، اکرم بٹ کو۔ کیا باغ و بہار شخصیت تھی اس امرتسری کشمیری نوجوان کی۔ وہ میرا دوست بھی تھا اور کزن بھی تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر پینتیس چالیس برس تک میرا اس کا ساتھ رہا۔ اکرم بٹ کے کمرے میں ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کی بڑی رونق لگی رہتی تھی۔ اکرم بٹ کا نام ریڈیو سٹیشن کی شناخت تھی۔ سردیوں میں ہفتے میں ایک بار اکرم بٹ لنچ کے وقت بڑے اہتمام سے دوستوں کے لئے نسبت روڈ سے ہریسہ اور گوالمنڈی سے کلچے منگوا کر محفل ضرور لگاتا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ میں اس کے کمرے میں بیٹھا ہوتا تھا۔ اکرم بٹ دفتر کی فائل پر کچھ لکھتے لکھتے فائل بند کر کے میری طرف دیکھتا اور کہتا۔

''خواجہ یار! طبیعت اداس ہوگئی ہے۔ کیا خیال ہے گوالمنڈی سے ہریسہ نہ منگوایا جائے؟''

اسی وقت ایک خاص آدمی کو نسبت روڈ کی طرف دوڑا دیا جاتا۔ اکرم بٹ اسے

تاکید کرتا کہ آتی دفعہ گوالمنڈی میں صوفی کے تندور سے تلوں والے کلچے بھی لیتے آنا۔ اکرم بٹ کے ریٹائر ہونے کے ساتھ ہی ریڈیو سٹیشن کی آدھی رونقیں ختم ہو گئیں۔ ریڈیو اسٹیشن سے چلے جانے کے بعد اکرم بٹ ڈیوس روڈ پر اپنے بھانجوں شہزاد بٹ، فاروق بٹ اور شاہد بٹ کے قالینوں کے کارخانے میں آکر بیٹھا کرتا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن پر تو اس سے روز کا ملنا ہوتا تھا۔ اب وہاں کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی۔ میں جب بھی اسے ملنے جاتا، شہزاد بٹ اور شاہد بٹ وغیرہ اسی وقت ڈرائیور کو بھیج کر گوالمنڈی سے ہریسہ اور تلوں والے کلچے منگواتے۔ دہی کا کونڈا بھی ساتھ ہی منگوایا جاتا۔ بس زبردست محفل لگ جاتی۔ امرتسر کی باتیں ہوتیں۔ امرتسر کے کشمیری قالین بافوں، رفو گروں اور شال مرچنٹوں کی باتیں ہوتیں۔ کمپنی باغ اور بڑی نہر پر آم پارٹیوں کی باتیں ہوتیں اور امرتسر کی خوشبوئیں آنا شروع ہو جاتیں۔

◎......◎

میں ذکر کر رہا ہوں لاہور کے لورینگو ریستوران کا۔ جس کی یاد آتے ہی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اٹھارہویں صدی کی کسی قدیم لائبریری کی کلاسیکل خاموش فضا میں بیٹھا سیلو اور شیلے کے گیتوں کی کوئی کتاب پڑھ رہا ہوں۔ کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا، ابھی کل کی بات ہے کہ لورینگو، کافی ہاؤس، ٹی ہاؤس، نگینہ بیکری، عرب ہوٹل اور شیزان ریستوران کی ادبی، صحافتی اور علمی محفلیں اپنے عروج پر تھیں۔ یہ بھولے بسرے ثقافتی اور ادبی ٹھکانے ہم ادب کے طالب علموں کی ذہنی اور شخصی تربیت گاہیں تھیں۔ یہاں بیٹھنے والوں سے ہم نے کم بات کرنے اور زیادہ سے زیادہ خاموش رہ کر علم و ادب کی باتیں سننے اور سمجھنے کا درس حاصل کیا۔ ان سے بزرگوں کی مجلس میں اٹھنے بیٹھنے کا، حد ادب کو ملحوظ رکھنے کا سلیقہ سیکھا۔ یہ کوئی فائیو سٹار ہوٹل نہیں تھے۔ یہاں بیٹھنے والے لمبی لمبی قیمتی کاروں میں نہیں آتے تھے۔ ان میں سے کوئی سائیکل پر آتا، کوئی سواریوں والے تانگے پر آتا اور کوئی سڑک کے کنارے چلتا اپنے خیالات میں گم پیدل آتا تھا۔ کسی کو اچھی، باعزت، باوقار چائے کی محبت کھینچ کر لاتی تھی، کوئی علم و ادب کی پیاس بجھانے آتا تھا۔ جیب میں صرف اتنے ہی پیسے ہوتے تھے کہ جن سے ہاف سیٹ یا فل سیٹ چائے منگوا کر دوستوں کے ساتھ خاموشی سے بیٹھ کر پی جائے۔

کہنے میں صرف پینتیس چالیس برس ہی گزرے ہیں مگر لگتا ہے جیسے دو صدیاں گزر گئی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری چیزوں کے ساتھ چائے کی پاکیزگی، کردار اور عزت نفس بھی قائم تھی۔ گوالمنڈی کی کسی دکان کے پھٹے پر بیٹھ کر ہم جو پکی ہوئی چائے پیتے تھے، وہ جب تام چینی کی چینک میں سے نکل کر کپ میں تشریف لاتی تھی اور اس

کی خوشبو چاروں طرف ایک ایک فرلانگ تک جاتی تھی۔ کچھ چائے نیک اور شریف النفس ہوتی تھی اور کچھ چائے بنانے والے ہاتھوں میں برکت ہوتی تھی۔ نہ وہ ریستوران رہے، نہ ان ریستورانوں میں بیٹھ کر چائے پینے والے، چائے سے محبت کرنے والے رہے اور نہ وہ چائے ہی رہی۔ کیسے کیسے چائے سے محبت کرنے والے لوگ کہاں کہاں سے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی چائے تلاش کر کے لاتے تھے اور چائے کے سچے عاشقوں تک اسے پہنچاتے تھے۔ یہ ایسی پاک اور شفاف محبت تھی کہ اس میں رقابت اور حسد کا نام ونشان تک نہ تھا۔ پروانوں کی طرح چائے کے عشاق ایک دوسرے کے ساتھ مل کر پروانہ دار چائے کی شمع پر نثار ہوتے تھے۔

مجھے لاہور کے ایک ایڈووکیٹ پرویز صاحب (شاید یہی نام ہے ان کا) یاد آ رہے ہیں۔ میں نے پرویز صاحب جیسا اعلیٰ نسل کا چائے کا عاشق کم دیکھا ہے۔ مجھے یاد ہے یہ آج سے چند برس پہلے کا واقعہ ہے، میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں بیٹھا تھا۔ ہم اچھی چائے کی جستجو میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس زمانے تک ابھی اچھی چائے لاہور میں ناپید نہیں ہوئی تھی اور اس نے اعلیٰ فائیو سٹار ہوٹلوں میں سیاسی پناہ حاصل کر رکھی تھی۔ ان ہوٹلوں میں چائے کا ایک کپ دس بارہ روپے میں پڑتا تھا جو ہماری استطاعت سے باہر تھا۔ لیکن اعلیٰ رومانٹک چائے کی محبت ہمیں کسی نہ کسی فائیو سٹار ہوٹل میں کھینچ لاتی تھی۔ ہم آپس میں چندہ کر کے چائے کا بل ادا کرتے تھے۔ ان فائیو سٹار ہوٹلوں میں ویٹر چائے کے ساتھ پیسٹری اور سینڈوچز وغیرہ لاتا تو ہم انہیں ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے، شرمندہ سے ہو کر ویٹر سے کہتے تھے کہ بھائی ہم صرف چائے پینے آئے ہیں، یہ غیر ضروری چیزیں لے جاؤ۔ تو اس روز بھی میں اور میرا دوست چندہ کر کے پندرہ بیس روپے جیب میں ڈال کر ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل صرف چائے پینے آئے تھے۔ ہم سوئمنگ پول والی شیشے کی دیوار کے ساتھ لگی میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور چائے سے محبت بھری باتیں بھی کر رہے تھے کہ ایک سنہری بالوں والا خوش لباس شخص ہمارے قریب سے گزرتے ہوئے ہماری میز کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ میری

طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ اے حمید ہی ہیں نا؟''

میں نے کہا۔''جی ہاں۔''

وہ بولا۔''میں نے رسالوں میں آپ کی فوٹو دیکھ رکھی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں سیلون سے بڑی اچھی کوالٹی کی چائے لایا ہوں۔ مجھے کئی روز سے آپ کی تلاش تھی۔ اس لئے کہ آپ چائے کہ عاشق ہیں۔ میں سیلون ٹی کا ایک ڈبہ آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔''

میں اٹھ کر اس باذوق بلکہ اپنے ہم ذوق شخص سے ملا۔ اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام پرویز اختر (شاید یہی نام تھا) ہے۔ میں ایڈووکیٹ ہوں۔ مال روڈ پر میرا دفتر ہے۔ مجھے بتائیں میں سیلون ٹی کا ڈبہ آپ کو کہاں پہنچاؤں؟''

میں نے کہا۔''آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے دفتر کا حدود اربعہ بتا دیجئے۔ میں سر کے بل چل کر خود حاضر ہو جاؤں گا۔''

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میری سیلون کی محبوبہ ایک جگہ میرا انتظار کر رہی ہو اور میں وہاں نہ پہنچوں۔ میں ایک گھنٹے بعد ہی پرویز اختر صاحب کے دولت خانے پر پہنچ گیا۔ مال روڈ پر اخبار''آفاق'' والی بلڈنگ میں ان کا آفس تھا۔ مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور ایک لفافے میں سے سیلون ٹی کا ڈبہ نکال کر مجھے مرحمت فرمایا۔ میں نے سیلون کی چائے کے ڈبے کو دیکھا، اسے چوما، اپنے سینے سے لگایا اور پرویز اختر صاحب سے کہا کہ میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگے۔

''شکریے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ چائے تو آپ کا حق تھا۔ یہ آپ ہی کے پاس پہنچنی چاہیے تھی۔''

کہنے لگے۔''یہاں ایسے ایسے کوڑھ لوگ بھی ہیں کہ میں نے بڑے شوق سے

سیلون کی چائے بنا کر ایک صاحب کو پلائی اور ان سے پوچھا کہ کیسی چائے ہے؟ وہ منہ بنا کر بولے، کڑوی ہے۔ میں اپنا سر پکڑ کر رہ گیا کہ کیا شے میں نے کس کو پلا دی ہے۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی کوئی اعلیٰ نسل کی چائے ہے وہ صرف میرے اور آپ کے لئے بنی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، میں خود بھی سیلون (سری لنکا) آتا جاتا رہتا ہوں اور وہاں میرے دوست بھی ہیں۔ انشاء اللہ یہ چائے اب آپ کو ملتی رہے گی۔"

میں نے گھر آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ چینک اور پیالی گرم پانی سے پاک صاف کر کے ٹرے میں لگا کر اپنے سامنے رکھ لی۔ کیتلی کو بار بار گرم پانی سے دھویا۔ پھر اس میں تازہ پانی ڈال کر اسے چولہے پر رکھ دیا۔ پھر سیلون چائے کے ٹن کو بڑی محبت سے کھولا تو اس میں سے سری لنکا کے جنگلوں کی خوشبو کی پہلی لہر میرے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ ایک رکشہ شور مچاتا، پٹرول کی بُو اڑاتا باہر سے گزر گیا۔ میں نے جلدی سے ٹن کا ڈھکن بند کر دیا۔ اسی دوران کیتلی میں پانی کھولنا شروع ہو گیا تھا۔ ہماری آپو جی (والدہ) کہا کرتی تھیں، لپٹن چائے پینی ہو تو پانی کو تین منٹ تک ابلنے دو۔ ورنہ پانی کچا رہ جائے گا اور چائے اپنی اصل خوشبو چھپا لے گی۔ خدا نے چائے کو بھی بڑی عقل دی ہے۔

جب پانی خوب کھول چکا تو میں نے ڈبے کا ڈھکن کھول کر اس میں سے اندازے سے چائے نکال کر چینک میں ڈالی اور اس سے پیشتر کہ کوئی اور رکشہ شور مچاتا، پٹرول کی بُو اُڑاتا باہر سے گزرے، میں نے جلدی سے ٹن کو بند کر دیا۔ اس کے بعد چینک میں کھولتا پانی ڈال کر چینک پر ٹی کوزی ڈال دی۔

پانچ منٹ کے بعد جب میں نے چینک میں سے سیلون کی چائے کپ میں انڈیلی تو جنوبی سمندروں کی ہوا، بارش میں بھیگتے جنگلوں کی خوشبوئیں لے کر چلنے لگی۔ پھر جب چائے کا پہلا گھونٹ پیا تو جنوبی سمندروں کے سارے جنگل، ان جنگلوں کی ساری بارشیں، ان بارشوں میں بھیگتے سارے پھول، ترناری، رتنا کلی اور کنول کے سارے پھول اور ان کی خوشبوئیں مجھے ساتھ لے کر پرواز کر گئیں۔

ایڈووکیٹ پرویز اختر والی بلڈنگ کے نیچے تہہ خانے میں ایک چھوٹا سا تنگ اور نیم روشن ریستوران تھا جہاں چار پانچ چھوٹی چھوٹی میزوں کے آمنے سامنے کرسیاں لگی رہتی تھیں۔ وہاں میں اور پرویز اختر ہفتے کی شام کو بیٹھ کر سیلون کی چائے پیتے۔

مشہور ناول نگار احمد شجاع پاشا بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ احمد شجاع پاشا بڑا خوش لباس اور خوبصورت جوان رعنا تھا۔ اردو اور یورپ کے ادب پر اس کا مطالعہ بڑا گہرا تھا۔ ہم تینوں وہاں اپنی چائے کی محفل لگاتے۔ اُردو کے اساتذہ اور جدید شعراء اور جدید افسانے اور ناول پر گفتگو ہوتی۔ پنجاب کی صوفیانہ اور لوک شاعری پر باتیں ہوتیں۔ پرویز اختر کو بلھے شاہؒ، شاہ حسینؒ اور وارث شاہ کے کئی اشعار زبانی یاد تھے۔ احمد شجاع پاشا کی پشتو شاعری پر بھی بڑی گہری نظر تھی۔ وہ ہمیں خوشحال خان خٹک اور دوسرے پشتو صوفی شعراء کے کلام کا ترجمہ سناتا۔ یوں وہ چھوٹا سا تنگ و تاریک تہہ خانہ سیلون کی چائے اور پاکستان کے صوفی شعراء کے عارفانہ کلام سے روشن ہو جاتا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ہفتہ وار ادبی محفلیں بھی بکھر گئیں۔ کب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے؟ کب یہ چھوٹا سا، گمنام سا ادبی اور ثقافتی ٹھکانہ ہم سے جدا ہوا؟ یاد کروں بھی تو یاد نہیں آتا۔ بس اب اس گمنام ریستوران کی یاد ہی باقی رہ گئی ہے۔

میں لاہور کے بھولے بسرے ادبی اور ثقافتی ٹھکانوں کا ذکر کر رہا تھا کہ چائے کے ذکر کے ساتھ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ معذرت چاہوں گا۔ وقت کی تیز آندھی میں دوست، دوستوں سے بچھڑ گئے۔ چہرے بدل گئے، محفلیں بکھر گئیں، نقش و نگار بگڑ گئے۔ جن چہروں کو ہم دور سے پہچان لیتے تھے اب قریب آنے پر بھی نہیں پہچانے جاتے۔ پرانے باغ کے راستے خزاں کے زرد پتوں میں چھپ گئے۔ ہر شے میں سے اس کی اصل خوشبو غائب ہو گئی۔ سمندروں، جنگلوں، جنگلوں کی بارشوں، بارشوں میں بھیگتی ہواؤں کی یاد دلانے کے لئے صرف ایک چائے کی خوشبو رہ گئی ہے۔ اب وہ بھی مجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ اب چائے کی جگہ گھاس پیتا ہوں اور چائے کو یاد کرتا ہوں۔

ایڈووکیٹ پرویز اختر بھی نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ میری چائے کا دوسرا ساتھی تمیز حقانی کینیڈا جا کر آباد ہو گیا ہے۔ وہ یہاں ہوتا تھا تو مہینے میں ایک پھیرا سری لنکا کا ضرور لگاتا تھا اور واپسی پر میرے لئے سیلون کی چائے ضرور لاتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا خط آیا۔ کہنے لگا۔

''کینیڈا کی یخ بستہ ہواؤں میں آ گیا ہوں۔ لگتا ہے کسی نے مجھے ڈیپ فریزر میں بند کر دیا ہے۔ لاہور کی گرم دھوپ یاد آ رہی ہے۔ لاہور کی ادبی محفلیں یاد آ رہی ہیں۔ کیا کروں، واپس آنا مشکل نظر آتا ہے۔''

تمیز حقانی بڑا مردِ آہن ہے۔ جان لیوا امراض میں بھی اپنی ذمہ داریاں پوری پوری نبھاتا ہے اور حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہیں لاتا۔ ایک خط میں اس نے لکھا۔

''مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ اب آپ کو سیلون کی چائے کون لا کر دیتا ہو گا۔''

میں نے اسے جوابی خط میں لکھا۔ ''تم میری چائے کی فکر نہ کرو۔ پاکستان کی چائے سیلون کی چائے سے کم نہیں ہے۔''

وہ مطمئن ہو گیا۔ لیکن اب پاکستانی چائے پر بھی زوال آ گیا ہے۔ میں نے گلبرگ میں چائے کے ایک مشہور سٹور کے مالک سے پوچھا کہ پاکستان کی چائے تو بڑی اچھی ہوتی تھی۔ اس چائے نے مجھے سیلون کی چائے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب یہ کیوں خراب ہو گئی ہے؟

اس نے جواب دیا۔

''چائے اب نئی پیکنگ میں آنے لگی ہے۔ لپٹن صاحب تو چائے نئے مالکوں کے حوالے کر کے ولایت چلے گئے۔ اب جب تک یہ نئی پیکنگ قائم رہے گی آپ کو روپے میں سے چار آنے والی چائے پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔''

میں تو چار آنے میں گزارہ کر لوں گا۔ میں تو دو آنے میں بھی گزارہ کر لوں گا۔ لیکن وہ جورو مان کی ایک شہزادی بنگلہ اور سری لنکا کی چائے کی خوشبوئیں لے کر مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی اسے کہاں تلاش کروں گا؟ میں چائے کو گھاس سمجھ کر تو پی لوں گا مگر گھاس

کو چائے سمجھ کر کب تک پیتا رہوں گا؟

غالب کا ایک شعر ذرا سی تحریف کے ساتھ بے اختیار یاد آ گیا ہے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہے
اک چائے رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۞......۞

لاہور کی نگینہ بیکری کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ یہ بیکری نہیں بلکہ چائے کی ایک دکان تھی۔ ہوسکتا ہے کبھی یہاں کیک، بسکٹ وغیرہ تیار ہوتے ہوں۔ لیکن تقسیم کے بعد جب مجھے اس بیکری میں جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت یہ چائے کی ایک لمبی دکان تھی جس کے اندر ہلکا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ دکان کے آدھے دروازے میں انگیٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک انگیٹھی پر بڑے توے پر قیمے کی ٹکیاں پکائی جاتی تھیں اور دوسری انگیٹھیوں پر سبزی، ترکاری اور چائے وغیرہ تیار ہوتی تھی۔ باہر سے دیکھنے پر یہی لگتا تھا کہ یہ ہوٹل ٹائپ کی دکان ہے۔ انگیٹھیوں کے بالکل قریب سے ہوکر دھوئیں میں سے گزر کر اندر بیکری میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ تھوڑا تھوڑا دھواں اندر بھی پھیلا رہتا تھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت دوسری جنگ عظیم کے شروع میں جب ''فوجی اخبار'' کے نائب مدیر ہوکر دلّی چلے گئے تو ان کے جانے سے عرب ہوٹل کی محفل ختم ہوگئی اور کچھ لوگ وہاں سے اٹھ کر نگینہ بیکری میں آگئے۔ جس زمانے میں، میں نے نگینہ بیکری دیکھی اس زمانے میں یہاں مولانا صلاح الدین احمد، عبداللہ قریشی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور عاشق حسین بٹالوی بیٹھا کرتے تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کے قیام اور ان ریستورانوں کے قریب ہونے کی وجہ سے نگینہ بیکری میں وہ رونقیں نہ رہیں جو کہتے ہیں قیام پاکستان سے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ چونکہ پنجاب یونیورسٹی اور میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج قریب ہی تھے چنانچہ ان علمی اداروں کے اکثر پروفیسر صاحبان بھی نگینہ بیکری میں اکثر آتے تھے اور علمی ادبی موضوعات پر بحث مباحثے ہوتے تھے۔

کہتے ہیں نگینہ بیکری یو پی کے ایک صاحب ذوق شخص نے 1926ء میں قائم کی تھی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ ضرور یو پی کے شہر نگینہ کے رہنے والے ہوں گے۔ نگینہ کے ریلوے سٹیشن سے میں کلکتے جاتے ہوئے کئی بار گزرا تھا اور مجھے اس سٹیشن کا نام بڑا اچھا لگا کرتا تھا۔

لاہور میں ایک اور بھولا بسرا ادبی ٹھکانہ ہوا کرتا تھا جس کا نام بھی اب لوگ شاید بھول گئے ہیں۔ اس ریستوران کا نام "منزل" تھا اور یہ لاہور کے موچی دروازے کے باہر جو گھاٹی نیچے کو المنڈی کو اترتی ہے اس کے شروع میں ہی واقع تھا۔ یہ ریستوران ایک دو منزلہ مکان تھا جس کے نیچے ایک کشادہ کمرے کو ریستوران میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ منزل ریستوران کا مالک ایک خوش شکل جوان رعنا تھا جس کے متعلق اب معلوم ہوا ہے کہ وہ مشہور شاعر جناب احسان دانش کا شاگرد تھا۔ ریستوران میں داخل ہوں تو دروازے میں ہی ایک طرف کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اندر دکان نما کمرے میں چند ایک کرسیاں اور میز لگے رہتے تھے جہاں بیٹھ کر لوگ چائے پیتے تھے۔ اس ریستوران کی دوسری منزل میں ایک بڑا سا کمرہ تھا جہاں ادبی محفلیں لگا کرتی تھیں۔ تقسیم سے پہلے میں پہلی بار سیف الدین صاحب کے ساتھ یہاں آیا تھا اور میں نے دیکھا تھا کہ کمرے میں باری علیگ صاحب اور سعادت حسن منٹو اور ابو سعید قریشی پہلے سے موجود تھے اور کسی ادبی موضوع پر گرم جوشی سے بحث ہو رہی تھی۔ کونے میں ایک چھوٹی سی میز لگی تھی جس کی کرسی پر دیوار کی طرف منہ کر کے ایک گورا چٹا شخص بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا دوست حسن عباس ہے۔ سیف صاحب اس سے باتیں کرنے لگے تو میں بھی پاس کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حسن عباس نے آدھا صفحہ لکھ رکھا ہے۔ لکھائی بڑی خوبصورت تھی۔ سیف صاحب نے ان سے پوچھا۔

"کیا لکھا جا رہا ہے؟"

حسن عباس نے خوبصورت شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ادبی دنیا رسالے کے لئے ایک افسانہ لکھ رہا ہوں۔''

امرتسر سے لاہور میرا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک بار میں ظہیر کاشمیری اور انگریزی کے پروفیسر علاؤ الدین کلیم کے ساتھ لاہور آیا تو ہم سیدھا منزل ہوٹل آ گئے۔ یہاں پہلی منزل والے کمرے میں چائے کی محفل لگی ہوئی تھی۔ محفل میں سعادت حسن منٹو، حسن عباس اور ابوسعید قریشی ترقی پسند ادب پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس بحث میں ظہیر کاشمیری اور علاؤ الدین کلیم بھی شامل ہو گئے۔ میرا کام صرف ان لوگوں کی باتیں سننا تھا۔ دائیں جانب ایک میز پر دو تین شاعر بیٹھے چائے پیتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنا تازہ کلام سنا رہے تھے۔ میرا ایک کان ان کی طرف تھا اور ایک کان سے میں ترقی پسند ادب پر نامور افسانہ نگاروں اور ظہیر کاشمیری کی گفتگو سن رہا تھا۔ چنانچہ نہ پوری طرح شعراء حضرات کا کوئی شعر میرے پلے پڑ رہا تھا اور نہ ترقی پسند ادب پر بحث مباحثہ میری سمجھ میں آ رہا تھا۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں شاید شاعر اقبال کوثر کے ساتھ امرتسر سے منزل ہوٹل میں آیا تو گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم ریستوران میں آ کر بیٹھے ہی تھے کہ بڑے زور کی آندھی چلنے لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہر شے اپنے وقت اور قدرت کی مرضی کے مطابق وقوع پذیر ہوتی تھی۔ آندھی کی بھی ایک خاص آواز اور ایک خاص خوشبو ہوتی تھی۔ آندھی آنے سے پہلے ہوا ساکت ہو جاتی تھی۔ پتہ چل جاتا تھا کہ آندھی آنے والی ہے۔ پھر ہوا کے تیز تھپیڑوں میں درختوں کی شاخیں ایک دم سے نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے اور دائیں بائیں جھولنے لگتی تھیں۔ اوپر مکانوں کے آنگنوں میں برتنوں کے گرنے کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ دکانوں کے بورڈ گرتے تھے۔ مکانوں کے چھپر اڑتے تھے۔ گرد کے بگولے گلی محلوں، سڑکوں کی مٹی اُڑانے لگتے تھے۔ اس گرد میں مٹی کی، زمین کی خوشبو ہوتی تھی۔ اس روز بھی جب ہم منزل ہوٹل میں بیٹھے ادب اور کلچر پر بحث کر رہے تھے تو آندھی کے تھپیڑے موچی دروازے کے باہر کی سڑکوں کی گرد لے کر ریستوران میں داخل ہو رہے تھے۔ آندھی کا زور ختم ہوا تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو

گئی۔ اب زمین کی خوشبو کے ساتھ موچی دروازے کے باہر باغ اور باغ کے درختوں کی ہلکی خوشبو بھی شامل ہوگئی تھی۔ مجھے جب بھی منزل ہوٹل کا خیال آتا ہے تو اس روز چلنے والی آندھی اور آندھی کے بعد کی بارش اور اس کی ساری خوشبوئیں یاد آجاتی ہیں۔ افسوس کہ منزل ہوٹل زیادہ دنوں تک ادب، آرٹ اور ثقافت کی سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکا اور بند ہوگیا۔

لوہاری دروازے سے انارکلی میں داخل ہوں تو کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب ایک ریستوران آتا ہے جس کا نام ممتاز ہوٹل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ ہوٹل اتفاق سے نامور ادیبوں، شاعروں اور ناقد حضرات کا مرکز بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جن پبلشنگ اداروں نے اس زمانے میں پاکستانی ادب کی بنیادیں استوار کیں اور پاکستان کے اُردو ادب کو کلاسیکی عروج کے مقام تک پہنچایا، ان اداروں کے دفاتر ممتاز ہوٹل کے آس پاس ہی تھے۔ ان اداروں میں مکتبہ اُردو، مکتبہ جدید، نیا ادارہ، گوشۂ ادب، آئینۂ ادب اور ادارہ فروغ ادب کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ ان اداروں نے شعر و ادب اور تنقید ادب کی جو خوبصورت اور باوقار کتابیں شائع کیں انہیں آج پاکستانی اُردو ادب میں کلاسیکی مقام حاصل ہے اور ان کے حوالے کے بغیر ادب کی کوئی تاریخ، کوئی تحقیق مکمل نہیں کہلائی جاسکتی۔ ان اداروں کو اُردو کے صف اول کے ادیبوں، تنقید نگاروں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا۔ ان اشاعتی اداروں نے اس زمانے میں جبکہ پرنٹنگ کو آج کی جدید سہولتیں میسر نہیں تھیں، لیتھو پر ایسی کتابیں چھاپیں کہ لفظ موتی پروئے ہوئے لگتے ہیں۔ مکتبہ اُردو کے ماہوار جریدے ''ادب لطیف'' نیا ادارہ کے رسالے ''سویرا'' کو برصغیر میں ادب کا بلند ترین درجہ حاصل تھا۔ اس زمانے میں ان اشاعتی اداروں کی گہما گہمی اور سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ صبح سے شام تک یہاں صف اول کے شعراء اور ادباء کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ قریب ترین ہوٹل یا ریستوران چونکہ ممتاز ہوٹل ہی تھا اس لئے ان ادیبوں میں سے اکثر ادیب اور شاعر کچھ دیر کے لئے ہی سہی، ممتاز ہوٹل، میں ہی آکر بیٹھتے تھے۔ ممتاز ہوٹل کا ماحول شعر و ادب پر گفتگو کے واسطے موزوں

نہیں تھا۔ اس ہوٹل کے مالک کو موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا اور یہاں کی فضا فلمی ریکارڈوں کی موسیقی سے گونجتی رہتی تھی اور ہمیں ذرا اونچی آواز میں ایک دوسرے سے بات کرنی پڑتی تھی۔ لیکن ایک تو یہ بات تھی کہ ادیبوں کے بیٹھنے کے لئے قرب و جوار میں کوئی دوسرا ریستوران نہیں تھا۔ دوسرے ممتاز ہوٹل کی چائے پیسٹری وغیرہ بے حد مزے دار اور تازہ ہوتی تھی۔ یہ اشاعتی ادارے بذاتِ خود فروغ ادب، آرٹ اور کلچر کے بہت بڑے مرکز اور سرچشمے تھے۔ ان کی وجہ سے ممتاز ہوٹل ادیبوں کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ بن گئی تھی۔

اس ہوٹل میں صبح سے شام تک فلمی گانوں کے ریکارڈ بجتے رہتے تھے۔ ہوٹل کے مالک نے جو ایک مرنجاں مرنج اور کم سخن شخصیت کا مالک بھی تھا، کاؤنٹر پر اپنے پاس ہی میز پر ریکارڈوں کی ڈھیریاں لگا رکھی تھیں۔ ایک ریکارڈ ختم ہوتا تھا تو وہ دوسرا ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ وہ فلمی گانے صرف گاہکوں کو ہی نہیں سناتا تھا بلکہ خود بھی بڑے شوق سے سنتا تھا اور کسی گانے پر بے اختیار سر ہلانے لگتا تھا۔ اسے موسیقی کا شوق بھی تھا اور اس کی کسی حد تک سمجھ بھی تھی۔ اس شخص میں ایک اور اچھی بات یہ تھی کہ ہمارے کہنے پر لاؤڈ سپیکر کی آواز مدھم بھی کر دیتا تھا۔ بعد میں وہ ادیبوں اور شاعروں کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر خود ہی سپیکر کی آواز کم کر دیتا تھا۔

میں، ابن انشا اور احمد راہی تو تقریباً ہر روز ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کے دفاتر میں جاتے تھے اور اپنی کسی پرانی کتاب کے واجبات وصول کرنے کے بعد یا کسی افسانے یا نظم کا معاوضہ لے کر سیدھے ممتاز ہوٹل آ جاتے تھے اور خوب مزے سے کیک پیسٹری اڑاتے تھے۔ ہماری سب سے بڑی عیاشی یہی ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک روز ساحر لدھیانوی بھی میرے ساتھ تھا۔ ساحر لدھیانوی کی کتاب ''تلخیاں'' کے نئے ایڈیشن کے بیس روپے شاید نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر احمد صاحب کی طرف نکلتے تھے اور میں ''سویرا'' کے لئے ایک افسانہ لکھ کر لایا تھا۔ چودھری صاحب نیا ادارہ کے دفتر میں بڑے انہماک سے کارڈ لکھ رہے تھے، ہمیں دیکھ کر حسب عادت مسکرائے اور

کہا۔

''یہ جوڑیاں کہاں سے آئی ہیں خیر تال۔''

میں نے کہا۔''چودھری صاحب! میں نیا افسانہ لکھ کر لایا ہوں اور ساحر لدھیانوی کی تلخیاں کے کچھ پیسے آپ کی طرف رہتے ہیں۔''

چودھری صاحب ہنس کر کہنے لگے۔

''یار! کبھی ویسے بھی ملنے آ جایا کرو۔''

چودھری صاحب سے ہمارا دوستانہ بھی تھا۔ ان سے ہماری بڑی بے تکلفی تھی۔ چودھری صاحب بڑے خوش مزاج، فراخ دل اور دوست نواز تھے۔ بہت اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ طباعت میں تو ان کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ انہیں اچھے شعر اور اچھے افسانے کی بھی کمال کی پہچان تھی۔ ان کے پاس جب پیسے ہوتے تھے تو اسی وقت دے دیتے تھے۔ نہیں ہوتے تھے تو خالی جیب دکھا کر صاف کہہ دیتے تھے۔

''دوستو! آج تو میری جیب خالی ہے۔ کل آ کر بے شک لے جانا۔''

اس روز چودھری صاحب کے پاس پیسے موجود تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی وقت ساحر لدھیانوی کو اور مجھے پیسے دے دیئے اور ہم وہاں سے اٹھ کر سیدھے ممتاز ہوٹل آ گئے۔ چائے کے ساتھ پیسٹری کا بھی آرڈر دے دیا۔ اس دوران احمد راہی بھی آ گیا۔ کہنے لگا۔

''اوئے کمینو! تم یہاں چھپ چھپ کر عیش کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے۔''

وہ بھی ہماری منڈلی میں شامل ہو گیا اور ہم دیر تک چائے پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں احمد راہی رسالہ ''سویرا'' کا ایڈیٹر تھا۔ وہ ہمارا یار غار بھی تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے میری اور ابن انشاء کی جیبیں خالی تھیں اور ممتاز ہوٹل کی چائے پیسٹری کو بڑا جی کر رہا تھا۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

''کوئی ترکیب لڑاؤ۔''

میں نے اسے ایک ترکیب بتائی تو وہ خوش ہو کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ ٹھیک ہے۔ چلو یا شیخ! لوہاری دروازے کی طرف۔''

رسالہ ''ادب لطیف'' کا دفتر لوہاری دروازے کے باہر مکتبہ اردو کے پاس ای رسالہ ''سویرا'' کی بلڈنگ میں دوسری منزل پر ہوتا تھا۔ ہم سیدھا رسالے کے ایڈیٹر کے پاس پہنچ گئے۔ ایڈیٹر خود بھی مشہور ادیب تھا۔ میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے ایک دفعہ مجھے پچھلے تین برس کے ادب کا انتخاب مرتب کرنے کے لئے کہا تھا۔ ان دنوں مجھے فرصت نہیں تھی۔ اب میں فارغ ہوں اور حُسنِ اتفاق سے ابن انشاء کو بھی ان دنوں فراغت ہے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کیوں نہ ہم دونوں آپ کے ادارے کے لئے گزشتہ تین چار سالوں کے ادب کا انتخاب مرتب کر دیں۔ میں افسانوں کا انتخاب کرلوں گا اور ابن انشاء غزلوں اور نظموں کا انتخاب مرتب کر دے گا۔''

''آپ دونوں اگر یہ کام کر دیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ چودھری برکت علی صاحب بھی بڑے خوش ہوں گے۔''

مجھے معلوم تھا کہ اس سلسلے میں ہمیں کچھ رقم ایڈوانس دیتے ہوئے شاید یہ لوگ ہچکچائیں یا بات کل پرسوں پر ڈال دیں جبکہ ہمیں ممتاز ہوٹل کی چائے اور پیسٹری کی بے حد طلب ہو رہی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ ''ادب لطیف'' کے دفتر کی ایک کوٹھڑی میں ادبی رسالوں کی ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں جن میں انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کے ادبی رسالے کافی تعداد میں تھے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''اس کے لئے ہمیں گزشتہ تین برس کے مختلف ادبی رسالوں کی ضرورت پڑے گی۔''

ایڈیٹر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ہمارے پاس گزشتہ چار سال سے مختلف ادبی رسالوں کا

ذخیرہ موجود ہے۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔

''بس تو پھر سمجھیں کہ مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ ہم آج ہی سے بلکہ ابھی سے اس پراجیکٹ پر ریسرچ ورک شروع کر دیتے ہیں۔ کیوں ابن انشاء!'' میں نے ابن انشاء سے پوچھا۔

ابن انشاء کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔ وہ بڑا اپکا منہ بنا کر بولا۔

''بالکل، بالکل! ہمیں اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ شاعر اور ادیب تو روزانہ تھوک کے حساب سے افسانے اور غزلیں لکھ رہے ہیں۔''

ایڈیٹر صاحب ہمیں اسی وقت ساتھ والی کوٹھڑی میں لے گئے اور ادبی رسالوں کے ڈھیر دکھا کر کہا۔

''آپ یہ سارے رسالے بے شک ابھی اٹھا کر لے جائیں۔''

میں فوراً نیچے اتر کر بازار میں آ گیا۔ ابن انشاء اوپر ہی بیٹھا رہا اس خیال سے کہ کہیں ایڈیٹر کسی وجہ سے اپنا ارادہ نہ تبدیل کر دے۔ میں نے ایک تانگہ لے لیا۔ ایک مزدور کو ساتھ لے کر اوپر ادب لطیف کے دفتر میں آیا۔ ادبی رسالوں کی دو تین ڈھیریاں اٹھوا کر نیچے تانگے میں رکھوا دیں۔ ایڈیٹر صاحب بولے۔

''باقی رسالے بھی لے جائیں۔ کوئی غزل یا افسانہ جو واقعی اچھا ہو، رہ نہ جائے۔''

میں نے کہا۔ ''فکر نہ کریں۔ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ اور پھر انتخاب پر ہم دونوں کا نام جائے گا۔ ہمیں اپنے نام کی بھی عزت رکھنی چاہئے۔''

ابن انشاء نے سر ہلاتے ہوئے میری تائید کی اور کہا۔ ''یہ تو ہے۔''

ادبی رسالوں کا ڈھیر ہم نے تانگے کے آگے رکھوا دیا اور خود بھی سوار ہو گئے۔ میں نے تانگے والے سے کہا۔

''لوہاری کے اندر چلو۔''

مجھے معلوم تھا کہ تھوک کے بھاؤ ردی خریدنے اور بیچنے والوں کا اڈہ لوہاری

دروازے کے گندے تالے پر ہے۔ چنانچہ ہم تانگہ لے کر لوہاری دروازے آ گئے۔ میں اتر کر گندے تالے پر گیا۔ وہاں ایک کوٹھڑی کے باہر لوہے کے بڑے تکڑ پر ردی تولی جا رہی تھی۔ میں نے اس کے مالک سے کہا۔

''کچھ رسالے ردی میں بیچنے ہیں۔ آپ کیا بھاؤ لیں گے؟'' میں نے مزید کہا۔

''بڑے اچھے ادبی رسالے ہیں۔ ان میں بڑی معیاری غزلیں اور نظمیں اور افسانے چھپے ہوئے ہیں۔''

ردی کے تاجر نے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔

''مال دکھا دیں۔''

تانگے کے پاس آ کر اس نے ایک رسالہ اٹھا کر اسے جھاڑ کر دیکھا۔ پھر ہاتھ پر ہی اوپر نیچے کر کے اس کا وزن کیا اور بولا۔

''چھ آنے سیر سارا لاٹ خرید لوں گا۔ منظور ہو تو بتا دو نہیں تو آگے جاؤ۔''

ابن انشاء فوراً بولا۔

''جی تو نہیں چاہتا مگر سخت مجبوری ہے۔ آپ چھ آنے سیر کے بھاؤ سارا مال اٹھا لیں۔''

ہم نے سارے ادبی رسالے جن میں اس زمانے بلکہ ہر زمانے کے مشہور و معروف ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات چھپی ہوئی تھیں چھ آنے سیر کے حساب سے بیچ دیئے اور جو چند ایک روپے ملے وہ جیب میں ڈال کر سیدھے ممتاز ہوٹل آ گئے۔ ابن انشاء کہنے لگا۔

''یار! میرا خیال ہے ریسرچ ورک شروع کر دینا چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور، ضرور۔''

اس وقت دن کے دو بج رہے تھے اور ہمیں بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً مرغ پلاؤ، چکن کری اور فرنی کا آرڈر دے دیا۔ خوشبو دار کھانے آئے تو ہم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ریسرچ ورک شروع کر دیا۔ اس کے بعد ملائی والی چائے پی اور

اپنی پسند کے ریکارڈ لگوا لگوا کر مزے سے فلمی گانے سنتے رہے۔ ادب لطیف کے ایڈیٹر نے ایک دو بار پوچھا کہ انتخاب کا کام کہاں تک ہو گیا ہے؟ ہم نے کہا کہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ایک ایک ادب پارے کو منتخب کرنے سے پہلے کئی کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔''

رسالہ ''سویرا'' کا دفتر لوہاری دروازے سے شفٹ ہو کر میکلوڈ روڈ پر چوک لکشمی کی گیتا بھون بلڈنگ میں آیا تو یہ آفس ادیبوں، شاعروں کا مرکز بن گیا۔ حبیب جالب سے میری پہلی ملاقات اس بلڈنگ کی سیڑھیوں میں ہوئی۔ بلڈنگ کی پہلی منزل کی سیڑھیاں جہاں ختم ہوتی تھیں اور دوسری منزل کی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں تو وہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ حبیب جالب اس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ شاید لائل پور سے نیا نیا لاہور آیا تھا۔ اس کی غزلیں اور میرے افسانے ادبی رسالوں میں چھپتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی ہمارے فوٹو بھی چھپ جاتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کی شکل صورت سے آشنا تھے۔ حبیب جالب مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سیاہ چمکیلے بال، کشادہ پیشانی، چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، چہرے پر گہری سنجیدگی کے ساتھ بے معلوم سی مسکراہٹ، لہجے میں ضلع ہوشیار پور کی پنجابی کا شیریں امتزاج، گفتگو میں مزاح کے ساتھ طنز کا رنگ نمایاں۔ مجھے حبیب جالب سے مل کر واقعی بڑی خوشی ہوئی اور ہم بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اس زمانے میں وہ خالص غزل کا شاعر تھا اور بڑی دل گداز رومانوی غزلیں لکھتا تھا۔

پھر دل سے آ رہی ہے صدا اس گلی میں چل
شاید ملے غزل کا پتہ اس گلی میں چل
اس پھول کے بغیر بہت جی اُداس ہے
مجھ کو بھی ساتھ لے کے صبا اس گلی میں چل
وہ بام و در وہ لوگ وہ رسوائیوں کے زخم

ہیں سب کے سب عزیز جدا اس گلی میں چل

ضلع ہوشیار پور کی رنگین فضاؤں سے ہجرت کا زخم اس کے دل میں ابھی تازہ تھا۔

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

محبت کی رنگینیاں چھوڑ آئے
تیرے شہر میں اک جہاں چھوڑ آئے
پہاڑوں کی وہ مست و شاداب وادی
جہاں ہم دل نغمہ خواں چھوڑ آئے
وہ سبزہ، وہ دریا، وہ پیڑوں کے سائے
وہ گیتوں بھری مستیاں چھوڑ آئے
بہت دور ہم آ گئے اس گلی سے
بہت دور وہ آستاں چھوڑ آئے
بہت مہرباں تھیں وہ گل پوش راہیں
مگر ہم انہیں مہرباں چھوڑ آئے
بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں
نشیمن سرِ گلستاں چھوڑ آئے
چلے آئے ان راہ گزاروں سے جالب
مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

''سویرا'' کے میکلوڈ روڈ والے دفتر میں تقریباً ہر وقت ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ابن انشاء، احمد راہی، عارف عبدالمتین، عبدالمجید بھٹی، ظہیر کاشمیری، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، حبیب جالب، م حسن لطیفی، عبدالحمید عدم، منیر نیازی، شاد امرتسری، عبداللہ ملک، ان سب کا ''سویرا'' کے دفتر میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

''سویرا'' کے دفتر کے نیچے پہلی منزل میں میکلوڈ روڈ کے رخ پر ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ (شاید وہ اب بھی ہو) اس کا نام پیراڈائز ریسٹورنٹ تھا۔ چائے پینے

کے لئے ہم سبھی ادیب شاعر نیچے پیراڈائز ریسٹورنٹ میں آ جاتے۔ اس ریستوران کا مالک سنہری بالوں والا، ایک دبلا پتلا نوجوان تھا جو ہمیشہ پتلون قمیض یا انگریزی سوٹ پہنے ہوتا۔ ادیبوں کا ہجوم ریستوران میں آ کر بیٹھنے لگا تو یہ ریستوران بھی ایک طرح سے ادبی مرکز بن گیا۔ ادیبوں، شاعروں کے مداح بھی آنے لگے۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ میں چوبیس گھنٹے رونق رہنے لگی۔ حسب عادت ہم لوگ نقد چائے بھی پیتے، کھانا بھی کھاتے اور پیسے نہ ہوتے تو ادھار بھی شروع ہو گیا۔ ہمارا ہوائی رزق ہوتا تھا۔ جب کبھی کسی ادبی تخلیق کا معاوضہ ملنے میں دیر ہو جاتی تو ادھار وقت پر ادا نہیں ہوتا تھا۔ ریستوران کا مالک کچھ دیر تو خاموش رہتا۔ پھر دبی زبان میں تقاضے شروع ہو جاتے۔ آدمی شریف تھا۔ اونچی آواز میں تقاضا کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ تنگ آ کر اس نے واجبات کی وصولی کا ایک انوکھا مگر کسی حد تک خطرناک لیکن پُر اثر طریقہ اختیار کیا۔ اس نے ریستوران کے دروازے پر ایک سیاہ تختہ لگا دیا جس کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

''وہ ادیب جنہوں نے چھ ماہ سے ہوٹل کا بل ادا نہیں کیا''۔

اور نیچے ان ادیبوں اور شاعروں کے نام لکھ دیئے۔ ساتھ ہی ان کے ذمے جو رقم واجب الادا تھی، وہ بھی لکھ دی۔ اس کا فوری ردعمل ہوا اور جن ادیبوں کے نام تختہ سیاہ پر درج تھے انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے بل ادا کر دیئے۔ اس مذموم حرکت پر احتجاج بھی کیا۔ ریستوران کا مالک ادیبوں کی زندگی کے معمولات سے واقف نہیں تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ ادیبوں کے شب و روز اس طرح گزرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریستوران کے دروازے والا تختہ سیاہ تو اُتر گیا مگر اس کے ساتھ ہی ادیبوں، شاعروں نے وہاں اٹھنا بیٹھنا بند کر دیا اور ان قلندر ادیبوں نے میکلوڈ روڈ کے ایک دوسرے ریستوران میں بیٹھنا شروع کر دیا جس کا نام کوالٹی ریسٹورنٹ تھا اور جو میکلوڈ روڈ پر ریجنٹ سینما کے بالکل سامنے تھا۔ میں اسے کوالٹی ریستوران کے مالک کی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ یہ ہوٹل کسی وجہ سے بند ہو گیا اور وہاں فرنیچر کی دکان کھل گئی۔ وگرنہ اس

ہوٹل کے دروازے پر بھی ایک تختہ سیاہ ضرور لگ جاتا۔

کوالٹی ریسٹورنٹ کے ساتھ ہی ایک ریستوران تھا جس کا نام ''تسکین'' تھا۔ مشہور شاعر سیف الدین سیف کی رہائش گاہ اس ریسٹورنٹ والی بلڈنگ میں ہی تھی۔ چنانچہ اب تسکین ریسٹورنٹ ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ بن گیا۔ سیف الدین سیف اس ریستوران میں لگنے والی محفلوں میں میر مجلس تھے۔ ان ادبی محفلوں میں بیٹھنے والے ادیب اور شاعر ادب برائے ادب کے نظریئے کے قائل تھے۔ چنانچہ قدرتی طور پر ترقی پسند ادیب اس ریستوران کا بہت کم رخ کرتے۔ میں چونکہ سیف صاحب کے مداحین میں سے تھا اس لئے دن میں ایک بار وہاں ضرور جاتا۔ سیف صاحب کی دل میں اتر جانے والی خوبصورت باتیں سنتا اور جب وہ اپنی کوئی نظم سنانا شروع کرتے تو میں ہمہ تن گوش ہو جاتا۔

ان دنوں سیف صاحب کی طویل نظم ''ساربان'' کا بڑا چرچا تھا۔ یہ نظم آج بھی اُردو شاعری میں ایک بلند اور کلاسیکی مقام رکھتی ہے۔ ساربانوں کا ایک قافلہ وادی گل پوش میں آ کر خیمہ زن ہوتا ہے۔ ایک دوشیزۂ صحرا دور سے ان خیموں کو دیکھ کر اپنی سہیلی سے کہتی ہے۔

سنبلہ! دیکھ ریگ زار کے پار
دیو داروں کی اس قطار کے پار
کچھ مسافر دکھائی دیتے ہیں
قہقہے بھی سنائی دیتے ہیں
کس کے خیمے یہاں لگائے ہیں؟
کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

اس کا جواب نوجوان خانہ بدوش ساربان یوں دیتا ہے ۔

صبح کا نور شب کے سائے ہیں
کیا خبر ہم کہاں سے آئے ہیں

عہدِ ماضی سے آنے والے ہیں
دورِ فردا کو جانے والے ہیں
کتنے پُرہول ریگ زاروں سے
کتنے یخ بستہ کوہساروں سے
یوں چلے جس طرح صبا گزرے
بارہا آئے، بارہا گزرے

☆☆☆

ریگزاروں سے جب گزرتے ہیں
خامشی کے بھنور لپکتے ہیں
دشت و صحرا، اُجاڑ سہمے ہوئے
دور کالے پہاڑ سہمے ہوئے
ہر طرف ایک بیکراں چپ چاپ
بڑھتا جاتا ہے کارواں چپ چاپ

☆☆☆

مصر و یونان کے پری خانے
بابل و نینوا کے افسانے
ذکر پریوں کی داستانوں کا
ساحروں کے طلسم خانوں کا
دیکھتے ہیں جھکے ہوئے بادل
اجنبی شاہ زادیوں کے محل
جن پہ آسیب چھائے رہتے ہیں
رہنے والوں کے سائے رہتے ہیں
آنکھ محروم سقف، زینوں کی

راہ تکتی ہوئی مکینوں کی
سحر منقوش ہے جبینوں پر
خواب کی مہر شہ نشینوں پر

چائے کا دور چل رہا ہوتا۔ سیف صاحب ایک جذب میں ڈوبے نظم سنا رہے ہوتے تھے۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں بھی کسی قافلے سے بچھڑا ہوا خانہ بدوش ہوں، جو خواب میں دیکھی ہوئی کسی اجنبی صحرائی شہزادی کی تلاش میں ریگ زاروں اور مصر و یونان کے ویران کھنڈروں میں بھٹک رہا ہوں۔

◎......◎

ٹیلی ویژن پر ان دنوں پاکستان کی بہت بڑی گلوکارہ ملکہ ترنم نور جہاں کی برسی منائی جا رہی ہے۔ اور کیسی کیسی بری گانے والیاں نہ جانے کہاں کہاں سے نکل کر سامنے آ رہی ہیں اور اپنی بے سُری آوازوں میں ملکہ ترنم کے گائے ہوئے گانوں کا حلیہ بگاڑ رہی ہیں۔

پروگرام کے دوران کبھی کبھی جب ٹی وی کے پروڈیوسر کو خیال آ جاتا ہے کہ یہ ملکہ ترنم کی برسی کا پروگرام ہے تو وہ ازراہ عنایت نور جہاں کی گائی ہوئی کوئی غزل لگا دیتے ہیں تو نور جہاں کی نقل اتارنے والوں اور والیوں کے عیب اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں اور میں نور جہاں کی نقل اتارنے والیوں کا گانا ٹی وی کی آواز بند کر کے سنتا ہوں۔

گزشتہ دنوں برسی والے پروگرام میں ہی نور جہاں کی آواز میں احمد فراز کی غزل سنی تو احمد فراز بہت یاد آیا۔

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

احمد فراز کی غزل کا مطلع میں اسی کو مخاطب کر کے سنانا چاہتا ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہفتے دس دن میں احمد فراز سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ تب خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک وہ زمانہ آئے گا جب مہینے گزر جائیں گے، سال گزر جائیں گے اور اپنے پرانے اور پیارے دوستوں سے ملنا نہیں ہوگا۔ کبھی کبھار وہ ٹیلی ویژن پر نظر آ جاتا ہے اور دل کو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ اب بھی خوبصورت اور رومان انگیز ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ احمد فراز کو اسی طرح خوبصورت اور رومان انگیز رکھے۔

تنہائی میں جب بیتے ہوئے دنوں کا خیال آتا ہے اور کتاب ماضی کے ورق الٹتا ہوں تو کیسے کیسے یگانہ روزگار لوگ یاد آتے ہیں۔ لاہور سے گوجرانوالہ جاتے ہوئے گوجرانوالہ کے قریب جی ٹی روڈ کی دائیں جانب چھوٹی سی پکی سڑک کھیتوں کے بیچوں بیچ دور ایک قصبے کو جاتی ہے۔ اب تو اس سڑک کا بھی حلیہ بدل گیا ہوگا۔ کبھی یہ سڑک سرسبز و شاداب کھیتوں میں سے بل کھاتی ہوئی گزرتی ہوئی ایک مردم خیز تاریخی قصبے ایمن آباد کو جاتی تھی۔ یہ میں سن 50-1949ء کی بات کر رہا ہوں۔ ہم امرتسر سے ہجرت کر کے آئے تھے اور خانہ بدوشوں والی زندگی بسر کر رہے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ ہمیں ایمن آباد میں ایک حویلی الاٹ ہوگئی۔ ایمن آباد کی پُرسکون، آموں کے باغوں اور سرسوں کے پھولوں سے لہلہاتے کھیتوں کی فضا میں پہنچ کر میں لاہور کو تقریباً بھول گیا۔ ہفتے میں چھ دن ایمن آباد میں گزارتا اور ایک دن کے لئے لاہور آ جاتا۔ ایمن آباد کے لوگوں کی محبتیں، مہمان نوازی اور حُسن سلوک میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ اس حسین اور مردم خیز قصبے کی سرزمین نے بڑے کمال کے ہنرمند، انجینئر، علماء کرام اور ادیب پیدا کئے ہیں۔ ایمن آباد میں جن نادر اور یگانہ روزگار شخصیتوں سے مجھے شرف ملاقات رہا ان میں صرف ایک شخصیت کا یہاں ذکر کروں گا۔ ان کا نام نامی محمد سلیم تھا۔ ایمن آباد کے قدیم اور علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ علومِ ظاہری اور باطنی پر عبور حاصل تھا۔ پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ عربی اور فارسی ادب کے علاوہ اُردو شعر و ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ غضب کے بذلہ سنج تھے اور بڑی خوبصورت باتیں کرتے تھے۔ ان کی جو بات مجھے بہت پسند تھی وہ یہ تھی کہ سلیم صاحب اچھی اور اعلیٰ چائے پیتے تھے اور کم پیتے تھے۔ اچھی چائے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے۔ سہ پہر چار بجے ان کے چائے پینے کا خاص وقت ہوتا۔ میں اس وقت ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہو جاتا تھا۔ مکان کی بیٹھک میں وہ خود بڑے سلیقے اور احتیاط کے ساتھ چائے بناتے۔ اس دوران وہ گلاب، موتیے یا گیندے کے کچھ پھول ایک پلیٹ میں ڈال کر ضرور درمیان میں رکھ لیتے تھے۔ چائے پیتے ہوئے وہ کبھی مولانا رومی اور شیخ

سعدی کے اشعار سناتے، کبھی مولانا حالی کی مسدس کے کچھ بند سناتے۔ محب وطن تھے۔ ان کی بیٹھک میں قائداعظم اور علامہ اقبال کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ علامہ اقبال کی فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کی کوئی نظم تحت اللفاظ پڑھتے اور علامہ اقبال کی شاعری کے اسرار و رموز پر عالمانہ گفتگو شروع ہو جاتی۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر ان کی علم افروز باتیں سنتا۔

ایمن آباد میں ہمارا قیام زیادہ عرصہ نہ رہا۔ ہم لاہور آ گئے۔ لیکن میں کبھی کبھی محمد سلیم صاحب سے ملنے ایمن آباد ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ بھی لاہور شفٹ ہو گئے۔ یہاں ان سے ہفتے میں دو ایک بار ضرور ملاقات ہوتی۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور اس عالم فانی سے جب ان کے شب و روز پورے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عالم بقا کی طرف بلا لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ جب کبھی میں گوجرانوالہ جاتے ہوئے ایمن آباد کو جانے والی سڑک کے قریب سے گزرتا ہوں تو محمد سلیم صاحب کی بے اختیار یاد آ جاتی ہے۔ دل سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلتی ہے۔ سلیم صاحب کی پاکستان سے، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے محبت مثالی تھی۔ وہ علم دوست، انسان دوست اور پاکستان کے شیدائی تھے۔ کسی مادی غرض اور کسی دنیاوی عہدے کے لالچ کے بغیر، ایمن آباد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر علوم دینی اور اپنی جذبہ حب الوطنی کی باتوں کی جو روشنی پھیلائی ان کی کرنیں پاکستان کی فضاؤں کو ہمیشہ درخشاں کرتی رہیں گی۔ علم و ادب کا ذوق سلیم رکھنے والے یہ لوگ دینی و ادبی علوم و ثقافت کے چلتے پھرتے سرچشمے ہیں جن کا فیض عام جاری و ساری رہتا ہے۔

ان میں شہر اقبالؒ کا ایک علم دوست قدیم گھرانہ پال خاندان بھی ہے جن کے آباؤ اجداد کشمیر سے نقل مکانی کر کے سیالکوٹ میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ احسن پال خواجہ کا تعلق بھی اسی برگزیدہ خاندان سے ہے۔ یہ میرا اعتقاد ہے کہ نور ایمانی، علم و حکمت اور جذب و سرور سرمدی کی جو دولت حضرت علامہ اقبالؒ کو مبدا فیض کی جانب سے

ودیعت ہوئی، اس کی کرنیں شہر سیالکوٹ کے ہر فرد و بشر کے سینے کو روشن کر رہی ہیں۔
اس شہر کے ہر مکین کو علامہ اقبالؒ سے ایک نسبت روحانی ہے اور احسن پال خواجہ بھی اسی فیضِ روحانی کا امین ہے۔ اسلام آباد سے کبھی کبھی اس کا خط آ جاتا ہے۔ وہ ادیب نہیں ہے لیکن اس کا خط پڑھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں احمد فراز یا مومن خان مومن کی کوئی غزل پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دن ہوئے مجھے اسلام آباد سے احسن پال خواجہ کا ایک خط موصول ہوا۔ وہ لکھتا ہے۔

''مائی ڈیئر اے حمید!

وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ ابھی کل ہم آپ کے گھر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے، اچھی اچھی باتیں کر رہے تھے اور اس کو دو سال گزر گئے ہیں۔ دن گزرتے جاتے ہیں۔ کتابِ زندگی کے ان اوراق کی طرح جو تیز ہواؤں میں خود بخود پلٹتے جا رہے ہیں اور ہم خاموش تماشائی بنے ان کو دیکھ رہے ہیں۔ کسی ایک ورق کو بھی پلٹنے سے، کسی ایک لمحے کو بھی گزرنے سے روک نہیں سکتے۔ وقت کا ہاتھ تھام کر اس سے پوچھ نہیں سکتے کہ اسے اتنی جلدی کیوں ہے؟ زندگی کا یہ پہلو کس قدر حسرت آمیز ہے۔ پھر رنگوں، خوشبوؤں بھری یہ زندگی بڑی مضحکہ خیز لگتی ہے۔ نہ جانے پھر ایسا کیوں لگتا ہے کہ یہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، نہیں ہے۔

کئی بار آپ کا خیال آیا۔ آپ کو یاد کیا۔ کئی بار آپ کو خط لکھنے کو جی چاہا۔ مگر فرصت کا وہ لمحہ میسر نہ ہوا کہ جس میں سکون کے ساتھ بیٹھ کر آپ کو خط لکھ سکتا۔ آج بڑی شدت سے جی چاہ رہا ہے کہ آپ کو خط لکھوں۔ اس میں بارشوں کا بہت ہاتھ ہے۔ برف باری کا بھی ہاتھ ہے جن کے ساتھ آپ کا نام منسوب ہے۔ جب اسلام آباد اور کوہ مری کی پہاڑیوں پر ردمان پرور بادل چھائے ہوتے ہیں، جب بارش میں اسلام آباد کے خوبصورت درخت بھیگ رہے ہوتے ہیں، جب اسلام آباد کے حسین باغوں میں بہار گلاب اور گیندے کے پھول کھلاتی ہے اور پھر جب خزاں، اداس خزاں، سوکھے پتوں کے ساتھ زمین پر آہستگی سے اترتی ہے تو اے حمید یاد آتا ہے۔ اس کی

کتابیں یاد آتی ہیں۔ اس کی تحریریں یاد آتی ہیں۔

میرے پلنگ کے ساتھ ہی کتابوں کا چھوٹا سا شیلف ہے۔ کبھی کبھی جب دل اداس ہوتا ہے تو اس شیلف میں سے آپ کی کوئی کتاب اٹھا کر پڑھ لیتا ہوں۔ جن میں شدتِ احساس میں ڈوبی بہاروں کی مہکتی خوشبوئیں ہوتی ہیں، اُداس ہواؤں کے نرم جھونکے آتے محسوس ہوتے ہیں۔ پڑھ کر طبیعت میں ایک گداز، ایک نغمگی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کا کوئی خوبصورت فقرہ، کوئی خوبصورت ایکسپریشن پڑھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ دل کو شفاف، پُر سکون جھیلوں کی گہرائیوں کا سکون مل جاتا ہے۔ پھر آپ کی کتاب کو دیر تک تکتا رہتا ہوں۔ جیسے کوئی مریض شفا پانے کے بعد اپنے ڈاکٹر کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، پھر آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور خیالوں ہی خیالوں میں کہیں دور نکل جاتا ہوں۔ گم شدہ پگ ڈنڈیوں پر دور دراز کے سبزہ زاروں میں، جہاں فطرت قوس قزح کو رنگ عطا کرتی ہے۔

کتنی ستم ظریفی ہے کہ کل جو ایک حقیقت تھی، آج محض ایک خوبصورت اُداس خیال ہے۔ فیض صاحب نے اس دل گداز حقیقت کو کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

شب تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
شب تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ بادل، بارش، اسلام آباد کے سبزہ زاروں کا خوبصورت موسم۔ کاش آپ اس وقت میرے پاس ہوتے اور ہم دونوں کسی خاموش، پُر سکون ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پیتے، کچھ باتیں میں آپ کو سنا کر اُداس ہو جاتا، کچھ باتیں آپ مجھے سنا کر اُداس ہو جاتے۔ ایسے، دل کی بلکہ روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والے رومانٹک لمحے پھر کہاں ملتے ہیں۔ کس کو فرصت ہے کہ کسی کی اُداس کر دینے والی باتیں سنے؟ وقت تو مہکتی خوشبوؤں کو اُڑا کر بہت دور لے گیا۔ ان لمحوں کو

میں اسلام آباد کے حسین بادلوں، بارشوں اور کوہ مری کی برف پوش وادیوں میں تلاش کرتا رہتا ہوں۔ اسلام آباد میں یونہی کاروبارِ حیات میں دن گزر رہے ہیں جس میں میری خواہشوں اور مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ اپنی مرضی سے تو ہم اس دنیا میں بھی نہیں آئے تھے۔ راضی بہ رضائے الٰہی ہوں اور ہر حالت میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔

اسلام آباد میں صبح سے بارش ہو رہی ہے۔ موسم بڑا خوبصورت ہے۔ کس قدر حسین اور دل آویز ہے ہمارے پاک وطن کا دارالحکومت۔ اللہ تعالیٰ اسے ہمیشہ خوبصورت اور سرسبز و شاداب رکھے۔

فقط احسن پال خواجہ۔''

مجھ میں اور احسن پال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ میری طرح وہ بھی پاکستان کا شیدائی ہے۔ وہ بھی اعلیٰ کوالٹی کی چائے سے صرف محبت ہی نہیں کرتا، اس کا احترام بھی کرتا ہے۔ علم و ادب کا ذوق و شوق اسے وراثت میں ملا ہے۔ شہرِ اقبالؒ سے اسے عقیدت ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے اشعار اس کی زبان پر رہتے ہیں۔ لاہور کے طلسم کا وہ بھی اسیر ہے۔ مگر اسلام آباد کے حُسن پر فریفتہ ہے۔ لاہور میں ہوتا ہے تو اسلام آباد کی خوبصورت، خاموش، پُرسکون سڑکوں، وہاں کے بادلوں، بارشوں اور سرسبز و شاداب باغوں اور مری کی پہاڑیوں کو یاد کرتا ہے۔ اسلام آباد میں بیٹھ کر لاہور کی پُراسرار گلیوں اور ٹی ہاؤس اور لارڈز کی چائے کو یاد کرتا ہے۔ لارڈز ریسٹورنٹ مال روڈ کا سب سے اہم اور تاریخی، ادبی اور صحافتی ٹھکانہ تھا کہ

آتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس ریسٹورنٹ میں ادب اور صحافت کی نامور شخصیتیں آ کر بیٹھا کرتی تھیں۔ یہ قیامِ پاکستان کے شروع کا زمانہ تھا۔ مال روڈ کے پہلو میں لارڈز ریسٹورنٹ اور کیفے اورینٹ کے آگے جو سڑک تھی اس پر کبھی کوئی موٹر کار کھڑی نہیں دیکھی تھی۔ کبھی کبھار کوئی تانگہ سست رفتاری کے ساتھ گزر جاتا تھا۔ کیفے اورینٹ کے باہر سرِشام میز کرسیاں بچھ جاتی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر جو بزرگ ہستیاں چائے پیتی تھیں ان میں جناب

حمید نظامی، مولانا چراغ حسن حسرت، م۔ش، اور مظفر احسانی صاحب کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ہم نو آموز ادیب اور صحافی اس محفل کے حاشیہ نشین تھے۔ بڑے ادب سے ایک طرف بیٹھ کر میدانِ صحافت کے ان عظیم شہسواروں کی گفتگو سنتے تھے۔ سڑک پر خاموشی ہوتی تھی۔ مال روڈ پر سے بھی کبھی کبھی کوئی سائیکل یا تانگہ گزرتا تھا۔ لاہور کی مال روڈ کو اب کہاں پُرسکون فضا اور نقی بلڈنگ والی اس چھوٹی سی سڑک کو ان عظیم ادیبوں اور صحافیوں بلکہ پاکستان میں صحافت کے بانیوں کی گفتگو سننا نصیب ہو گا۔ لارڈز ریستوران کے پہلو میں Volga ''وولگا'' ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ یہ چھوٹا سا دو منزلہ ریستوران تھا۔ دوسری منزل میں رکھے ہوئے رنگین پیڑھے اور دیواروں پر لٹکتی پھلکاریاں پنجاب کی ثقافت کی ترجمانی کرتی تھیں۔ وولگا ہوٹل کی اس دوسری منزل میں مجھے یاد ہے جناب فیض احمد فیض کی شاعری کے پہلے مجموعے ''نقش فریادی'' کی رونمائی کی تقریب ہوئی تھی۔ اس ہوٹل کی پہلی منزل میں شاعر، ادیب اور دانشور چائے کی محفلیں سجاتے تھے۔ ان میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ جب لاہور کے افق سے علم و ادب کے یہ سرچشمے ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہوئے تو وولگا ہوٹل بھی غائب ہو گیا۔

مال روڈ کی شاہ دین بلڈنگ میں چیئرنگ کراس کے رخ پر مختصر عرصہ کے لئے ایک چھوٹا سا ریستوران کھلا تھا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔ اس ریستوران کے اوپر بلڈنگ کی دوسری منزل پر ہز ماسٹرز وائس ریکارڈنگ کمپنی کا سٹوڈیو تھا جہاں لاہور کی فلم کمپنیوں کے گانوں کی ریہرسل بھی ہوتی تھی اور شاید ریکارڈ بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ اس حوالے سے میوزک ڈائریکٹر، گلوکار اور وہ شاعر جو فلموں کے لئے گیت لکھتے تھے، اس شاہ دین بلڈنگ والے ریستوران میں چائے پینے آیا کرتے تھے۔

بلڈنگ کی دوسری منزل میں چیئرنگ کراس اور مال روڈ کے رخ پر باہر کو نکلی ہوئی ایک چھوٹی سی گیلری ہوتی تھی جہاں میں اور مشہور میوزک ڈائریکٹر طفیل فاروقی بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔

شاہ دین بلڈنگ مال روڈ کی قدیم عمارتوں میں سے ہے۔ اس عمارت کے ساتھ لاہور کی علمی، ادبی اور صحافتی تاریخ کی بڑی قیمتی یادیں وابستہ ہیں۔ آج کل اس تاریخی عمارت کی پلاسٹک سرجری ہو رہی ہے۔ سنا یہی جاتا ہے کہ یہ عمارت ویسی کی ویسی رہے گی۔ یعنی اس کی اصلی شکل و صورت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ صرف اس کی نئے سرے سے تزئین و آرائش ہی کی جائے گی۔ اگر یہ سچ ہے تو شاہ دین بلڈنگ بڑی خوش نصیب عمارت ہے کہ یہ جو ہر طرف ایک طوفانی بھگدڑ مچی ہوئی ہے اس کی زد میں آ کر مر جانے سے بچ جائے گی۔ خدا کرے کہ جب اس عمارت کی نقاب کشائی ہو تو اس کی وہ گیلری سلامت رہے جس کا رخ چیئرنگ کراس کے یوکلپٹس کے درختوں کی طرف ہوتا تھا اور جہاں بیٹھ کر پاکستان کے شہرہ آفاق میوزک ڈائریکٹر، موسیقار، شاعر اور ادیب چائے پیا کرتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو شاعر اور ادیب امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے ان کا پہلا ادبی ٹھکانہ گوالمنڈی کے تین ریسٹورنٹ تھے۔ پنجاب ہوٹل، شیراز ہوٹل اور کشمیر ہوٹل۔ ابھی کافی ہاؤس، چینی لنچ ہوم اور پاک ٹی ہاؤس کی طرف کبھی کبھار ہی کوئی شاعر، ادیب جاتا آتا تھا۔

یہ میں 48-1947ء یا زیادہ سے زیادہ 1949ء کی بات کر رہا ہوں۔ میکلوڈ روڈ پر چوک لکشمی اور رائل پارک میں قیام پاکستان سے پہلے فلم پروڈکشنز کے دفاتر ہوا کرتے تھے جن میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی۔ اگست سینتالیس کے بعد غیر مسلم ہندوستان چلے گئے تو چوک لکشمی اور رائل پارک میں پاکستان فلم انڈسٹری کی سرگرمیوں کی ابتدا ہوئی۔ چوک لکشمی کے تین ہوٹل فلم آرٹسٹوں کے ٹھکانے بن گئے۔ یعنی ویسٹ اینڈ ہوٹل، برسٹل ہوٹل اور کنگ سرکل۔

بمبئی سے کئی صفِ اول کے آرٹسٹ، میوزیشنز اور ٹیکنیشنز ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے۔ وہ بھی ان ہوٹلوں میں آ کر بیٹھتے۔

پنجاب میں لاہور شروع ہی سے فلمی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا۔ ایم آر کاردار اور ایم اسماعیل کی ٹیم نے نامساعد حالات میں لاہور میں فلم پروڈکشنز کی بنیاد رکھی تھی۔ بعد میں شہرِ نگاراں لاہور میں بڑے اعلیٰ پائے کی فلمیں پروڈیوس ہوئیں اور لاہور کی فلم انڈسٹری بمبئی کی فلم انڈسٹری کے مقابلے پر آ گئی۔

اس وقت میرا موضوع وہ آرٹسٹ ہیں جو بمبئی سے ہجرت کر کے لاہور آئے اور

جنہوں نے چوک لکشمی کے برسٹل ہوٹل اور ویسٹ اینڈ ہوٹل میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔ بمبئی سے ہجرت کر کے جو نامور اور تجربہ کار اداکار، ڈائریکٹر، شاعر اور فلمی رائٹر آئے ان میں ایم اسماعیل، شاہ نواز، مظہر خاں، شاکر، نذیر، سورن لتا، عبدالرحمٰن کابلی، غلام محمد، تنویر نقوی، لقمان، ضیا سرحدی، بابا چشتی، خواجہ خورشید انور، ماسٹر غلام حیدر، فیروز نظامی، طفیل فاروقی، صادق علی، قدیر غوری، منشی دل، انور بٹالوی، فیروز نظامی، مجید اے شاہ شکار پوری، ببو ہمالیہ والا، زینت، حسرت لکھنوی، شمس لکھنوی اور ان کے علاوہ بھی بعض مشہور و معروف مسلمان فنکار تھے جن کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہے (میں ان سے معذرت خواہ ہوں) ان تجربہ کار فنکاروں، ہدایت کاروں، شاعروں اور اداکاروں نے پاکستان کی فلم انڈسٹری کو اپنے تجربے اور جوہر قابل سے آبیاری کی۔ لاہور میں فلم انڈسٹری کی رونقیں بحال ہوئیں تو فلم میڈیا کے میدان میں نیا ٹیلنٹ بھی اپنا جوہر دکھانے آگے آیا۔ ان میں لالہ سدھیر، نعیم ہاشمی، مظہر شاہ اور اسد بخاری کے نام سب سے نمایاں ہیں۔ یہ وہ نوآموز فنکار تھے جن کے ہاں صرف شوق کی فراوانی ہی نہیں تھی بلکہ ان میں جوہر قابل کی تمام تر صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ وقت نے ثابت کر دیا کہ نعیم ہاشمی، اسد بخاری اور مظہر شاہ فلمی دنیا کے آسمان پر ابھرتے ہوئے یہ ستارے پوری آب و تاب سے چمکے۔

میرا موضوع محدود ہے، یہاں میں صرف ان نوآموز اداکاروں کا ذکر کروں گا جن کے ساتھ میں چوک لکشمی کے برسٹل ہوٹل، ویسٹ اینڈ ہوٹل میں بیٹھتا رہا ہوں۔ ویسٹ اینڈ ہوٹل میں نعیم ہاشمی، مظہر شاہ، اسد بخاری اور میں بیٹھا کرتے تھے۔ بزرگ اداکار ایم اسماعیل بھی تقریباً روزانہ آیا کرتے تھے۔ مظہر شاہ، اسد بخاری اور نعیم ہاشمی سے میری بہت جلد دوستی ہو گئی۔ ان تینوں کا تعلق کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے گھرانوں سے تھا۔ میری طرح ان تینوں کو بھی فیشن کے مطابق اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ ابھی شلوار قمیض کا رواج نہیں ہوا تھا۔ لوگ زیادہ تر پتلون، بش شرٹ اور انگریزی سوٹ پہنتے تھے۔ مظہر شاہ اور نعیم ہاشمی عام طور پر کمبی نیشن یا تھری پیس سوٹ پہنتے۔ تینوں خوش

شکل بھی تھے اور انہیں شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق بھی تھا۔

مظہر شاہ اور اسد بخاری ورزشی جسم کے مالک تھے جبکہ نعیم ہاشمی ان کے مقابلے میں دبلا پتلا تھا مگر اس کی بڑی بڑی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں اور وہ اردو کے علاوہ انگریزی ادب سے بھی شناسا تھا۔ وہ کم آمیز اور کم گو تھا۔ دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کے لہجے میں وقار اور اعتماد کے ساتھ ساتھ بڑی گرم جوشی ہوتی تھی۔ چنانچہ نعیم ہاشمی کے ساتھ قدرتی طور پر مجھے زیادہ لگاؤ تھا۔

صبح کے وقت ویسٹ اینڈ ہوٹل میں آ کر بیٹھنا ہمارا روز کا معمول تھا۔ جس روز میں اور نعیم ہاشمی پہلے آ جاتے تو ہم دونوں کونے والی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے اور خوب باتیں کرتے۔ نعیم ہاشمی کو میر، غالب اور اقبال کے کئی اشعار زبانی یاد تھے۔ منٹو کے افسانے اسے بہت پسند تھے۔ وہ عام طور پر گہرے براؤن کلر کے سوٹ میں ہوتا اور سوٹ کے ساتھ میچنگ کلر کی ٹائی لگاتا تھا۔ میل ملاپ میں وہ اپنی خاندانی وضع داری اور رکھ رکھاؤ اور خودداری کا بے حد خیال رکھتا تھا۔

برسٹل ہوٹل میں جب کوئی ایسا فلم پروڈیوسر یا ڈائریکٹر آ جاتا جو کوئی فلم بنا رہا ہوتا تو نعیم ہاشمی کا اس کے ساتھ رویہ زیادہ باوقار اور خوددار ہو جاتا تھا۔ اگرچہ نعیم ہاشمی کو کام کی تلاش تھی اور اس میں صف اول کے اداکار بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں مگر اس نے کبھی کسی پروڈیوسر یا ہدایتکار کو یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اپنی زیر تکمیل فلم میں اسے بھی کوئی کام دے۔ اسے اپنی خداداد قابلیت پر بھرپور اعتماد تھا۔ چنانچہ جب وقت آیا تو نعیم ہاشمی بھی اسد بخاری اور مظہر شاہ کے ساتھ شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔

جب کبھی میں کسی فلم سٹوڈیو میں جاتا اور مجھے پتہ چلتا تھا کہ نعیم ہاشمی کسی فلور پر شوٹنگ میں مصروف ہے تو میں وہاں ضرور جاتا۔ نعیم کو سیٹ پر کام کرتے دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوتی۔ وہ اپنے کردار میں اس قدر گم ہوتا کہ اسے میری موجودگی کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ جب سین ختم ہو جاتا تو وہ میرے پاس آ کر اپنی دل نشیں دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا۔

"تم کب آئے؟"

پھر ایسا ہوا کہ نعیم ہاشمی کی مصروفیات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میری ادبی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ ہماری ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی۔ جب ملتے تو کسی کونے میں بیٹھ کر بہت باتیں کرتے۔ برسٹل ہوٹل والے دنوں کی باتیں، وہاں بیٹھ کر چائے کی محفلیں گرم کرنے والے ہم جولیوں کی باتیں کرتے۔ اپنی اپنی مصروفیات نے ہم دونوں کے درمیان فاصلے بڑھا دیئے۔ خواہش رکھنے کے باوجود ہماری ملاقات نہ ہوتی۔ کبھی ملتے تو بڑی مختصر ملاقات ہوتی۔

پھر ایک دن یہ اندوہ ناک خبر سن کر، نعیم ہاشمی ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا ہے، یقین نہیں آیا تھا۔ بہت دکھ ہوا۔ آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہوا ستارہ تھا جو غروب ہو گیا۔ وہ شہرت کی بلندیوں پر تھا جب دوستوں کو داغِ مفارقت دے گیا۔ وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ میرا قریبی دوست تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز میں بوجھل دل کے ساتھ چوک لکشمی گیا مگر وہاں کا نقشہ بدل چکا تھا۔ نہ برسٹل ہوٹل تھا، نہ ویسٹ اینڈ ہوٹل تھا۔ ان کی جگہ نئی بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ وہاں ایک طرف کھڑے ہو کر دیر تک اس نئی عمارت کو تکتا رہا جہاں کبھی ویسٹ اینڈ ہوٹل ہوا کرتا تھا اور جہاں میں اور نعیم ہاشمی کونے والی میز پر بیٹھے چائے پیا کرتے تھے، باتیں کیا کرتے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ویسٹ اینڈ ہوٹل کی جگہ کھڑی نئی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ میرا دل اپنے پیارے دوست کی یاد میں اُداس تھا، غم زدہ تھا۔ پھر مجھے ایسے لگا جیسے نعیم ہاشمی براؤن رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس عمارت میں سے نکل کر میرے پاس آ گیا ہے اور مجھ سے ہاتھ ملا کر شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"تم کب آئے؟"

چوک لکشمی میں کنگ سرکل نام کا ریستوران حیدر پان والے کی مشہور دکان کے پہلو میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں، شاید اس کا نام کنگز سرکل تھا۔ بہرحال میں اسے کنگ سرکل ہی لکھوں گا۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری تیزی سے ترقی کی

منزلیں طے کرنے لگی۔ جوہر قابل کی کمی نہیں تھی۔ ہر شخص میں کام کرنے کی لگن تھی۔ لاہور بہت جلد پاکستان کا ہالی ووڈ بن گیا۔ اس میدان میں جہاں ایسے فنکار آ گئے جنہیں فلموں میں کام کرنے کا صرف شوق ہی نہیں تھا بلکہ ان میں خداداد صلاحیتیں بھی تھیں، وہاں لاہور اور قرب و جوار کے شہروں سے ایسے نوجوانوں نے بھی لاہور کا رخ کیا جنہیں فلموں میں کام کرنے کا شوق تو ضرور تھا مگر ان کا دامن جوہر قابل سے خالی تھا۔ ان لوگوں کا کام فلم سٹوڈیوز کے چکر لگانا، مشہور اداکاروں کو دور سے دیکھ کر سلام کرنا، ان کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنا، رائل پارک کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر ایسے لوگوں کا کھوج لگانا جن کا فلم انڈسٹری سے کسی نوع کا بھی کوئی تعلق ہو اور پھر انہیں سنتوش کمار یا وحید مراد کے سٹائل میں پہلے سے یاد کیے ہوئے مکالمے سنانا تھا۔ کسی نے وحید مراد کی طرح بال بنائے ہوتے، کوئی سنتوش کمار، سدھیر کی طرح چلنے کی کوشش کرتا۔ ہیرو بننے کے یہ شوقین نوجوان عام طور پر معمولی شکل و صورت کے ہوتے تھے اور کسی طرح بھی فلم کے ہیرو بننے کے اہل نہیں ہوتے تھے۔ مگر فلموں میں ہیرو بننے کا شوق انہیں لاہور کھینچ لایا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایسے نقلی ہدایت کار اور پروڈیوسر بھی میدان میں آ گئے جن کا کام ان فلمیریا کے مریض نوجوانوں کو شکار کرنا تھا۔ جو شوقین نوجوان لاہور سے تعلق رکھتے تھے وہ پھر بھی ذرا چالاک تھے۔ مگر دوسرے شہروں سے آئے ہوئے ہیرو بننے کے شوقین نوجوان عام طور پر سادہ لوح ہوتے تھے اور گھروں سے کچھ پیسے لے کر بھی آئے ہوتے تھے۔ ایسے نوجوان بڑی آسانی سے نقلی ہدایت کاروں کے جال میں پھنس جاتے۔ جعلی ہدایت کار انہیں بڑے سبز باغ دکھاتا، انگلیوں کا چوکھٹا سا بنا کر ان کے چہرے کا جائزہ لیتا اور پھر بڑے پر جوش انداز میں کہتا۔

''کمال ہے۔ کیا فیس (Face) ہے۔ کیا کلوز اپ ہے۔ تم تو بنے بنائے ہیرو ہو۔ میری پہلی فلم میں ہی تم وحید مراد اور سنتوش کمار کو پیچھے چھوڑ جاؤ گے۔''

ہیرو بننے کا شوقین سادہ لوح نوجوان اس کے جھانسے میں آ جاتا۔ نقلی ہدایت کار

اسے ساتھ لے کر دو تین بار سٹوڈیوز میں کسی فلم کے سیٹ پر لے جاتا۔ اس کے پیسوں کی چائے پیسٹری اُڑاتا، دعوتیں کھاتا اور جب اس بے چارے کے سارے پیسے ختم ہو جاتے تو اسے کبھی پورے نہ ہونے والے وعدوں پر لگا کر کسی دوسرے شکار کو پھانسنے کے لئے جال پھینک دیتا۔ لاہور کی فلم انڈسٹری جہاں باصلاحیت اداکاروں اور تجربہ کار حقیقی ہدایت کاروں کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی، وہاں ساتھ ہی ساتھ نقلی ہدایت کاروں کا کاروبار بھی چلتا رہتا تھا۔

رائل پارک کے فلمی دفتروں میں بڑی گہما گہمی ہوتی۔ رائل پارک میں ہدایت کار لقمان کا آفس بھی تھا۔ یہاں مشہور شاعر تنویر نقوی کی بیٹھک رہتی تھی۔ تنویر نقوی سے میری پہلی ملاقات پاکستان بننے سے پہلے ان کے فاروق گنج والے مکان میں ہو چکی تھی۔ اس کے بعد وہ بمبئی چلا گیا۔ پاکستان بننے کے بعد وہ بمبئی سے واپس آیا تو ہدایت کار لقمان صاحب کے آفس میں ہی اس سے دوسری بار ملاقات ہوئی۔ لقمان صاحب ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور انہوں نے بعض بڑی معیاری فلمیں بنائی تھیں۔ تنویر نقوی ان کے آفس میں آتا تو شعر و شاعری کی محفل لگ جاتی۔ تنویر نقوی درمیانے قد کا بڑا خوش لباس اور خوبصورت نوجوان تھا۔ فلموں میں گیت لکھنے سے پہلے اس کی نظمیں اور خاص طور پر اس کے لکھے ہوئے قطعات ''ادب لطیف'' میں چھپا کرتے تھے۔ اس کے قطعات کی ایک کتاب بھی چھپ چکی تھی۔ فلم میں آ کر اس نے اپنے ادبی معیار کو برقرار رکھا اور فلم انڈسٹری کو ایسے گیت دیئے جن کی گونج آج بھی سنائی دے رہی ہے۔

سن 65ء کی جنگ میں تنویر نقوی علالت کے باوجود ٹیکسی میں بیٹھ کر ریڈیو سٹیشن پہنچ گیا۔ وہ ایک ملی ترانہ لکھ کر لایا تھا۔ اس وقت میوزک سٹوڈیو میں میوزک ڈائریکٹر سلیم اقبال، ملکہ ترنم نور جہاں موجود تھیں۔ سلیم اقبال نے اسی وقت تنویر نقوی کے لکھے ہوئے ترانے کی طرز بنائی اور ایک گھنٹے میں نور جہاں کی آواز میں وہ ریکارڈ بھی ہو گیا۔ یہ ملی ترانہ بھی اس زمانہ میں لکھے گئے دوسرے ملی ترانوں کی طرح محاذ پر

برسرِ پیکار پاک فوج کے جوانوں کے خون کو گرماتا رہا۔ ملی ترانے کے بول تھے

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

یہ شفق رنگ لہو

پھر تنویر نقوی بھی ہم سے بچھڑ گیا۔ آسمانِ ادب کا ایک درخشاں ستارہ تھا جو اپنی روشنی ہمیں دے کر کائنات کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔

◎......◎

۵

آج سے چند سال پہلے ریڈیو پاکستان لاہور شاعروں، ادیبوں اور موسیقاروں کی تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ کچھ ممتاز شاعر اور ادیب ریڈیو سٹیشن پر بطور سٹاف آرٹسٹ کام بھی کرتے تھے۔ محکمے کی جانب سے انہیں کچھ مدت کا کنٹریکٹ مل جاتا تھا جس کی تجدید ہوتی رہتی تھی۔ انہیں پکے سرکاری ملازموں والی سہولتیں میسر نہیں تھیں لیکن ان شاعروں، ادیبوں کو اس قسم کی سہولتوں کی پرواہ کم ہی ہوتی تھی۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔

ہم لوگ صرف اسی بات پر بڑے خوش تھے کہ روز شاعر ادیب دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ کینٹین میں بیٹھ کر اکٹھے چائے پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، باغیچے میں کھلے ہوئے گلاب کے پھولوں کو قریب جا کر دیکھتے ہیں۔ ہمیں سب پتہ تھا کہ ریڈیو سٹیشن کی کینٹین کے آگے جو بیری کا درخت ہے، اس پر کب بیر لگتے ہیں، کب طوطے انہیں کتر کتر کر نیچے پھینکتے رہتے ہیں اور کب لال لال بیر پک جاتے ہیں۔ یہاں امانت علی خان کے ساتھ صرف باتیں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ ریڈیو سٹیشن کے میوزک سٹوڈیو میں پیانو کے سامنے بیٹھ کر "یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے" غزل کی طرز بھی بناتا تھا۔

ان آرٹسٹوں، شاعروں اور ادیبوں کی وجہ سے ریڈیو سٹیشن میں ایک ادبی فضا ہر

وقت چھائی رہتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ محکمے نے ادیبوں، شاعروں کو کنٹریکٹ دینے بند کر دیئے۔ جو شاعر ادیب بطور سٹاف آرٹسٹ کام کرتے تھے انہیں بھی جواب دے دیا گیا۔ میں پروڈیوسر بن کر مہنگائی الاؤنس، میڈیکل الاؤنس اور فائلوں اور ساتویں، آٹھویں نادیں گریڈوں کی باتیں کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔ وہ میری باتیں نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی باتیں میری سمجھ اور میرے مزاج سے باہر تھیں۔ مجھے یوں لگتا کہ میں کسی ویران جزیرے میں جلا وطن کر دیا گیا ہوں۔ اب میرا گزارہ اپنے ادیب، شاعر دوستوں کے ساتھ گزارے ہوئے حسین دنوں کی یادوں پر تھا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے میرے پاؤں میں کئی زنجیریں پڑ گئیں۔ ان میں سب سے زیادہ ناقابل برداشت زنجیر تبادلے کی تھی۔ یعنی بطور ریڈیو پروڈیوسر میرا کسی دوسرے شہر میں تبادلہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ ایسی ہی بات تھی کہ جیسے سنبل کے سرخ پھولوں والے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جائے۔ میں کھلے، آزاد طوفانی سمندروں میں سفر کرنے والا سند باد چاندنی اور پھول دار بیلوں میں چھپی ہوئی گیلریوں کے نیچے چاندنی راتوں میں محبت کے گیت گانے والا مطرب تھا۔ آخر ایک دن میں نے یہ سب زنجیریں توڑ ڈالیں اور امریکہ بھاگ گیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔

آج میں صرف ان لوگوں کی باتیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں جن کی باتوں میں سنہرے خوبصورت دنوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جو یادوں کے دھندلے غبار اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

ریڈیو سٹیشن لاہور میں آج بھی ایسے یادگار لوگ کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ اپنے سائے ہیں جو اپنے وجود سے بچھڑ گئے ہیں۔ ان میں طاہر لاہوری بھی ہیں۔ جدی پشتی لاہور کے بھاٹی دروازے کے رہنے والے ہیں۔ ان کی لاہور کی یادیں میری یادوں سے بھی پرانی اور قیمتی ہیں۔ ایک مدت سے میری ان کی شناسائی ہے۔ لاہور کی قدیم وضع داری اور شرافت ان کی گفتگو، لب و

لہجے سے عیاں ہے۔ بڑے مشاق نثر نگار ہیں۔ ہر قسم کا ریڈیو سکرپٹ بڑی مہارت سے لکھ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان سے ریڈیو پر ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔

''طاہر صاحب! آپ لاہور کے ایک تاریخی دروازے کی روشن روایات کے امین ہیں۔ کبھی بھاٹی دروازے کے بزرگوں، اپنے دوستوں اور ان لوگوں کی باتیں سنائیے جن کی وجہ سے حکیم احمد شجاع صاحب نے بھاٹی دروازے کو لاہور کا ''چیلسی'' لکھا تھا۔''

میرے سوال پر طاہر لاہوری بڑے خوش ہوئے۔ آنکھیں روشن ہو گئیں۔ جیسے انہیں بہت کچھ یاد آ گیا ہو۔ ان کی دلچسپ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ کہنے لگے۔

''حمید صاحب! لاہور دنیا کے ان خوش نصیب شہروں میں ہے جن پر علم و ادب، علم و دانش، درس و تدریس، ہنر مندی اور روحانی فیوض و برکات کے انوار کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ لاہور شہر کی بستیوں، گلی کوچوں اور دروازوں میں بھاٹی اپنے کمال و جمال میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اسے چیلسی کا نام دینے والے نے پورا انصاف کیا ہے۔ اس دروازے کی فصیل کے اندر علماء، ادباء، شاعر، فنکار، موسیقار اور دانش وروں کے پرچم لہرا رہے ہیں۔

میں نے اسی بھاٹی دروازہ کے اندر آنکھ کھولی۔ اس وقت گرد و پیش کی فضا، ماحول، محل وقوع آج کل سے بہت مختلف تھا۔ تحصیل بازار سے بھاٹی گیٹ تک گلیاں، بازار، محلے، کوچے، مین بازار ایک دل کشا منظر پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ علاقے آج بھی اسی شان کے ساتھ آباد ہیں۔ محلہ سمیاں، محلہ ستھاں، محلہ جلوٹیاں، میدان بھاٹیاں، محلہ نیاریاں، محلہ پڑنگاں، محلہ ذیلداراں، محلہ چوہالہ، بازار حکیماں، اونچی مسجد، نور محلہ، محلہ جوگیاں، ٹھٹھی ملاحاں وغیرہ اپنے گلی کوچوں کے ساتھ مدتوں سے اپنی تمام رونقیں لئے اسی طرح آباد و شاد باد ہیں۔ مگر کہیں کہیں عمارتوں کے ناک نقشے کچھ بدل گئے ہیں۔ بھاٹی دروازے کے باہر کا حُسن آبادی کی بے پناہ بھیڑ اور ٹریفک میں کھو گیا ہے۔ میرے بچپن کے زمانے میں بھاٹی دروازے کے باہر باغ میں پھولوں کی تر و تازہ

کیاریاں مہکا کرتی تھیں۔

بھاٹی دروازے کے باہر صرف ایک سینما ہاؤس تھا جسے میلا رام کا منڈوا کہتے تھے۔ چوک سے گزریں تو آگے حضرت علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخشؒ کا مقدس آستانہ ذکر و فکر کی مدھم صداؤں میں دن رات روحانیت کی کرنیں بکھیرتا۔ دوسری جانب میلا رام کا کپڑے کا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے کے ساتھ لال کوٹھی تھی جو کئی کنال پر پھیلی ہوئی تھی۔ اب وہاں کتب فروشوں کی دکانیں ہیں۔ کارخانے کی جگہ بڑے بڑے کاروباری مراکز بن گئے ہیں۔ لال کوٹھی کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کرلیا گیا ہے۔ جہاں اب پاکٹ ہوٹل ہے وہاں لکڑی کوئلے کا ٹال ہوا کرتا تھا۔ اردگرد درخت، گھوڑوں کے اصطبل اور کچھ پرانی عمارتیں ہوا کرتی تھیں۔ بعد میں یہاں ولنگٹن ٹاکیز اور پیراماؤنٹ ٹاکیز کے نام سے دو سینما بن گئے۔

بھاٹی دروازے کے باہر دونوں جانب سرکی اور ٹین کی چھتوں والی پرانی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں مٹی کے برتن بکتے تھے۔ پیراماؤنٹ سینما سے ذرا آگے بکرمنڈی تھی جہاں صبح و شام بھیڑیں فروخت ہوتی تھیں۔ دوسری طرف پھجی شاہ کا تھیٹر ہوتا تھا جو سارا سال اس جگہ تھیٹر کے ڈرامے کرتا، صرف میلوں میں باہر جاتا اور پھر اسی جگہ آ کر خیمے لگا دیتا۔ سامنے ٹمٹموں اور لاہوری تانگوں کا اڈہ تھا۔ یہاں سے ٹمٹمیں سانده، اچھرہ، نواں کوٹ اور دوسرے دیہاتوں کو جاتی تھیں۔ تانگے سرکلر روڈ پر ریلوے اسٹیشن اور دہلی دروازے کی طرف چلتے تھے۔ سلطان پورہ، چاہ میراں، کوٹ خواجہ سعید اور دوسرے کئی چھوٹے موٹے دیہات تھے۔

شالیمار باغ کے میلہ چراغاں کی دھوم پورے برصغیر میں تھی۔ امرتسر، جالندھر، لدھیانے اور دلّی تک سے لوگ اس میلے میں شریک ہونے کے لئے آتے تھے۔ باغ، نہر اور بادلیاں لاہور شہر کی فصیل کے گرداگرد بنی ہوئی تھیں۔

اس وقت لاہور کی آبادی اڑھائی لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ سڑکوں پر صرف تانگے چلتے تھے۔ موٹریں سارے شہر میں صرف چند لوگوں کے پاس تھیں جن کا اس طرف

گزر کم ہوتا تھا۔ لوگ اپنی سائیکلوں کو دلہن کی طرح سجاتے۔ بھاٹی دروازے کا باغ بڑا کشادہ تھا۔ اس کے درمیان ایک نہر بہتی تھی۔ ہم اس نہر میں چھلانگیں لگاتے۔ عورتیں نہر پر کپڑے بھی دھوتی تھیں۔ جب عورتوں کے نہر پر کپڑے دھونے کا وقت ہوتا تو لوگ اس طرف سے کم گزرا کرتے تھے۔ مرد چھوٹی سڑک سے آتے جاتے۔ باغ کے گنجان درخت، ان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں، پھولوں سے لدے ہوئے پودے گزرنے والوں کے دماغوں کو مہکا دیا کرتے تھے۔ بچے صبح و شام باغ میں کھیلتے۔ بڑے، بوڑھے صبح آٹھ نو بجے صفیں اور دریاں بچھا کر محفلیں آراستہ کر لیتے۔ پھر ایک پڑھا لکھا بزرگ ہاتھ میں گل بکاؤلی، ہیر رانجھا، یوسف زلیخا، سیف الملوک یا کوئی دوسری پنجابی کی منظوم کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور قصہ سنانا شروع کر دیتا۔ کل جہاں سے کہانی چھوڑی ہوتی، وہ وہیں سے شروع کرتا جہاں ہمالہ دیونی نے شہزادے اور گل بکاؤلی کی ملاقات کرائی تھی۔ سامعین ہمہ تن گوش ہو کر کہانی سنتے۔ کہانی میں کوئی دردناک مقام آتا تو بڑے بوڑھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار کہانی سنائی جا رہی تھی۔ کہانی دردناک مقام پر سے گزر رہی تھی۔ بڑے بوڑھوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ ایک پردیسی مسافر کا باغ میں سے گزر ہوا۔ وہ بے چارہ ڈیڑھ سو آدمیوں کو روتے دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بزرگ سے پوچھا۔

''یہاں کیا ہوا ہے؟ یہ آپ سب لوگ کیوں رو رہے ہیں؟''

بزرگ نے پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''گل بکاؤلی کو جنوں نے زنجیروں میں جکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا ہے۔''

بھاٹی کے باغ میں جہاں یہ داستان سرائی کی محفل جمتی، اس کے سامنے بابے گھمد شاہؒ کا مزار تھا۔ یہاں گاما پہلوان رستم زماں کا اکھاڑہ تھا جو اب بھی ہے۔ یہاں بڑے بڑے نامی گرامی پہلوان زور کرتے۔ دوسرے باغ میں نوجوان کبڈی کھیلتے۔

صبح کے وقت نوجوان کسرت کرتے۔ نوجوانوں میں ورزش بلکہ کسرت کرنے کا شوق بہت زیادہ تھا۔ بھاٹی دروازے کے باہر باغات میں مولسری کے درختوں کی قطار تھی۔ اس وقت لوگ منہ اندھیرے اٹھنے کے عادی تھے۔ صبح صبح گلی میں ایک صدا ہر روز سنائی دیتی۔

''سب کا بھلا...... سب کی خیر...... سب کا بھلا...... سب کی خیر۔''

یہ صدا تقریباً گلی میں سے گزرتے ہر بزرگ کی زبان پر ہوتی تھی۔

میں نے بازار حکیماں کی گلی کاغذیاں میں ہوش سنبھالا۔ ایک دن ہمارے بازار میں بڑا شور بلند ہوا۔ میں بڑا چھوٹا تھا۔ گلی سے نکل کر بازار میں آیا تو دیکھا کہ پہلوانوں کا ایک جلوس گزر رہا ہے۔ اس وقت میری عمر تین ساڑھے تین سال کی ہو گی۔ یہ امام بخش پہلوان کی دوسری کشتی تھی۔

امام بخش پہلوان نے گونگے پہلوان کو پچھاڑ دیا تھا۔ گونگا پہلوان شکل وصورت اور مردانہ وجاہت اور کسرتی بدن کے اعتبار سے بہت خوبصورت پہلوان تھا۔ اس زمانے میں وہ عوام میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔

ابھی بجلی شہر کے اندر نہیں آئی تھی۔ گھروں میں شام کو لالٹینیں اور چراغ روشن ہوتے تھے۔ گلیوں میں میونسپل کمیٹی کے لیمپ جلتے تھے۔ کمیٹی کا عملہ ہر شام لیمپ میں تیل ڈال کر لیمپ جلاتا۔ کبھی کوئی لیمپ چوری نہیں ہوا تھا۔ کبھی کسی نے لیمپ کا کھمبا نہیں اکھاڑا۔ بڑے بازاروں میں لکڑی کے بلند پول نصب ہوتے تھے ان کے ساتھ ایک ہینڈل اور گراری لگی ہوتی۔ کمیٹی کا آدمی شام کو آتا۔ ہینڈل کو گھما کر گیس نیچے لے آتا، اس میں تیل ڈال کر اسے روشن کرتا اور گراری گھما کر اوپر کر دیتا۔ یہ گیس بازاروں میں رات بھر روشن رہتے۔ صبح صبح کمیٹی کا آدمی آ کر انہیں بجھوا دیتا تھا۔ محرم میں سبیلیں لگتیں۔ سبیلوں کی آرائش بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کی جاتی۔ نذر نیاز کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔ کجیاں ٹھوٹھیاں بچوں میں بانٹی جاتی تھیں۔ کجیوں میں میٹھا شربت ہوتا اور ٹھوٹھیوں میں کھیر یا میٹھے چاول ہوتے تھے۔

میلہ چراغاں کی کئی ہفتے پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ یہ میلہ قریباً ہفتہ بھر لگتا تھا۔ شالامار باغ کے اندر اور باہر دکانوں، خیموں، ٹولیوں اور میلہ دیکھنے والوں کا ہجوم رہتا۔ امرتسر اور جالندھر سے جو مٹھائی کی دکانیں آتی تھیں ان پر بے حد رش ہوتا تھا۔ لوگ اس موقع پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف اور مٹھائیوں کے ٹوکرے بھیجتے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ میلہ دیکھا تو مجھے خرچ کرنے کے لئے دس آنے ملے تھے۔ میں نے میلے میں خوب مٹھائی کھائی، قتلے کھائے، پان بھی کھایا اور تین آنے پھر بھی بچ گئے تھے۔ شالامار باغ کے سامنے ایک حوض تھا جس میں فوارہ لگا تھا۔ میلے کے دنوں میں یہ فوارہ چلا دیا جاتا تھا۔ اس کا پانی سڑک کے نیچے سے بہہ کر باغ کے اندر آتا تھا۔

اس زمانے میں چیزیں خالص اور سستی ہوتی تھیں۔ کوڑیاں بھی سکے کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ مزاروں پر کوڑیوں کے چڑھاوے چڑھتے تھے۔ داتا دربار کے باہر دکانوں پر اکثر کوڑیاں بکتی تھیں۔ پانچ کوڑیوں کا ایک گھنڈا ہوتا تھا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو کوڑیوں میں لین دین ختم ہو چکا تھا۔ پھر دمڑی، دھیلا شروع ہو گیا۔ ایک پیسے کے دو دھیلے، چار دمڑیاں اور تین پائیاں ہوتی تھیں۔ دو پیسے کا ایک ٹکہ ہوتا تھا۔ دونی، چونی اٹھنی اور روپیہ خالص چاندی کا ہوتا تھا۔ ان دنوں پونڈ بھی عام لوگوں کے پاس تھے۔ پونڈ خالص سونے کا ہوتا تھا۔

میری ہوش میں آٹا ایک روپے کا بائیس سیر سے پچیس سیر تک بکتا تھا۔ سونا تیرہ، سترہ روپے تولہ تھا۔ اسی مناسبت سے باقی چیزوں کی قیمتیں بھی کم تھیں۔ بھاٹی دروازے سے ریلوے اسٹیشن تک تانگے کا کرایہ ایک پیسہ تھا۔ تانگے پر تین سواریاں بٹھانے کی اجازت تھی، چوتھا کوچوان ہوتا تھا۔

بھاٹی دروازے میں بھی لاہور کے دوسرے علاقوں کی طرح نوجوانوں میں پہلوانی کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اکثر کہا جاتا تھا کہ جس کو اکھاڑے کی مٹی نہیں لگی وہ بھاٹی دروازے کا ہی نہیں۔ یہاں رستم زماں کا اکھاڑا بڑا مشہور تھا۔ صبح و شام

پہلوانوں کو زور کرتے دیکھنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان دنوں گاما پہلوان، امام بخش پہلوان اور چھوٹے جوڑوں میں گاما برادران کا بھانجا غلام محی الدین، جیجو گھیٹے والا، پھجی ٹونی، حسینا دفتری، شفیع مشین والا، بالا جھیور اور بیسیوں چھوٹے موٹے پہلوان ہوتے تھے۔ دنگل ہر ہفتے ہوتے۔ بڑے جوڑوں کے دنگل منٹو پارک (حال اقبال پارک) میں منعقد ہوتے۔ کھیلوں میں کشتیوں کو اولیت حاصل تھی۔ کبڈی دوسرے نمبر پر تھی۔ اسی پارک میں گلی ڈنڈے کے میچ ہوتے۔ یکوں، تانگوں کی دوڑیں ہوتی تھیں۔ پہلوان بڑے پاکباز، حیادار اور شریف النفس تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ پہلوانی میں کامیابی صرف پاکبازی سے مل سکتی ہے۔ پہلوانوں میں اکثر یہ کہا جاتا کہ دماغ میں برائی کا خیال رکھ کر پہلوان اگر اکھاڑے میں اترے تو اسے چوٹ لگ جاتی ہے۔

بھاٹی دروازہ علماء، ادیبوں اور شاعروں کا مرکز رہا ہے۔ اس سلسلے میں بازار حکیماں میں فقیر خانہ سے منفرد صاحب علم پیدا ہوتے رہے ہیں۔ محلہ جوگیاں کے قریب میاں شہباز کی بیٹھک اہل علم و فن کی آماجگاہ تھی۔ ادبی، علمی اور شعری محفلیں اسی بیٹھک میں منعقد ہوتی تھیں۔ یہ میرے بچپن کا دور تھا۔ وہاں آنے جانے والوں کو دیکھتا ضرور تھا مگر ان کے علم و فضل سے بے خبر تھا۔ شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی محلہ سمیاں میں رہتے تھے۔ ان کی حویلی آج بھی موجود ہے۔

مفتی صاحب اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ ادبیات عربی کے ہیڈ تھے۔ ان کے فتاویٰ کئی جلدوں میں طبع ہوئے۔ ہائیکورٹ کے جج اس زمانے میں فقہی مسائل میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ پھر وہ یہاں سے ریٹائر ہو کر کلکتہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ ادبی، علمی اور شعری محفلوں میں وہ اکثر شرکت کرتے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب علامہ اقبال، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج اور دیگر شاعر ادیب علم و ادب کی شمع کو روشن رکھے ہوئے تھے۔ ان کی محفلیں اسی بازار حکیماں میں جمتی تھیں۔

حکیم احمد شجاع نے مفتی صاحب پر ایک جامع مضمون بھی لکھا تھا۔ مفتی صاحب

کے بیٹے مفتی انوار الحق ریاست بھوپال میں وزیر ماحولیات تھے۔ دیوانِ غالب کا نسخہ حمیدیہ انہوں نے ہی مرتب کیا تھا جو آج بھی والی بھوپال کے محل میں محفوظ ہے۔ معروف ادیب اور ڈرامہ نویس رحمٰن مذنب، مفتی صاحب کے خاندان سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ فقیر وحید الدین نے روزگار فقیر کے عنوان سے علامہ اقبال پر دو جلدیں اسی جگہ لکھیں۔ مشہور شاعر تنویر نقوی اسی فقیر خانہ فیملی سے منسلک تھے۔

بھاٹی دروازے کی امام بارگاہ مبارک بیگم ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ محترمہ مبارک بیگم صاحبہ سر مراتب علی کی اہلیہ تھیں اور ان کا تعلق بھی فقیر خانہ خاندان سے ہی تھا۔ مشہور افسانہ نگار آغا اشرف کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا۔

برصغیر کے مشہور افسانہ نگار دلاور حسین میرزا ادیب بھی بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح ہر گلی، ہر بازار کی مسجد میں علماء اور مشائخ بھی موجود تھے۔ اونچی مسجد کے معروف خطیب مولانا غلام مرشد نے اسی علاقے میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ مولانا ایک جید عالم دین تھے۔ بعد میں وہ شاہی مسجد کے خطیب بھی رہے۔ بھاٹی دروازے کے لوگوں میں دینی اور ملی جذبہ روشن رکھنے میں ان کی ذاتِ گرامی کا بڑا حصہ ہے۔

جس دور میں، میں نے ہوش سنبھالا وہ خاموش فلموں کا دور تھا۔ بھاٹی گیٹ میں زیادہ فلمیں انگریزی کی لگتی تھیں جو مار دھاڑ سے بھرپور ہوتی تھیں۔ اکثر پچیس پارٹ کی طویل فلمیں ہوتی تھیں۔ ٹارزن، پیڈرو بہادر کے نام جنگلی فلموں کے حوالے سے معروف تھے۔ اردو فلموں میں حاتم طائی کو بڑی شہرت ملی۔ یہ اتنی لمبی فلم تھی کہ لوگ شام کو کھانا کھا کر سینما ہال میں داخل ہوتے تھے اور صبح اذان کی آواز پر سینما ہال سے باہر نکلتے تھے۔ ٹکٹ دو آنے ہوتا تھا۔ اکثر پردیسی رات گزارنے کے لئے سینما ہال میں آ جاتے تھے اور رات کبھی سو کر، کبھی فلم دیکھ کر گزار دیتے تھے۔

میاں رشید کاردار (اے آر کاردار) فلمی دنیا کی ایک نامور شخصیت تھے۔ وہ بھاٹی دروازے ہی کے رہنے والے تھے۔ لاہور میں فلم سازی کا آغاز انہوں نے ہی کیا۔

چند خاموش فلمیں بھی بنائیں۔ بولتی فلموں میں باغی سپاہی بڑی مشہور فلم تھی۔ اس فلم کے ہیرو گل حمید تھے۔ گل حمید اس دور کے مشہور اور خوبصورت ترین ہیرو تھے۔ انہوں نے کلکتہ اور بمبئی کی کئی فلموں میں کام کیا اور شہرت کمائی۔ گل حمید کی آخری فلم ''خیبر پاس'' تھی۔ یہ اتنا بہادر فلم ایکٹر تھا کہ فائٹ اور ایکشن نیچرل کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہی قلعے کے نزدیک شوٹنگ ہو رہی تھی، گھوڑے کو سرپٹ دوڑا کر لانا تھا اور پھر گھوڑے سے چھلانگ لگانی تھی۔ گل حمید ماہر شہسوار بھی تھا۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا اور دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سے پکی سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ وہاں موجود عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔ آدمیوں کے رنگ اُڑ گئے۔ مگر گل حمید مسکرا رہا تھا۔ لیکن سڑک پر پھسلنے سے اس کے گھٹنے زخمی ہو گئے تھے۔ گل حمید گلے کی بیماری میں مبتلا ہو کر پشاور کے قریب اپنے گاؤں میں چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

میاں کاردار نے لاہور میں اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ ایم اسماعیل بھی بھاٹی دروازے میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے ساٹھ سال فلمی دنیا میں گزارے اور مرتے دم تک شہرت کے آسمان پر جگمگاتے رہے۔ ''خزانچی'' فلم سے انہیں بے پناہ شہرت ملی۔ پاک و ہند کے مشہور ڈائریکٹر ایم صادق بھی اسی دروازے کے باسی تھے۔

مشہور گلوکار محمد رفیع جو بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے، وہ بھاٹی گیٹ کے اندر اونچی مسجد کے قریب گلی میں کاروبار کرتے تھے۔ ان کی دُکان کے اندر ایک پردہ لگا ہوتا۔ اس پردے کے پیچھے رفیع نے ایک ہارمونیم رکھا ہوتا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ جاتے اور گانا شروع کر دیتے۔ انہیں کلاسیکی موسیقی کا بہت شوق تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنا عروج عطا کیا کہ آج بھارت کے میوزک ڈائریکٹر کہتے ہیں کہ ایسا گلوکار صدیوں میں بھی پیدا نہیں ہوگا۔ آج اس کی نقل میں وہاں لوگ گانے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام ہو کر دو چار ٹھوکریں کھا کر وہیں رہ جاتے ہیں۔

بھاٹی دروازے کا ایک نام اور بہت مشہور تھا۔ اس کا نام تاجی تھا۔ یہ استاد منظوم پنجابی قصے کہانیاں سنا کر لوگوں پر ایک طرح سے جادو کر دیتا تھا۔ اس کے بعد اس کے

شاگرد مشہور گائیک علی بخش ظہور نے گلوکاری کے حوالے سے برصغیر میں بڑا نام پیدا کیا۔ محمد شفیع ناگی کا نام بھی ان دنوں لاہور میں بڑا مشہور تھا۔ اس طرح اگر بھاٹی گیٹ کی پوری شخصیتوں کا ذکر کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے گی۔

۶

محترم آفتاب فرخ صاحب کا تازہ خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے گزشتہ مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لاہور شہر بلکہ اندرون لاہور شہر کی قدیم ثقافت پر روشنی ڈالتے ہوئے موچی دروازے کا خاص طور پر حوالہ دیا ہے جس کے گلی کوچوں میں ان کا بچپن گزرا۔ لاہور کے علاوہ اپنے ننھیال کی طرف سے ان کا امرتسر کی مسلم ثقافت کے ساتھ بھی گہرا رشتہ رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''برادرم حمید صاحب! کل کا کالم پڑھا۔ آپ میں اور مجھ میں کافی ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس نے لاشعوری طور پر سالہا سال سے مجھے آپ کے کالم بارش سماوار کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ آپ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے اور میرے درمیان شوق سیاحت اور ذوق موسیقی اور گلیوں محلوں سے دلچسپی اور محبت مشترکہ ذوق ہیں۔ آپ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ آپ واقعی اجنبی شہروں اور دور دراز کے جنگلوں میں گھومتے رہے ہیں۔ ورنہ میں سری لنکا اور جنگلات کو افسانوی چیزیں ہی سمجھتا رہا۔ جہاں تک میرے شوق سیاحت کا تعلق ہے، چین اور روس کے علاوہ تقریباً دنیا کے ہر خطے میں گھوم پھر آیا ہوں۔ اوائل عمر یعنی کالج کے زمانے میں سائیکل ریس میں پاکستان میں نمایاں ہونے کی وجہ سے آسٹریلیا اور اولمپکس میں پاکستان کی نمائندگی کر چکا ہوں۔ جہاں تک میرے ذوق موسیقی کا تعلق ہے میں آج بھی عنایت بائی ڈھیرو والی کی گائی ہوئی غزل سازیہ کینہ ساز کیا جانیں سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔ اس بھولی بسری

گلوکارہ کا نام اس وجہ سے یاد رہا کہ یہ میرے بچپن میں سنی ہوئی آوازوں میں سب سے زوردار بلکہ کڑک دار آواز تھی۔ مجھے یاد ہے محلے میں کوئی شادی یا خوشی کی تقریب ہوتی تھی تو ہمارے قدیم مکان کی کشادہ بیٹھک کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ ایک بار محلے میں شادی کی ایک تقریب کے موقع پر اس وقت کی نامور گلوکارہ عنایت بائی کو بلایا گیا۔ یہ اس زمانے میں ایک رواج سا بن گیا تھا کہ صاحب ثروت لوگ شادی بیاہ کے موقعوں پر کسی مشہور قوال یا کسی مشہور گانے والی کو ضرور بلاتے تھے۔ زمین سے ذرا اونچائی پر ایک تخت پوش لگ جاتا تھا جس پر گانے والے یا گانے والی گلوکارہ کے لئے گاؤ تکیے لگا دیئے جاتے تھے اور گلوکارہ بڑے ادب آداب کے ساتھ سر پر دوپٹہ اوڑھے بڑی سنجیدگی سے استاد شاعروں یا صوفی شعراء کا عارفانہ کلام سناتی تھی۔ عنایت بائی کی آواز بڑی کڑک دار تھی۔ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر یا مائیک سسٹم تو نہیں ہوتا تھا۔ آج کے گلوکار اور گلوکارائیں تو مائیکرو فون کے بغیر گا ہی نہیں سکتیں۔ ویسے بھی گاتے ہوئے وہ گاتی کم اور اداکاری زیادہ کرتی ہیں۔ ان کی اداکاری میں ان کی ادائیں زیادہ کاری ہوتی ہیں۔ عنایت بائی نے استاد داغ کی غزل گانی شروع کی تو اس کی آواز تیسرے محلے تک پہنچ رہی تھی۔

شادی والے دن صبح نو دس بجے ہی بینڈ باجے والے آجاتے تھے اور شادیانے بجانا شروع کر دیتے تھے۔ محلے کی بیٹھکوں میں دریوں کے فرش بچھ جاتے تھے۔ گلی میں دونوں جانب کرسیاں لگ جاتی تھیں اور مہمان آنا شروع ہو جاتے تھے۔ پھر گیارہ بارہ بجے جنج چڑھتی تھی۔ براتی بینڈ باجے والوں کو ویلیں دیتے دلہن کے گھر پہنچتے تھے۔ وہاں پہلے ہی سے فرش پر دستر خوان بچھے ہوتے تھے۔ دیگیں پک چکی ہوتی تھیں۔ ضروری رسومات کے بعد باراتی فرشی دستر خوان پر آمنے سامنے بیٹھ جاتے تھے اور کھانا تقسیم ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ نوجوان لڑکے پلاؤ سے بھرے ہوئے ٹاکو کے درمیان شوربے کا پیالہ جمائے جس میں گن کر دو ایک بوٹیاں ہی رکھی ہوتی تھیں۔ پلیٹ کے اندر ہی ایک طرف ایک چھوٹی پلیٹ ساگ گوشت کی اور دوسری سائیڈ پر ایک چھوٹی ٹھوٹھی میں آلو

بگھارے کی چٹنی اور ساتھ ہی فرنی کا جوٹا پلاؤ کے اندر فٹ ہوتا تھا اور مجھ جیسے سات آٹھ سال کے لڑکے صفوں کے درمیان ایک ہاتھ میں گلاس، دوسرے میں پانی کا جگ لے کر پانی پانی دھیمی آواز میں کہتے گردش کرتے تھے۔ کچھ اور لڑکے تکلفاً کچھ اور چاہئے جناب پوچھتے پھرتے تھے۔ مگر کسی شے کی فرمائش کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نائی سے کھانے پکوانے والے بھی خاندان کے تجربہ کار افراد ہوتے تھے اور کھانے کے ناکوؤں یا تام چینی کی تھالیوں میں کھانا لگوانے بھی خاندان کے جہاں دیدہ اور بزرگ افراد ہوتے تھے۔ یہ ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ کھانا تقسیم بھی خاندان کے لڑکے کرتے تھے۔ بیروں کا اس زمانے میں تصور بھی نہیں تھا۔

مجھے یاد ہے کہ امرتسر میں کمہار کے ہاں سے تازہ ناکو منگوائے جاتے تھے۔ ہمارے ماموں یا خالو کے طویلوں سے بگھی اور گھوڑی باہر نکل آتی تھی۔ مہندی کی رات کو کشمیریوں کی روایت کے مطابق وڑی بھتہ پکایا جاتا تھا اور بعد ازاں نمکین کشمیری چائے کے علاوہ کھنڈ کلچوں اور باقر خانیوں کے طشت تخت پوشوں پر موجود ہوتے تھے۔ خاندان کی بچیاں ڈھولک پر ساری رات مہندی کے گیت گاتی تھیں۔

لاہور شہر میں ان دنوں شمشاد بیگم، امراؤ ضیاء بیگم اور نور جہاں کے گانوں کی گونج ہر جگہ سنائی دیتی تھی۔ ریڈیو پر ان دونوں گلوکاراؤں کے علاوہ اختری بائی فیض آبادی کے سریلے نغمے بھی سنائی دیتے تھے۔ مجھے رشک آتا ہے حمید صاحب! کہ آپ نے ریڈیو سٹیشن میں رہ کر ان گلوکاروں کو خوب سنا ہوگا۔

چھٹیوں میں، میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ امرتسر اپنے ننھیال جایا کرتا تھا۔ امرتسر کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی کی پوڑیاں، صوفی صاحب قاندرو کے کلچے، تافتان اور امرتسری مسلمانوں کی ثقافت کی دوسری اہم نشانیاں آج بھی یاد آتی ہیں جنہیں یہ لوگ امرتسر سے ہجرت کے بعد اپنے ساتھ ہی پاکستان لے آئے تھے۔"

محترم آفتاب فرخ صاحب نے قدیم لاہور میں بیاہ شادیوں کی منظر کشی جس پُر اثر بلکہ بے ساختہ طریقے سے کی ہے مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ اگرچہ میری پیدائش امرتسر

کی ہے مگر لاہور سے بھی میری بچپن سے لے کر جوانی تک کی یادیں وابستہ ہیں اور مجھے میرے بچپن اور نوعمری اور نوجوانی کا لاہور بہت یاد آتا ہے۔ ہماری بڑی ہمشیرہ صاحبہ شروع ہی سے لاہور میں آباد تھیں۔ ہماری کشمیری برادری کے دوسرے کئی عزیز بھی لاہور میں رہتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اکثر امرتسر سے لاہور آتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں امرتسر سے لاہور تک کا ریل کا واپسی کا کرایہ تین آنے لگتا تھا۔ زرد رنگ کی تھرڈ کلاس کی ٹکٹ ہوتی تھی۔ واپسی اسی ریٹرن ٹکٹ پر ہوتی تھی۔ میری عمر چار یا پانچ سال کی تھی۔ مجھے یاد ہے، میں ریل گاڑی میں اپنی والدہ یعنی آپو جی کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوتا تھا۔

رشتے داروں کے ہاں بیاہ شادیوں پر بھی ہم ضرور لاہور آتے تھے اور وہی منظر ہوتا تھا جسے آفتاب فرخ صاحب نے اپنے خط میں پیش کیا ہے۔ میری عمر اگرچہ چھوٹی تھی مگر اس زمانے کی یادوں کا ایک بھی نقش دھندلا نہیں ہوا۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے میری یادداشت کی حس کو بنایا ہی گزرے زمانے کے نقش و نگار، اس زمانے کے لوگوں، اُن کی باتوں، باغوں، درختوں، دریاؤں، بارشوں، تیز آندھیوں، گرجتے بادلوں اور سنسان گلیوں میں صبح دم سنائی دیتی سالہا سال سے آنے والے فقیروں کی صداؤں کو یاد رکھنے کے لئے ہے۔ گزرا ہوا زمانہ اپنی تمام تر توانائیوں اور تابناکیوں کے ساتھ میرے نئے زمانے کے ساتھ چلتا ہے اور گزرتے لمحے کے ہر موڑ پر مجھے اپنی خوبصورت شکل دکھاتا ہے۔

اس زمانے میں لاہور کے سٹیشن کے سامنے والے ریوالی سینما میں ہفتے میں ایک دو بار انگریزی فلمیں لگا کرتی تھیں۔ امرتسر میں چھاؤنی والے سینما میں انگریزی فلمیں چلتی تھیں جہاں گورے فوجی آیا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی میری پسند کی فلم لگتی تو امرتسر کے چھاؤنی والے سینما میں فلم دیکھنے ضرور جاتا تھا۔ میں ایم اے او ہائی سکول میں پانچویں جماعت میں پڑھا کرتا تھا۔ امرتسر کی چھاؤنی والے سینما گھر میں، میں نے مشہور امریکی مزاح نگار مارک ٹوئن کی زندگی پر مبنی فلم "دی ایڈونچر آف مارک ٹوین" دیکھی تھی۔ اس

زمانے میں لاہور کے ریوالی سینما میں ہارر فلم ''رینکن سٹائن'' لگی تو میں اس کا شو دیکھنے گھر سے بھاگ کر لاہور آیا تھا اور فلم دیکھ کر وہیں سے سیدھا لاہور سٹیشن سے پٹھان کوٹ جانے والی گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر واپس پہنچ گیا تھا۔

محترم آفتاب فرخ صاحب نے کھنڈ کلچوں، نانفتانوں اور باقر خانیوں کا ذکر کیا ہے۔ لاہور میں ہی یہ فن کشمیری نانفدوروں کے ساتھ ہی وابستہ تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ لاہور کے کھنڈ کلچے اور باقر خانیاں امرتسر کے کھنڈ کلچوں، باقر خانیوں اور نمکین کلچوں کا مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ وہ فرق ہو جو لاہور اور امرتسر کے پانی میں تھا۔ اس زمانے میں بھی لاہور کے پانی کو ہم کھارا کہا کرتے تھے۔ امرتسر کا پانی میٹھا ہوتا تھا۔

بہر حال لاہور تو پھر بھی لاہور ہی ہے۔ بچپن ہی سے ہمارا لاہور میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ امرتسر سے لاہور پینتیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ضلع کچہریوں کے سامنے گورنمنٹ کالج والی دیوار کے سائے میں ایک سنگ میل لگا ہوتا تھا جس پر ''امرتسر پینتیس میل'' لکھا ہوتا تھا۔

لاہور کے باغ ان دنوں بڑے سرسبز و شاداب ہوتے تھے۔ فصیل شہر کے گرد جو باغ تھا وہ بھی بڑا ہرا بھرا تھا اور اس میں سے ایک چھوٹی سی نہر جسے سُوا کہتے ہیں گزرا کرتی تھی۔ اس میں ٹھنڈا ٹھنڈا ریتلا پانی بہا کرتا تھا۔ اب اس نہر کا صرف نقش پا ہی باقی رہ گیا ہے جس میں جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ فصیل شہر کے گرد والا ہرا بھرا باغ آج بھی میری یادوں میں شگفتہ اور تر و تازہ ہے۔

موچی دروازے میں داخل ہو کر بائیں طرف جائیں تو سیدھے ہاتھ کو پھولوں کی ایک دکان ہے۔ گرمیوں کے موسم میں وہاں موتیئے کے ہار اور گجرے مہکتے تھے اور سردیوں میں سرخ گلاب کے پھول اور گیندے کے ہار سجے ہوتے تھے۔ وہ دکان شاید اب بھی ہے مگر مجھے پرانی دکان بہت یاد آتی ہے۔ اس دکان پر ایک بزرگ سفید بے داغ پگڑی باندھے صاف ستھرے کپڑے پہنے بیٹھا کرتے تھے۔ بلی آنکھیں تھیں۔

چہرے پر نور برستا تھا اور ایک دلآویز تبسم ہر وقت ان کے چہرے پر کھلا ہوتا تھا۔ بڑا مہربان اور نرم دل شفیق چہرہ تھا۔ افسوس کہ مجھے ان بزرگ کا نام یاد نہیں رہا۔ میری شادی موچی دروازے میں ہوئی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ میری شادی کس خاندان میں ہوئی ہے۔ میں وہاں سے گزرتے ہوئے انہیں ضرور سلام کرتا تھا۔ وہ بڑی محبت سے سلام کا جواب دیتے اور فوراً گلاب کے دو تین پھول سبز ٹہنیوں کے ساتھ دھاگے لپیٹ کر مجھے عنایت کرتے۔ میری طرف دیکھ کر صرف مسکراتے رہتے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ گرمیوں کا موسم ہوتا تو مجھے دو تین گجرے سبز پتوں میں لپیٹ کر موتیے کے پھولوں پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا مار کر دیتے۔ پھولوں کی صحبت میں رہ کر ان کے چہرے پر بھی پھولوں کی معصومیت اور شگفتگی چھائی رہتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نے پھولوں کی گدی سنبھالی۔ دراز قد، دبلے پتلے تھے۔ آنکھیں اپنے والد صاحب کی طرح بلی تھیں۔ انہوں نے بھی مجھے پھول ادا کرنے کی خوبصورت ادا کو نبھایا۔ اب مدت ہوئی میرا اس طرف آنا نہیں ہوا۔ وہ جہاں بھی ہیں، میرے دل میں ان کے لئے محبت اور دعائیں ہیں۔ یہ لوگ لاہور کے لعل و گوہر ہیں۔

لوہاری دروازے کے باہر ایک دوسرے سے ملی ہوئی پھولوں کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ میں مصری شاہ سے پیدل ہی باغوں باغ لوہاری دروازے اپنے پبلشروں یعنی مکتبہ اردو اور نیا ادارہ جایا کرتا تھا۔ لوہاری دروازے والی مسجد کے قریب سے ہو کر میں بائیں ہاتھ مڑ کر پھولوں کی دکانوں کے بالکل قریب سے ہو کر اور بڑی آہستہ آہستہ گزرا کرتا تھا اور لمبے لمبے سانس لیا کرتا تھا کیونکہ ان دکانوں کے اردگرد کی فضا موتیا، گلاب اور طرح طرح کے پھولوں سے معطر رہا کرتی تھی۔ اب وہاں کاغذ کے پھول اور کرنسی نوٹوں کے کاغذی پھولوں والے ہار انسانوں کے جسموں کو تو خوب سجا دیتے ہیں مگر روح کی تازگی چھین لیتے ہیں۔ روح کی خوشبو کو آلودہ کر دیتے ہیں۔

پھولوں والی ان دکانوں کے سامنے پھلوں کی ایک دکان ہوا کرتی تھی۔ چونک انارکلی سے لوہاری کی طرف جائیں تو دس قدم پہلے سے قسم قسم کے پھولوں کی خوشبوئیں

آنا شروع ہو جاتی تھیں۔ دکان کے قریب پہنچیں تو یہ خوشبوئیں اتنی گہری ہو جاتی تھیں کہ آدمی کو لگتا تھا کہ وہ خوشبوؤں کے جنگل میں آ گیا ہے۔ قریب سے گزر جائیں تو لوہاری کے دروازے تک یہ خوشبوئیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ اب وہاں انگریزی دوائیوں اور عینکوں کی دکانیں ہیں۔ پہلے وہاں سے لوگ انار، انگور، کیسری لوکاٹوں کے گچھے، سیب اور ناشپاتیاں کاغذ کے بادامی لفافوں میں ڈال کر لے جایا کرتے تھے۔ اب دوائیوں کے لفافے بھر کر، عینکیں لگا کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ لیکن عینک لگا کر بھی وہاں ٹھنڈے پانی میں تر کئے ہوئے موتیے اور گلاب کے سرخ پھول دکھائی نہیں دیتے۔

⊚......⊚

۷

قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لمبے عرصے میں لاہور شہر کی شکل کافی حد تک بدل چکی ہے۔ 1947ء کے منظر تبدیل ہو گئے ہیں، کچھ منظر دھندلے پڑ گئے ہیں، کچھ اتنے تبدیل ہو گئے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے اور کچھ بالکل ہی غائب ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر شاہراہِ قائدِاعظم (دی مال) کے ریگل چوک کو ہی لے لیں۔ چوک میں جہاں بیڈن روڈ آ کر ختم ہوتی ہے وہاں سے بائیں جانب مڑیں تو سب سے پہلے کونے والی دکان لاہور کے مشہور فوٹوگرافر بھٹی فوٹو گرافر کی تھی۔ پورٹریٹ بنانے میں بھٹی صاحب کا جواب نہیں تھا۔ چھوٹا سا سٹوڈیو ہوتا تھا جہاں ہر قسم کی لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ اب پتہ نہیں بھٹی صاحب کا یہ فوٹو سٹوڈیو ہے یا نہیں۔ اس دکان کے آگے باٹا کی دکان تھی یا شاید لاہور کا مشہور ریسٹورنٹ شیزان ہوتا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ ہی تھے۔ باٹا کی دکان بڑی کشادہ تھی۔ اونچی چھت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں ایئر کنڈیشنر کے بغیر ہی دکان کی فضا میں بڑی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ گاہکوں کا رش کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ بس ایک دو گاہک ہی پاؤں میں جوتے ڈال کر ٹرائی کرتے نظر آتے تھے۔ اب تو جوتوں کی دکانوں پر بھی اتنا رش ہوتا ہے کہ لگتا ہے جیسے سارے لاہور شہر کے جوتے چوری ہو گئے ہیں۔

اب یاد آیا کہ شیزان ریسٹورنٹ، بھٹی فوٹو گرافر کے بالکل ساتھ ہوتا تھا۔ یہ بڑا بیورو کریٹ قسم کا ریسٹورنٹ تھا۔ یہاں زیادہ تر ارسٹو کریٹ قسم کے سیاسی لیڈر اور سیاسی

دانشور آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ فضا میں برٹش کافی اور قیمتی سگاروں کی خوشبو پھیلی رہتی تھی۔ باہر اور اندرون شہر کا آدمی داخل ہوتے ہوئے جھجکتا تھا۔ اسی سہ منزلہ پرانی مگر بڑی مضبوط بلڈنگ میں شیزان اور باٹا کی دکان سے آگے بھی کچھ دکانیں تھیں۔ وہ کس چیز کی دکانیں تھیں یہ مجھے اب یاد نہیں رہا۔

اس بلڈنگ کے آگے ایک لمبی اک منزلہ عمارت تھی۔ یہ عمارت اب بالکل غائب ہو چکی ہے۔ اس عمارت کی پہلی منزل کا لمبا چھتا ہوا برآمدہ تھا۔ عمارت کے شروع کے تین چار پرانی ٹائپ کے کمروں میں انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کے دفاتر ہوا کرتے تھے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ اخبار کے ایک کمرے کے باہر پیتل، تانبے کی پلیٹ پر کندہ کیا ہوا لکھا تھا........ ”یہاں انگریزی زبان کا مشہور ادیب رڈیارڈ کپلنگ کام کیا کرتا تھا۔“

قیام پاکستان سے پہلے میں کبھی کبھی اپنے دوست ظہور الحسن ڈار کے ساتھ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی عمارت میں آیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے کا مشہور ادیب اور صحافی شبلی بی کام اس انگریزی اخبار میں ملازم تھا اور وہ ظہور الحسن ڈار کا دوست تھا۔ شبلی بی کام اخبار کا کامرس سیکشن مرتب کرتا تھا۔ اس کا مال روڈ کے رخ پر چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پان کے قوام کی خوشبو آتی تھی۔ شبلی صاحب پان بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ڈھلتی عمر کے دبلے پتلے، جھکی ہوئی کمر والے مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ علم نجوم میں بھی دسترس تھی۔ اس زمانے کے مشہور ادبی رسالے ”عالمگیر“ اور ہفتہ دار ”عالمگیر“ کو بھی ایڈیٹ کرتے تھے۔ شبلی بی کام اور احسان بی اے، اس زمانے کے جانے پہچانے نام تھے۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ساتھ ہی انگریزی اخبار ”ٹریبون“ کے دفاتر بھی اسی عمارت میں تھے۔ دفاتر کے پیچھے پریس تھا جہاں یہ اخبار چھپتے تھے۔ ہیڈن روڈ سے ایک راستہ اس پریس کو جاتا تھا اور اس پریس کے ورکرز آیا جایا کرتے تھے۔ اب یہ ایک منزلہ عمارت نظروں سے غائب ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ بڑے بڑے شاپنگ سینٹر تعمیر ہو

گئے ہیں جن کی زیر زمین دکانیں بھی ہیں اور یہاں صبح سے شام تک بے پناہ رش ہوتا ہے۔ ان شاپنگ پلازوں کے آگے مال روڈ کی ذیلی سڑک پر اتنی موٹر کاریں اور موٹر سائیکلیں کھڑی ہوتی ہیں کہ جو گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا اور جو نئی گاڑیاں آتی ہیں انہیں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ملتی۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ اور ٹریبون انگریزی اخباروں والی ایک منزلہ عمارت کے آگے ایک اور دو منزلہ بہت بڑی اور قدیم طرز کی عمارت ہوتی تھی۔ اس عمارت میں رولو فوٹو گرافر کی دکان ہوا کرتی تھی۔ مسٹر رولو کے بارے میں مجھے علم نہیں کہ وہ جرمن تھے یا انگریز تھے۔ بہرحال ان کی فوٹو گرافی کا بڑا شہرہ تھا۔ شادی شدہ جوڑے اپنی شادی کی یادگار فوٹو رولو فوٹو گرافر سے ہی بنواتے تھے۔ یہ مہنگا فوٹو گرافر تھا مگر اس کی بنائی ہوئی فوٹو میں بوڑھی عورت بھی جوان لگتی تھی۔ رولو فوٹو گرافر کے آگے چینی دندان ساز اور چینی جوتے بنانے والوں کی دو تین دکانیں تھیں۔ جوتے بنانے والی چینی دکانوں کے نام اگر میں بھول نہیں رہا تو HOBSON اور FIPSON تھے۔ ان کے بنائے ہوئے جوتے مہنگے ہوتے تھے مگر اتنے مضبوط اور پائیدار ہوتے تھے کہ لاہور کی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔ ان سے امیر لوگ ہی جوتے بنواتے تھے۔

اس زمانے میں سونے کا دانت لگوانے کا بڑا رواج تھا جس نے ایک آدھ سونے کا نقلی دانت لگوایا ہوتا تھا وہ موقع نہ بھی ہو تو ہنستا رہتا تھا۔ یہ دندان ساز اور موچی چینی کافی مدت سے لاہور میں آباد تھے اور اُردو پنجابی بڑی روانی سے بولتے تھے۔ اپنی دکانوں کے آگے شام کے وقت کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور اپنی مادری چینی زبان میں ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ جب ان کی دکانوں کا منظر غائب ہوا تو اس کے ساتھ یہ چینی بھی غائب ہو گئے۔

اس پرانی عمارت کی دوسری منزل پر پاکستان کے مشہور مصور مجسمہ ساز آذر زوبی کا کمرشل آفس بیڈن روڈ پر مال روڈ کی طرف جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کی ایک کشادہ گلی

کے آخر میں بھی تھا۔ اس گلی کے شروع کے ایک مکان میں "نوائے وقت" کا آفس بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کی سیڑھیاں گلی میں سے اوپر جاتی تھیں۔ میں امرتسر سے جب بھی لاہور آتا تو صرف حمید نظامی صاحب کے نیاز حاصل کرنے بلکہ انہیں دیکھنے کے لئے بیڈن روڈ والے اس دفتر میں ضرور آتا تھا۔ دوسری منزل والے کمرے میں ایک بڑی سی میز بچھی ہوتی تھی۔ اس میز کے پیچھے جناب حمید نظامی صاحب بیٹھتے تھے۔ سامنے چار پانچ کرسیاں رکھی ہوتی تھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ م۔ش صاحب کو اسی آفس میں دیکھا تھا۔ وہ ان کی ڈھلتی جوانی کا زمانہ تھا اور مجھے یاد ہے کہ ان کے سر پر بڑے گنجان بال ہوا کرتے تھے۔ وہ ٹیلی فون پر کسی انگریزی اخبار کے ایڈیٹر سے انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ اور مجھے یاد ہے حمید نظامی صاحب ان کی طرف دیکھ کر ہلکے ہلکے مسکرا رہے تھے۔ "نوائے وقت" اخبار کے دفاتر وغیرہ اوپر والی یعنی تیسری منزل پر ہوتے تھے جہاں ایک مہندی رنگی داڑھی والا بزرگ خزانچی یا شاید ہیڈ کلرک بڑی سی کرسی پر بیٹھا ہر آنے جانے والے کو اپنی عینک کے موٹے شیشوں کے پیچھے سے گھور کر دیکھا کرتا تھا۔ بعد میں "نوائے وقت" کے دفاتر یہاں سے اٹھ کر مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ میں آ گئے۔

یہ گلی جس میں آذر زوبی کا مکان تھا (بلکہ جو مکان اس نے الاٹ کروایا تھا) زوبی کے مکان پر جا کر بند ہو جاتی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں اُردو ادب کے احیاء یعنی نئے سفر کے ساتھ ہی ادبی رسالوں اور ادبی کتابوں کی تزئین و آرائش کرنے کے سلسلے میں زوبی کی بڑی شہرت ہو گئی تھی۔ زوبی پینٹنگ بھی کرتا تھا اور کمرشل آرٹ کا بھی ماہر تھا۔ اس کے بنائے ہوئے ادبی کتابوں کے سرورق اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے تھے۔ میں اور اشفاق احمد اکثر زوبی سے ملنے اس کے گھر جایا کرتے تھے۔ بیڈن روڈ والی گلی میں اس کا جو آفس اور سٹوڈیو تھا وہیں اس کا گھر بھی تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا ایک مکان اچھرہ میں بھی تھا۔ زوبی کا ایک سٹوڈیو باغ جناح کی اوپن ایئر والی پہاڑی کے اوپر بھی تھا جہاں بعد میں صادقین صاحب نے اپنا سٹوڈیو بنایا۔ آذر زوبی

ورزشی جسم والا خوبصورت آدمی تھا۔ بعد میں وہ کراچی شفٹ ہو گیا۔ آخری بار میں اسے کراچی میں ملا تو اس نے رات کے کھانے پر مجھے اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب "SOMETHING WITHOUT COLOUR" پیش کی۔ اس نے کتاب پر لکھا:

"بہت ساری حسین یادوں کے ساتھ اپنے اے حمید کے لئے......

آزر زوبی

28-8-87 کراچی"

کتاب میں زوبی کا بنایا ہوا سعادت حسن منٹو کا بڑا خوبصورت سکیچ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ظہیر کاشمیری، اشفاق احمد، سید امتیاز علی تاج اور مولانا صلاح الدین احمد کے زوبی کے بنائے ہوئے مجسموں کی فوٹوز بھی شامل ہیں۔

آرٹسٹ آذر زوبی کا ذکر میں نے اس حوالے سے شروع کیا تھا کہ میں لاہور کے گمشدہ منظر کے سلسلے میں مال روڈ والی جس گمشدہ بلڈنگ کے بارے میں لکھ رہا تھا اس میں بھی آذر زوبی کا ایک کمرشل آفس تھا۔ اس بلڈنگ کی تنگ و تاریک، لمبی ڈیوڑھی میں سے گزر کر آگے تنگ سیڑھیاں تھیں جو فرش سے لے کر اوپر دوسری منزل کی چھت تک چلی گئی تھیں۔ مکتبہ اردو کی جانب سے میرا نیا ناول "جنگل روتے ہیں" زیر طبع تھا اور زوبی اس کا سرورق بنا رہا تھا۔ چنانچہ میں اس سلسلے میں زوبی سے ملنے گیا تھا۔

اس بلڈنگ میں ذرا آگے جا کر کشمیر سٹور تھا۔ یہ جنرل مرچنٹ کی دکان تھی۔ یہاں سے ہم ٹوئل کی ٹائیاں، چیکوسلواکیہ کے رومال اور پرفیومز وغیرہ خریدا کرتے تھے۔ جب بھی کسی کتاب کے پیسے ملتے تو میں کشمیر سٹور سے اپنی حیثیت کے مطابق تھوڑی بہت شاپنگ ضرور کیا کرتا تھا۔

کشمیر سٹور سے دو قدم آگے CHALET نام کا ایک کیبنٹ سائز کا کافی ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ ایک تنگ سیڑھی اوپر جاتی تھی۔ اوپر ایک چھوٹا سا کیبن بنا ہوا تھا اور اس کے اوپر ایک اور کیبن تھا۔ یہاں فریج کافی اور سینڈوچز وغیرہ ملتے تھے۔ یہاں کی کافی بے حد لذیذ اور زیادہ کریم والی ہوتی تھی۔ کشمیر سٹور تو میرا خیال ہے اپنی جگہ پر قائم ہے

لیکن وہ چھوٹا سا فرنچ کافی ہاؤس غائب ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''انڈس ہوٹل'' ہوتا تھا جو شاید اب بھی ہے مگر اس کا حلیہ بدل گیا ہے۔

اس ہوٹل کے پہلو سے ایک راستہ آگے وکٹوریہ پارک کو جاتا ہے جہاں آرٹسٹ مجمی کا سٹوڈیو تھا اور ایکٹریس صبیحہ خانم ایک کوٹھی میں رہا کرتی تھیں۔ اس پارک میں ریڈیو پاکستان لاہور کی مشہور و معروف آپا شمیم کا مکان بھی تھا۔ یہ ایک کشادہ اور پرانی ٹائپ کا کوارٹر نما مکان تھا۔ آپا شمیم کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پینے ہم وہاں آیا کرتے تھے۔ یہاں سے ایک راستہ آگے کوپر روڈ اسلامیہ گرلز کالج کی طرف نکل جاتا تھا۔ اب معلوم نہیں یہاں کے مناظر کی کیا حالت ہے۔ مدت ہوئی وہاں سے میرا گزر نہیں ہوا۔

میں مال روڈ والے انڈس ہوٹل کا ذکر کر رہا تھا۔

اگر میں بھول نہیں رہا تو پہلے اس ہوٹل کا نام انفسلن ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ کراچی کے مشہور و معروف فلمی رسالے ''نگار'' کے مالک اور چیف ایڈیٹر الیاس رشیدی صاحب اور نامور شاعر مجید امجد لاہور آتے تو اسی ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ الیاس رشیدی صاحب بڑی محبت کرنے والے اور دوستوں کے کام آنے والے انسان تھے۔ میں ''نگار'' رسالے کے لئے مضمون بھیجتا تو اس کا معاوضہ اسی وقت منی آرڈر کر دیا کرتے تھے۔ انہیں لاہور آنا ہوتا تو مجھے خط لکھ دیتے، میں فلاں تاریخ کو لاہور پہنچ رہا ہوں۔ دو تین مضمون اکٹھے لکھ رکھنا۔ میں مضمون لکھ رکھتا تھا۔ جب وہ لاہور آتے تو میں مضمون لے کر انڈس ہوٹل پہنچ جاتا تھا۔ بڑی محبت اور پیار سے ملتے۔ مضمون لے کر بریف کیس میں رکھتے اور مجھے اسی وقت معاوضہ دے دیتے۔ کبھی ابراہیم جلیس بھی میرے ساتھ ہوتا تھا۔

ساہیوال (منٹگمری) سے مشہور شاعر مجید امجد لاہور آتا تو وہ بھی انڈس ہوٹل میں ہی ٹھہرتا تھا۔ سینئر شعراء میں مجید امجد کا بڑا مقام تھا۔ ایک مشہور نقاد نے اسی زمانے میں مجید امجد کے بارے میں لکھا تھا کہ ایسا با کمال نظم کہنے والا شاعر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ اس کا سلوک اور برتاؤ بڑا مشفقانہ تھا۔ جب بھی لاہور آتا کسی کے ہاتھ پیغام بھیج کر مجھے بلوا لیتا۔ مجھے پتہ چلتا تو میں خود انڈس ہوٹل اس کے کمرے میں پہنچ جاتا۔ وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ بڑے موٹے شیشوں والی عینک لگاتا تھا۔ بزدلی کی حد تک شریف اور ڈرا ڈرا سا انسان تھا مگر شاعر کمال کا تھا۔ نظم لکھنے میں اس کا کوئی جواب

نہیں تھا۔ دھیمے سُروں میں بات کرتا تھا۔ بات کرتے وقت اس کی عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی بڑی بڑی آنکھیں فرطِ حیرت سے پوری کھلی ہوتی تھیں جنہیں دیکھ کر میرے بدن میں تشویش کی لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے بھی اس کی نظر کمزور تھی۔ وہ شام کے وقت بغیر کسی دوست کے سہارے کے مال روڈ پر نہیں نکلتا تھا۔ اس کی گفتگو بڑی دانشورانہ ہوتی تھی۔ اُردو شاعری اور افسانہ نگاری پر بڑی عالمانہ باتیں کیا کرتا تھا جو میری سمجھ سے باہر ہوتی تھیں مگر میں اسی طرح سر ہلایا کرتا تھا جیسے اس کی ساری باتیں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔

مجید امجد کو کلاسیکی موسیقی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ کلاسیکی موسیقی کے میدان میں، میں بھی اپنے شوق کی وجہ سے دو چار قدم چل پھر لیا کرتا تھا۔ یہ آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے کی باتیں ہیں۔ میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر کلاسیکی موسیقاروں کے ساتھ تھا۔ ان کا گانا شوق سے سنتا۔ موسیقی پر ان کی باتیں بڑے شوق سے سنتا۔ مگر لے، تال اور سُر پر ان کے آگے بات کرنے کی میں نے کبھی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن جب مجھے یقین ہوتا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا آدمی بھی میری طرح اناڑی ہے تو میں اس کے آگے کسی بڑے خان صاحب گویے کی طرح باتیں کرتا تھا اور غلط سلط سُر لگا کر کسی راگ کی استھائی بھی سنا دیتا تھا۔ اس تمہید کی ضرورت اس لئے پڑ گئی ہے کہ مجید امجد کو راگ درباری بہت پسند تھا۔ مجید امجد کلاسیکی موسیقی سننے کا شوقین ضرور تھا مگر اسے راگ کی اتنی سمجھ نہیں تھی۔ راگ درباری کی سمجھ اس زمانے میں مجھے بھی نہیں تھی مگر میں نے چند ایک راگوں کی طرزیں یاد کر رکھی تھیں۔ اس اعتبار سے میں مجید امجد کے سامنے کسی بڑے کلاونت سے کم نہیں تھا۔ ویسے بھی ریڈیو سٹیشن سے تعلق ہونے کی وجہ سے مجھے بڑے بڑے گویوں کو سننے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ کئی راگوں کی طرزیں میں نے ذہن میں پکا لی تھیں۔ چنانچہ ایک روز انڈس ہوٹل کے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے جب مجید امجد نے مجھ سے راگ درباری سنانے کی فرمائش کی تو پہلے تو میں ایک سیکنڈ کے لئے گھبرا گیا۔ پھر یہ سوچ کر حوصلہ ہوا کہ اگر مجھے راگ درباری کی سمجھ نہیں ہے تو مجید امجد کو اس

راگ کی کون سی سمجھ ہے۔ میں نے پیشہ ور کلاسیکی گویے کی طرح ذرا سا گلا صاف کیا اور جس طرح سے میں نے ریڈیو سٹیشن پر ایک مشہور کلاسیکی گویے کو کسی پکے راگ کی ریکارڈنگ کرواتے دیکھ رکھا تھا اسی طرح سے آنکھیں بند کر کے ایک ہاتھ کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور راگ درباری گانا شروع کر دیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جو میں گا رہا تھا وہ کون سا راگ تھا۔ راگ تھا بھی یا نہیں۔ بہرحال میں اسے راگ درباری ہی سمجھ کر گا رہا تھا اور چونکہ شریف آدمی مجید امجد کو راگوں کی سمجھ نہیں تھی اس لئے وہ اسے راگ درباری ہی سمجھ کر سن رہا تھا اور سر ہلا رہا تھا۔ اس وقت اگر کمرے میں کوئی راگ ودّیا سمجھنے والا شخص موجود ہوتا اور مجھے راگ درباری گاتے سن لیتا تو مجھے اٹھا کر انڈس ہوٹل کی کھڑکی سے نیچے پھینک دیتا۔ اگر ایسا نہ کر سکتا تو خود کھڑکی سے مال روڈ پر چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتا۔

مجید امجد بڑا اچھا انسان تھا۔ وہ جتنا اچھا شاعر تھا اس سے کئی گنا اچھا انسان تھا۔ ایک بار میں منٹگمری گیا تو مجید امجد سے بھی ملا۔ وہ مجھے منٹگمری کے پاک ٹی ہاؤس جوگی ہوٹل میں لے آیا۔ وہاں منٹگمری کے دوسرے شاعروں، ادیبوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ جوگی ہوٹل کی چائے واقعی بہت اچھی تھی۔ مجھے منٹگمری کا گرجا گھر اور شہر میں سے گزرنے والی نہر بڑی اچھی لگی۔ اس بات کو چالیس پینتالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر مجھے منٹگمری کا گرجا گھر، اس کے صحن میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑے ٹاہلی کے درخت اور شہر میں سے گزرنے والی خوبصورت، پُرسکون، خاموش خاموش نہر آج بھی اسی طرح یاد ہے۔ میرا بھانجا ڈاکٹر عارف محمود منٹگمری میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہے۔ وہ جب لاہور آتا ہے تو میں اس سے منٹگمری والے گرجا گھر اور نہر کے بارے میں ضرور پوچھتا ہوں کہ ان کا کیا حال ہے۔ اس کے بعد میں مجید امجد کے اس شہر زندہ دلاں میں کبھی نہیں گیا۔ جب کوئی میرے سامنے ساہیوال شہر کا نام لیتا ہے تو مجھے منٹگمری یاد آ جاتا ہے۔ منٹگمری یاد آتا ہے تو اس شہر کا گرجا گھر، نہر، نہر پر جھکے ہوئے درخت، جوگی ہوٹل اور مجید امجد یاد آ جاتا ہے۔

انڈس ہوٹل کے آگے فیروز سنز والی بلڈنگ آتی ہے۔ اس بلڈنگ میں فیروز سنز سے پہلے ایک کشادہ دکان ہے اور جہاں اب کتابیں فروخت ہوتی ہیں وہاں اس زمانے میں شراب کی دکان ہوا کرتی تھی۔ بہت اونچی چھت والی اس دکان میں بڑی خاموشی اور ٹھنڈک ہوتی تھی۔ فیروز سنز سے آگے جہاں اب الفلاح کی بہت بڑی عمارت کھڑی ہے وہاں ایک تکونا باغیچہ ہوتا تھا۔ باغیچے کے وسط میں انگلش کاؤنٹیز کے مکانوں کی وضع کا ایک پرانا کاٹیج ہوتا تھا جس میں پنجاب گورنمنٹ کے کسی محکمے کا کوئی دفتر تھا۔ اس محکمے کا ایک رسالہ بھی نکلتا تھا۔ کچھ عرصہ اس رسالے کا ناصر کاظمی بھی ایڈیٹر رہا۔ اس کاٹیج کے باغیچے میں رات کو ہلکا ہلکا اندھیرا ہوتا تھا۔ یہاں رات کے وقت میں، یوسف کامران، حبیب جالب اور ایک اور مشہور شاعر بیٹھا کرتے تھے اور شعروسخن کی باتیں کیا کرتے تھے۔

اس سے آگے پنجاب اسمبلی کی عمارت تھی جس کے کشادہ لان کی بارہ دری میں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ لگا تھا جو بعد میں اٹھوا کر لاہور میوزیم پہنچا دیا گیا۔ اس کے آگے انگریزی وضع کا میٹرو ہوٹل تھا جس کے فلور پر سرِ شام ڈانسر انجیلا کا انگریزی ڈانس شروع ہو جاتا تھا۔ ڈانس پر گول دائرے کی روشنی میں انجیلا ڈانس کرتی تھی۔ ہوٹل کے ایک کونے والے چھوٹے سے کمرے میں سلیم شاہد رہائش پذیر تھا جہاں میں، نواز، انور جلال اور شجاع سیف بیٹھا کرتے تھے۔ سلیم شاہد ان دنوں ریڈیو پاکستان لاہور میں اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر تھا۔ کبھی کبھی مصورعلی امام اور پرویز بھی آ جاتے تھے اور محفل دیر تک گرم رہتی تھی۔ میٹرو ہوٹل کی جگہ اب واپڈا کی خوبصورت بلڈنگ بن گئی ہے اور میٹرو ہوٹل کا منظر غائب ہو گیا ہے۔

اس سے ذرا آگے ایک لمبی عمارت تھی جس کی پہلی منزل کے شوروموں پر بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں یہ کس چیز کے شوروم تھے۔ یہاں کبھی کوئی آدمی شوروم کے اندر جاتا یا باہر آتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ چھتے ہوئے خالی فٹ پاتھ پر ٹھنڈی خاموشی چھائی رہتی تھی۔ فٹ پاتھ کے شروع میں لکڑی کی چوڑی سیڑھیاں دوسری منزل

کو جاتی تھیں۔ دوسری منزل میں روزنامہ ''مغربی پاکستان'' کا دفتر تھا۔ اس کے ایڈیٹر کا نام میں بھول گا ہوں۔ شکل ان کی پوری یاد ہے۔ پہلے ''مغربی پاکستان'' کا دفتر چوک دال گراں میں تھا جس کے ایڈیٹر مولانا مرتضیٰ احمد مکیش صاحب تھے۔ سعادت خیالی اس کا سٹاف رپورٹر تھا۔ میں اس سے ملنے دال گراں اکثر جایا کرتا تھا۔ اس پراسرار عمارت کی دوسری منزل میں بھی پہلی منزل کی طرح خاموشی چھائی رہتی تھی۔ دوسری منزل کے برآمدے میں سے سامنے چڑیا گھر کا گیٹ نظر آتا تھا۔

اس عمارت کا خاموش منظر بھی میٹرو ہوٹل کے ساتھ ہی واپڈا کی عظیم الشان عمارت میں غائب ہو گیا ہے۔ اس سے آگے نیڈو ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ خالص برطانوی ارسٹو کریسی کا نمونہ تھا۔ بہت بڑا سرسبز لان تھا۔ لان کی ایک جانب داخل ہونے کا گیٹ تھا۔ دوسری جانب باہر نکلنے کا راستہ تھا۔ دونوں جانب لمبے لمبے برآمدوں والے کمرے دور تک چلے گئے تھے۔ درمیان میں ہوٹل کے دفاتر تھے۔ چھتے ہوئے پورچ میں اس زمانے کے ماڈل کی دو ایک گاڑیاں چپ چاپ کھڑی نظر آیا کرتی تھیں۔ میرا خیال ہے یہ ہوٹل بھی واپڈا کی بلڈنگ میں گم ہو گیا ہے۔ اسی جگہ کہیں انگلش وائن کی پرانی دکان ہوتی تھی۔ اس کے آگے لدھیانے کے شہزادگان کا قالینوں کا شوروم بخارا پیلس تھا۔ اس دکان کے نوجوان مالکان واقعی شہزادے لگتے تھے۔ گورے چٹے، صحت منداور خوبصورت تھے۔ دکان کے اندر دیواروں پر بھی قالین ٹنگے ہوئے تھے۔

اس سے آگے لاہور آرٹ کونسل کی پرانی عمارت آجاتی تھی۔ یہاں ایک چھوٹا سا لمبا کمرہ تھا جس کے سٹیج پر ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ یہ بڑے ادبی اور معیاری ڈرامے ہوتے تھے۔ اوریجنل پلے بھی سٹیج ہوتے تھے اور انگریزی ڈراموں کے اُردو ورژن بھی سٹیج کیے جاتے تھے۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے یہ کھیل دیکھنے آتے تھے۔ آج کل آرٹ کونسل کے سٹیج پر جس قسم کے ڈرامے ہو رہے ہیں انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم ڈرامہ نہیں دیکھ رہے، کچھ اور ہی دیکھ رہے ہیں۔

ان دنوں آرٹس کونسل آرٹ، پینٹنگز اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ شام کے وقت

آرٹس کونسل کی پرانی کوٹھی نما عمارت کے برآمدے اور کشادہ لان میں شاعر، مصور، ادیب اور نقاد حضرات اکثر بیٹھے چائے پیتے اور ادب اور آرٹ پر گرم جوشی سے باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ آرٹس کونسل کا لان بڑا کشادہ اور گول دائرے کی شکل میں تھا جس میں چیڑھ کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ چیڑھ کے درخت کوہ مری اور ایبٹ آباد کے پہاڑوں پر ہوتے ہیں۔ آرٹس کونسل کے چیڑھ کے درختوں سے کوہ مری اور نتھیا گلی کی کہساروں کی ٹھنڈی ہوائیں ملنے آیا کرتی تھیں۔ شام کے علاوہ دن کے وقت بھی لان کے سبزہ زار میں ادب اور آرٹ کے طالب علم چائے پیتے ہوئے پینٹنگ، مجسمہ سازی اور ڈرامے پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔ بڑا علمی اور ادبی ماحول ہوتا تھا اس آرٹس کونسل کا۔ چوڑے سے لمبے کمرے کے سٹیج پر شیکسپیئر، مولیئر، ابسن اور کبھی کبھی کلاسیکی یونانی ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ پنجابی اور اُردو کے طبع زاد ڈرامے بھی سٹیج کئے جاتے تھے۔ ہال میں گہری خاموشی ہوتی تھی۔ لوگ ایک ایک مکالمے کو کلاسیکی ادب کا انمول خزینہ سمجھ کر ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ وہ مکالمے ادب کے جوہر پارے ہوتے تھے۔

افسوس کہ زوال پذیر سٹیج نے ہماری نئی نسل کو ان جواہر پاروں سے محروم کر دیا ہے۔ آج کل سٹیج پر جو کچھ ڈراموں کے نام پر کھیلا جا رہا ہے انہیں دیکھ کر اور سن کر محسوس ہوتا ہے کہ کسی بیاہ شادی والے گھر میں بیٹھے ہیں اور بھانڈ جگت بازی کر رہے ہیں۔ جگت بازی بھی ایک فن ہے۔ لیکن آج کل سٹیج پر جس قسم کی جگت بازی ہوتی ہے اسے دیکھ کر اور سن کر آدمی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ''ایسی بلندی، ایسی پستی'' مجھے عزیز احمد کے ناول کا عنوان یاد آ گیا ہے۔

◎......◎

لاہور کی تاریخی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار اور اس شہر بے مثال کے قدیم باشندے ڈاکٹر مسعود قریشی خط میں لکھتے ہیں۔

"وائی ایم سی اے ہال، بریڈلے ہال، برکت علی محمڈن ہال اور ایس پی ایس کے ہال۔ یہ ہال لاہور کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی روایات کے امین ہیں۔ ان کے در و دیوار آج بھی گزرے زمانے کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان میں اول الذکر وائی ایم سی اے ہال کا آپ تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔ اس خط کے ساتھ میں آپ کو ایس پی ایس کے ہال اور 1937ء کے لاہور ریلوے سٹیشن کی تصاویر بھیج رہا ہوں۔ لاہور ریلوے سٹیشن کی قلعہ نما عمارت کا سنگ بنیاد سر جان لارنس لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے 1849ء میں رکھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے آٹھ پلیٹ فارم ہیں۔ 1860ء میں اس سٹیشن سے پہلی گاڑی چلائی گئی۔ یہ گاڑی لاہور سے امرتسر گئی۔ لاہور ریلوے سٹیشن کی تعمیر لاہور کے مشہور ٹھیکیدار میاں محمد سلطان کے ہاتھوں ہوئی۔ لاہور ریلوے سٹیشن کی یہ تصویر ڈاکٹر محمد مسعود قریشی (1897-1970ء) کی مرتب کردہ ڈائریکٹری آف ہومیوپیتھس آف انڈیا، برما، سیلون کے 1937ء کے ایڈیشن سے لی گئی ہے۔ ان دنوں ریلوے سٹیشن کی موجودہ کشادہ ڈیوڑھی ریلوے سٹیشن کی عمارت کا حصہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہ ڈیوڑھی پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد تعمیر کی گئی۔ تصویر میں سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے۔ پرانا تانگہ سٹینڈ نظر آ رہا ہے جہاں پر چند تانگے سواریوں کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

ریلوے سٹیشن کے اندر ٹرینوں کی بروقت آمد و رفت اور مسافروں کی وجہ سے

گھما گہمی ضرور ہو گی لیکن اس کا بیرونی منظر انتہائی پُرسکون ماحول کی نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور کی سڑکوں پر بائیسکل، تانگے، ریڑھے اور گڈیں چلا کرتی تھیں۔ تب چڑیا گھر کے پنجرے میں مقید شیر دھاڑتا تو اس کی آواز لاہور کے کونے کونے میں سنی جاتی تھی۔ ریل گاڑی کے چلنے کی آوازیں، اس کے انجن کی وسل کی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ لیکن اب یہ آوازیں ٹریفک کے شور میں دب کر رہ گئی ہیں۔ ان دنوں لاہور میں انگلستان کی بنی ہوئی ریلے کی بائیسکل، ڈائنمو اور تالے کے ساتھ 60 روپے میں ملتی تھی۔ جبکہ جاپانی بائیسکل صرف 19 روپے میں مل جایا کرتی تھی۔ بے آسٹن موٹر کار 2355 روپے میں مل جاتی تھی۔ پٹرول ایک روپیہ پچیس پیسے فی گیلن ملتا تھا۔

اندرون لاہور موسلے کا تندور مشہور تھا جہاں تندوری روٹی کے ساتھ چنے کی دال مفت ملتی تھی۔ لوگ اس تندور کی پکی ہوئی انتہائی لذیذ دال کے رسیا اور دیوانے تھے۔ ہندوؤں کی ملکیت نندا بس سروس کی بسیں لاہور اور امرتسر سے ہر روز براستہ راولپنڈی سری نگر جایا کرتی تھیں۔ سیالکوٹ سے جموں کے لئے براستہ ڈسکہ بھی ان کی سروس موجود تھی۔

لاہور کے معروف فلیٹیز ہوٹل کا مقامی انگریزی اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں چھپے ہوئے ایک اشتہار کی فوٹو کاپی آپ کو بھیج رہا ہوں جس میں ہوٹل کی انتظامیہ بڑے فخر سے اعلان کر رہی ہے کہ ہمارے ہوٹل کے ہر کمرے میں بجلی کی روشنی اور بجلی کا پنکھا موجود ہے۔ یہ بات آج کے دور میں بڑی عجیب لگتی ہے مگر ان دنوں بجلی کی عیاشی کم لوگوں کو ہی نصیب تھی۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح جب بھی لاہور تشریف لاتے وہ اسی فلیٹیز ہوٹل میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آج جبکہ سینکڑوں کنال اراضی پر پھیلے ہوئے اس ہوٹل کو نیلام کر دیا گیا ہے تو میری نجکاری کمیشن سے استدعا ہے کہ وہ نیلامی میں یہ ہوٹل خریدنے والے کو اس بات کا پابند کرے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کے اس کمرے کو اصل حالت میں جوں کا توں رکھا جائے جس میں بانی پاکستان قیام فرمایا

کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ اس ہوٹل کے لان میں صدیوں پرانے درختوں کو بھی نہ کاٹا جائے۔
یہاں پر میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب اے آر کارنیلیس کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔ کارنیلیس صاحب اپنی تمام تر ملازمت کے دوران اور ریٹائر ہونے کے بعد اپنی وفات تک اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں مقیم رہے۔ وہ کسی ذاتی جائیداد کے مالک نہیں تھے۔ وہ وطن عزیز کے اعلیٰ ترین سرکاری منصب پر فائز رہے لیکن انہوں نے اپنی رہائش کے لئے کوئی پلاٹ تک حاصل نہیں کیا۔ موصوف اسلامی فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دنیا میں بڑھتے ہوئے جرائم اور لا قانونیت کے سد باب کے لئے اسلامی تعزیرات کے نفاذ کے زبردست داعی تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اندرونِ ملک ہی نہیں، بیرونی ممالک میں بین الاقوامی سطح پر بھی کیا تھا۔

والسلام........خالد مسعود قریشی"

میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن اور ایس پی ایس کے ہال کی تصویریں بھیج کر بیتے دنوں کی یادیں تازہ کر دیں۔ میں سب سے پہلے لاہور کے پرانے ریلوے سٹیشن کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس ریلوے اسٹیشن کے ساتھ میرے بچپن اور عہد جوانی کی بڑی قیمتی یادیں وابستہ ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہ موقع فراہم کر دیا ہے تو جی چاہتا ہے ان یادوں کے پرانے باغوں کی تھوڑی دیر کے لئے سیر کر لوں۔

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غالب

ویسے تو میرا وطن امرتسر تھا لیکن لاہور بھی ایک طرح سے میرا وطن ہی تھا۔ اس وجہ سے کہ ہمارے خاندان کے کچھ کشمیری گھرانے لاہور میں آباد تھے اور ان کے ہاں ہمارا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ لاہور امرتسر سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے امرتسر سے لاہور تک ریل کا واپسی ٹکٹ تین یا شاید پانچ آنے میں ملتا تھا۔ لاہور

سے وابستہ میری یادوں کا دھندلا سا نقش اول کچھ اس طرح کا ہے کہ ہم امرتسر سے لاہور آئے ہیں۔ مجھے کسی نے اپنی گود میں اٹھا رکھا ہے۔ ہم تانگے میں بیٹھے ہیں۔ تانگہ ایک کشادہ چوک میں رکتا ہے۔ سامنے ایک کھلا میدان ہے اور ایک بانس پر سبز جھنڈا لہرا رہا ہے اور ایک ڈھول والا جھنڈے کے پاس کھڑا ڈھول بجا رہا ہے۔ میرے کانوں میں کسی کی آواز پڑتی ہے کہ یہ غازی علم الدینؒ شہید کا مزار ہے۔

اس کے بعد میری عمر یہی کوئی چار سال ہو گی، بڑی ہمشیرہ صاحبہ شادی کے بعد لاہور میں ہی آباد ہو گئی تھیں۔ ان کے شوہر لالہ عبدالرحمٰن کو مکان بدلتے رہنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ ان دنوں وہ فاروق گنج میں رہا کرتے تھے۔ ریلوے لائن ہم سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اور میری بھانجی ہم دونوں ریل گاڑیاں دیکھنے ریلوے لائن پر آ جاتے تھے اور جب کوئی ریل گاڑی گزر جاتی تھی تو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ خوب دوڑیں لگایا کرتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پاس ہی تھا۔ پلیٹ فارموں کی سیر بھی کیا کرتے تھے۔ انجنوں کو شنٹ کرتے بڑے شوق سے دیکھا کرتے مگر ان سے دور رہا کرتے تھے۔ ذرا بڑا ہوا تو گھر سے بھاگ کر لاہور بڑی آپا کے پاس آ جاتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہلا سوال یہ کرتیں۔

''وے! آپو جی کو بتا کر آئے ہو؟''

میں یونہی کہہ دیتا کہ ہاں بتا کر آیا ہوں۔ ان دنوں ہمشیرہ صاحبہ کا مکان مستی دروازے میں تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے ریوالی سینما میں انگریزی فلمیں بھی لگا کرتی تھیں۔ ریوالی سینما کی پیشانی پر اس کا پرانا نام بھی بجھا بجھا سا لکھا ہوتا تھا اور یہ نام تھا منور تھیٹر۔ میں امرتسر سے بھاگ کر ریوالی سینما میں انگریزی فلم کا دن کا شو دیکھنے آ جاتا تھا۔ ریل گاڑی میں بغیر ٹکٹ کے سفر کرتا تھا۔ ایک بار مغل پورہ ریلوے سٹیشن پر ٹی ٹی نے مجھے پکڑ لیا اور وہیں اتار دیا۔ مجھے یاد ہے جب میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دوڑ لگاتا ریوالی سینما پہنچا تو انگریزی فلم شروع ہو چکی تھی۔ بورس کارلوف کی انگریزی فلم ''فریکلسا ٹمین'' میں نے ریوالی سینما میں چھ سات مرتبہ دیکھی تھی۔ بغیر ٹکٹ

لاہور آتا تو میں ٹرین سے اتر کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ریوالی سینما کی طرف چل پڑتا۔ یہ ضرور دیکھ لیتا تھا کہ پلیٹ فارم کے آخر میں کوئی ٹی ٹی تو نہیں کھڑا۔ ریوالی سینما کے سامنے ریلوے لائن کی اونچی دیوار کے ساتھ بجلی کا ایک کھمبا ہوا کرتا تھا۔ میں اس کھمبے سے چمٹ کر گھسٹتا ہوا نیچے سڑک پر آجاتا اور دوڑ کر سامنے ریوالی سینما میں آتے ہی جو بندہ نظر آتا اس سے پوچھتا کہ فلم شروع تو نہیں ہوئی۔ ریوالی سینما کی تھرڈ کلاس میں صرف بنچ بچھے ہوتے تھے جس پر بیٹھے بیٹھے پیچھے گرنے کا ڈر رہتا تھا۔

پھر نویں جماعت میں پہنچا تو میری آوارہ گردیوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہوگیا اور میں نے کلکتہ اور بمبئی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ جب بھی ان شہروں کی طرف بھاگتا تو سب سے پہلے لاہور بڑی ہمشیرہ کے پاس آتا۔ گھر سے بھاگنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سکول میں حساب کے پیریڈ میں مجھے مار پڑتی تھی۔ والد صاحب کو پتہ چلتا کہ میں حساب میں فیل ہوگیا ہوں تو وہ الگ میری ٹھکائی کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے پھوپھا کے بھائی اور بیٹے پشمینے کی شالوں کی بدیں یعنی شالوں کا مال لے کر کلکتے جاتے تھے۔ وہ چھ مہینے وہاں شالوں کا کاروبار کرتے اور جب واپس آتے تو بنگال کی چارخانوں والی لنگیاں، کالے سلیپر اور طرح طرح کی سوغاتیں لاتے تھے۔ میں ان سوغاتوں سے زیادہ ان کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ وہ کلکتے کی بارشوں کا ذکر کیا کرتے تھے کہ وہاں بڑی بارشیں ہوتی ہیں اور ناریل کے بڑے درخت ہیں۔ مجھے ان بارشوں اور ناریل کے درختوں کو دیکھنے کا شوق بھی گھر سے بھگا کر کلکتے لے آتا تھا۔

معافی چاہتا ہوں، میں اصل موضوع سے بھٹک گیا ہوں۔ اصل میں بارشوں اور ناریل کے درختوں کا ذکر شروع ہو جائے تو میں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو جاتا ہوں۔ بات لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن کی ہو رہی تھی۔ پرانے لاہور کے گلی کوچوں کی طرح لاہور کے پرانے ریلوے سٹیشن کی عمارت اور اس کی فضاؤں میں ایک طلسم تھا۔ ایک رومان تھا۔ ایک شاعری تھی۔ خالد مسعود نے بالکل صحیح لکھا ہے۔

جن دنوں بڑی ہمشیرہ کا مکان فاروق گنج میں تھا، رات کو ہی نہیں بلکہ دن کے

وقت بھی ریلوے انجن کے وسل کی آواز آیا کرتی تھی۔ یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ مجھے ریل گاڑیوں کے چلنے، انجن کی وسل اور شنٹ کرنے کی آوازیں بڑی اچھی لگا کرتی تھیں۔ میں ان آوازوں کو بڑا کان لگا کر شوق سے سنا کرتا تھا۔ ریلوے سٹیشن کے قریب ہونے کی وجہ سے جب ٹرین راولپنڈی کی طرف جانے کے لئے پلیٹ فارم سے جانے لگتی تو گارڈ کی سیٹی کی آواز بھی رات کو سنائی دیتی اور پھر انجن تین بار سیٹی (وسل) بجاتا۔ میں آنکھیں بند کر کے اس کا تصور باندھ لیتا۔ انجن کے زور سے بھاپ خارج کرنے کی اور ایک بار شاید پوری رفتار سے پہیوں کے گھومنے کی آواز آتی اور انجن شاں شاں کرتا ٹرین کو لے کر پنڈی کی طرف چل پڑتا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز قریب آتی جاتی اور اس کی سپیڈ بھی تیز ہوتی جاتی۔ پھر جب وہ گرجتا، غراتا، دھڑ دھڑاتا فاروق گنج کی آبادی کے قریب سے گزرتا تو زمین ہلنے لگتی۔ آج آپ ریلوے اسٹیشن کے قریب سے بھی گزریں تو وہاں بسوں، ویگنوں، رکشوں، ٹرکوں اور ٹرالروں کا اتنا شور ہوتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب انجن نے سیٹی بجائی اور کب کوئی ریل گاڑی پلیٹ فارم سے روانہ ہوئی۔ یہ آوازیں لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن کی شاعری تھیں۔ لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن کے دل کے دھڑکنوں کی آوازیں تھیں۔ آج لاہور کا ریلوے اسٹیشن پہلے سے بہت کشادہ ہو گیا ہے۔ پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے، اس کی تزئین و آرائش ہو گئی ہے۔ مگر اس کے دھڑکنے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس کی شاعری ختم ہو گئی ہے اور بھاپ کے سفید و براق کرسٹل بادل اڑاتے، شاہانہ جلال و جمال کے ساتھ نظروں کے سامنے سے گزر جانے والے انجن کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔

⊚......⊚

ذکر لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن کے اس منظر کا ہو رہا تھا جو 1937ء کا منظر تھا۔ آج لاہور کا ریلوے اسٹیشن بڑا پُرشکوہ اور جدید فن تعمیر اور جدید فن آرائش کا مثالی نمونہ ہے۔ اس میں ہر وہ سہولت اور خوبصورتی موجود ہے جو کسی جدید ریلوے اسٹیشن میں موجود ہونی چاہیے۔ لیکن وہ 1937ء والے ریلوے اسٹیشن کا منظر نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ یہ منظر 1947ء تک کم و بیش ویسے کا ویسا ہی تھا اور میں اس ریلوے اسٹیشن سے وابستہ اپنی یادوں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سواریاں کرائے کے تانگوں میں یا اپنے رئیسی تانگوں میں آتی تھیں۔ موٹر کار شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھی۔ تانگہ سٹیشن کی ڈیوڑھی میں آ کر رکتا تھا اور اسے وہاں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ سواریاں اتار کر تانگہ دوسری طرف سے تانگہ اسٹینڈ کی طرف نکل جاتا تھا۔ اسٹیشن کی لابی میں جو ٹکٹ گھر تھے وہاں صرف انٹر کلاس، سیکنڈ کلاس اور فسٹ کلاس کے ٹکٹ ہی ملتے تھے۔ تھرڈ کلاس کے ٹکٹ تھرڈ کلاس کے مسافر خانے کی طرف جو ٹکٹ گھر تھا وہاں ملتے تھے۔ پلیٹ فارم پر جو بک سٹال تھے وہاں زیادہ تر انگریزی کی کتابیں اور رسالے ہوتے تھے۔ انگریزی اور یورپی کلاسیکی کتابوں کے پنگوئن سیریز میں سستے ایڈیشن بھی عام مل جاتے تھے۔ لندن میں چھپنے والے رسالے ''پنچ''، ''مینز اونلی''، ''جون بل'' اور امریکی ماہنامہ ''ریڈرز ڈائجسٹ'' کے علاوہ اور بھی انگریزی رسالے بک سٹال پر سجے ہوتے تھے۔ قیمتی سگار، پائپ، پائپ کے انگلش تمباکو بھی بک سٹالوں پر دستیاب تھے۔ سٹیشن کی لابی کے گیٹ پر ٹکٹ چیکر سردیوں میں کالی وردی اور گرمیوں میں سفید وردی پہنے چاق و چوبند کھڑا

ہوتا تھا۔ گیٹ میں داخل ہو کر پلیٹ فارم پر آئیں اور فسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے ریفریشمنٹ رومز کے قریب سے گزریں تو جالی دروازوں کے اندر سے پولسن مکھن اور اورنج پیکو چائے کی ملی جلی خوشبوئیں آتی تھیں۔ پلیٹ فارم پر کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ ٹرین کے آنے کا اعلان پلیٹ فارم کی دیوار سے لٹکتی تانبے یا پیتل کی زرد رنگ کی گول گھنٹی پر ہتھوڑی کی ضرب لگا کر ٹن......ٹن......ٹن......کی آواز سے کیا جاتا تھا۔ ایسی گھنٹی سکولوں میں بھی کلاس کے لگنے سے پہلے بجائی جاتی تھی۔

کلکتہ سے پشاور جانے والی ہوڑہ ایکسپریس اور پشاور سے بمبئی جانے والی فرنٹیئر میل ارسٹوکریٹ قسم کی ریل گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں میں انٹر کلاس کے صرف دو تین ڈبے ہی آخر میں لگے ہوتے تھے باقی ساری بوگیاں سیکنڈ کلاس اور فسٹ کلاس کی ہوتی تھیں۔ ان ریل گاڑیوں میں ایک دو بوگیاں ایئر کنڈیشنڈ ہوتی تھیں۔ انگریز لوگ زیادہ تر ان ہی گاڑیوں میں سفر کرتے تھے۔

ہوڑہ ایکسپریس کلکتے سے دن کے وقت اور فرنٹیئر میل پشاور سے رات کے آٹھ یا نو بجے لاہور پہنچتی تھی۔ ایک ٹرین بمبے ایکسپریس ہوتی تھی۔ یہ ٹرین بھی پشاور سے بمبئی جاتی تھی۔ دوسری ایک ٹرین کلکتہ ایکسپریس ہوتی تھی۔ یہ بھی پشاور سے کلکتے تک جاتی تھی۔ ان میں تھرڈ کلاس کے بھی ڈبے ہوتے تھے۔ میں جب بھی گھر سے بھاگ کر بمبئی، کلکتہ کا رخ کرتا تھا تو ان گاڑیوں میں ہی سفر کیا کرتا تھا۔ امرتسر سے بمبئی تک تھرڈ کلاس کا کرایہ تیرہ یا شاید پندرہ روپے ہوتا تھا۔ عجب بات ہے کہ میں ان ٹرینوں میں شاید ہی ایک آدھ بار امرتسر سے سوار ہوا ہوں گا ورنہ جب بھی گھر سے بھاگتا پہلے امرتسر سے سیدھا لاہور پہنچتا اور پھر لاہور سے کلکتہ ایکسپریس یا فرنٹیئر میل یا بمبے ایکسپریس میں سوار ہو جاتا۔ لاہور میں بڑی ہمشیرہ صاحبہ کے ہاں جاتا۔ انہیں یہی بتاتا کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔ دن بھر لاہور کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا اور رات کو بمبئی یا کلکتہ جانے والی گاڑی پکڑتا۔ ان ٹرینوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی میں کم ہی حماقت کرتا تھا۔ اگر پورا کرایہ نہ ہوتا تو کم از کم دلی تک میں ضرور ٹکٹ لے لیتا تھا۔

ایک وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ تک لاہور ریلوے ہیڈکوارٹر کے ٹکٹ چیکروں کا گروپ کسی نہ کسی اسٹیشن پر سے اچانک ٹرین میں سوار ہو جاتا اور ہیڈ کوارٹر گروپ کے ٹی ٹی بڑے سنگدل مشہور تھے۔ کسی بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے کو معاف نہیں کرتے تھے۔ جرمانے کے ساتھ ڈبل کرایہ چارج کر لیتے تھے ورنہ گرفتار کر لیتے تھے۔ میں لڑکا سا ہوا کرتا تھا۔ جب میں کہتا کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو عام طور پر مجھے ٹرین سے اتار دیتے تھے۔ میں واپس لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن پر آتا تھا، فرنٹیئر میل اور ہوڑہ ایکسپریس عام طور پر ریلوے اسٹیشن کے نمبر چار یا نمبر تین پلیٹ فارم پر کھڑی ہوتی تھی۔ ان کی بڑی شان ہوتی تھی۔ بڑا رعب ہوتا تھا۔ کلکتہ جانے والے ہوڑہ ایکسپریس کے سارے ڈبے سبز رنگ کے ہوتے تھے۔ فرنٹیئر میل کے ایئر کنڈیشنڈ ڈبوں کا رنگ سرخ ہوتا تھا اور ان کی کھڑکیوں پر نسواری رنگ کے شیشے چڑھے رہتے تھے جن میں سے اندر بیٹھی ہوئی سواریاں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ یہ دونوں ٹرینیں بڑی تیز رفتار تھیں اور ان کے سٹاپ بڑے لمبے ہوتے تھے۔ لاہور سے چل کر دونوں ٹرینوں کا اگلا سٹاپ امرتسر ہوتا تھا۔ چھوٹے سٹیشنوں کے مسافر ان ٹرینوں کو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے بلکہ پلیٹ فارم پر ریلوے لائن سے پرے پرے ہو جاتے تھے کیونکہ یہ دونوں رن تھرو ٹرینیں شور مچاتیں، بھاپ اور دھوئیں کے بادل اڑاتیں، زمین ہلاتیں ایک طوفان کی طرح گزر جاتی ہیں۔

مسعود صاحب نے لاہور ریلوے اسٹیشن کی 1937ء کی جو تصویر بھیجی ہے اس کے باہر ایک جانب تانگہ اسٹینڈ نظر آ رہا ہے۔ تانگوں کے آگے جُتے ہوئے دُبلے پتلے گھوڑے کسی گہری سوچ میں گم سر جھکائے خاموش کھڑے ہیں۔ لگتا ہے انہیں صرف لاہور کی سڑکوں پر تانگوں کے آگے لگ کر چلنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ بڑے پیٹ اور پتلی ٹانگوں والے گھوڑے لاہور کی سڑکوں پر صرف چلتے تھے، دوڑتے نہیں تھے۔ کہیں دوڑنا پڑ جاتا تھا تو گر پڑتے تھے۔ جب یہ گرتے تھے تو اگلی سواریاں ان کے اوپر گر پڑتی تھیں اور پچھلی سواریاں اگلی سیٹوں پر آ جاتی تھیں۔ بڑے خاموش طبع، آرٹسٹ

ٹائپ کے گھوڑے ہوتے تھے۔ کبھی سر اٹھا کر نہیں چلتے تھے۔ ہر وقت فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے۔ دلی دروازہ سے بھاٹی اور بھاٹی دروازے سے دلی دروازے کے دن میں نہ جانے کتنے چکر لگاتے تھے۔ حساس اتنے تھے کہ جب تانگے پر چار سواریاں پوری ہو جاتی تھیں تو اپنے آپ چل پڑتے تھے۔

ان تانگوں کے کوچوانوں، خاص طور پر پرانے ریلوے اسٹیشن کے تانگہ سٹینڈ کے کوچوانوں کی آن بان نرالی ہوتی تھی۔ سگریٹ سلگائے عجیب شانِ بے نیازی سے تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوتے تھے۔ کبھی خود چل کر سواری کے پاس نہیں جاتے تھے۔ سواری خود چل کر ان کے پاس آتی تھی۔ سواری کے پہلی بار پوچھنے پر کہ بھائی ٹمپل روڈ چلو گے؟ وہ کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ سواری سے کبھی بھاؤ تاؤ نہیں کرتے تھے۔ جو کہتے وہی لیتے تھے۔ تانگہ اسٹینڈ کی ایک ٹوکن فیس ہوتی تھی۔ یہ ٹوکن فیس وہ کبھی سواری سے مانگ کر نہیں دیتے تھے، اپنی جیب سے ٹوکن فیس کے پیسے نکال کر ٹھیکیدار کے آدمی کو دیتے تھے۔ بعض پرانے کوچوان بڑے خاموش طبع ہوتے تھے۔ راستے میں سواری سے کوئی بات چیت نہیں کرتے تھے۔ بعض سواری کو بڑے مزے مزے کے قصے کہانیاں سناتے تھے۔ اب نہ وہ تانگہ سٹینڈ رہا نہ وہ کوچوان ہی رہے۔

ریلوے اسٹیشن کی تصویر میں جو تانگہ اسٹینڈ نظر آ رہا ہے اس کی چھت نہیں ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو تانگہ اسٹینڈ پر اینگل آئرن کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس شور میں ایک میوزک سنائی دیتا تھا۔

اب میں آپ کو 1947ء کے لاہور ریلوے اسٹیشن کے کچھ منظر دکھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پاکستان معرضِ وجود میں آ چکا تھا۔ 11 اگست 1947ء کو میں کولمبو سے مدراس، ناگ پور، دلی سے ہوتا ہوا بذریعہ ٹرین انبالہ سے ذرا آگے پہنچا تو پنجاب شروع ہو گیا۔ جہاں چاروں طرف فضا میں ایک دہشت کا سماں تھا۔ کھیت خالی پڑے تھے۔ دور دیہات کی آبادیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ جالندھر کے اسٹیشن پر سکھ ننگی تلواریں، کرپانیں لئے پھر رہے تھے۔ کسی نہ کسی طرح میں امرتسر پہنچ گیا۔ میری

عادت تھی کہ جب بھی کسی شہر کی آوارہ گردی کر کے امرتسر واپس آتا تو سیدھا لاہور ضرور جاتا تھا۔ یہ لاہور کی محبت تھی جو مجھے اپنے پاس بلاتی تھی۔ چنانچہ اسی روز ایک ٹرین میں بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہوا تو امرتسر سے نکلتے ہی پہلے سٹیشن پر سکھوں کو دیکھا کہ وہ تلواریں لہرا لہرا کر پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ ٹرین اسٹیشن پر رکے بغیر آگے نکل گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے ٹرین میں بیٹھ کر کتنی بڑی حماقت کی ہے۔ ان دنوں بڑی ہمشیرہ صاحبہ کا قیام دین پورہ میں تھا۔ ان کے پاس پہنچا تو میری شکل دیکھتے ہی وہ مجھ پر برس پڑیں اور بولیں۔

''تم اکیلے آ گئے ہو۔ آپو جی اور دوسرے گھر والے امرتسر میں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ جاؤ، انہیں لے کر آؤ۔''

میں اسی وقت لاہور اسٹیشن پر واپس آ گیا۔ دن کے دس گیارہ کا ٹائم ہو گا۔ گاڑیاں ابھی چل رہی تھیں۔ میں ایک گاڑی میں بیٹھ کر امرتسر آ گیا۔ وہاں پلیٹ فارم پر مجھے میرا دوست قیوم شیخ مل گیا۔ وہ کہنے لگا شہر میں کرفیو لگنے والا ہے۔ میرا خیال ہے نکل چلیں نہیں تو ساری رات پلیٹ فارم پر گزارنی پڑے گی۔ ہم اسٹیشن کے عقبی راستے سے باہر آئے تو کرفیو کا سائرن بجنے لگا۔ کرفیو لگ گیا تھا۔ یہ دن اور رات کا کرفیو تھا۔ وہ رات مجھے قیوم شیخ کے گھر پر گزارنی پڑی۔

دوسرے روز کرفیو کھلتے ہی میں اپنے گھر آیا اور گھر والوں سے دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ: جس کسی نے لاہور چلنا ہے اسی وقت میرے ساتھ چل پڑے۔ اب امرتسر میں ہم نہیں رہ سکتے۔ سوائے میری چھوٹی بہن، چھوٹے بھائی اور والدہ کے اور کوئی راضی نہ ہوا۔ سب یہی کہتے رہے کہ تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم سب کو واپس آنا پڑے گا۔ بہر حال میں، والدہ، آپو جی، چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کو لے کر برستی گولیوں میں تانگہ کروا کر امرتسر اسٹیشن پہنچا۔ مجھے یاد ہے وہاں سبز رنگ کی ہوڑہ ایکسپریس کلکتہ سے ابھی ابھی آ کر رکی تھی۔ یہ مشرقی پنجاب کے تباہ حال مسلمان مہاجر مرد عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ ڈبوں کے دروازے بند تھے۔

میری والدہ آپو جی بھاری بدن کی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں کھڑکی سے گاڑی میں داخل کیا اور بہن بھائی کو بھی کھڑکی سے ڈبے میں سوار کرایا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی لاہور کی طرف چل پڑی۔

ٹرین ابھی امرتسر اسٹیشن کے یارڈ میں تھی کہ رک گئی۔ کوئی باہر سے آواز لگاتا آگے نکل گیا کہ کھڑکیاں بند کرو، کھڑکیاں بند کرو۔ ہمارے ڈبوں کی کھڑکیاں بند کر دی گئیں۔ گاڑی چل پڑی۔ میں نے کھڑکی کا تختہ ذرا نیچے کر کے باہر دیکھا۔ ریلوے یارڈ کی لائنوں میں مسلمانوں کی کٹی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ اس کے بعد لائن کے ساتھ ساتھ بھی لاشیں پڑی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہاتھی دروازہ، لوہ گڑھ اور لاہوری دروازے کے مسلمانوں کی لاشیں تھیں جو اپنا گھر بار چھوڑ کر کیمپ کی طرف جا رہے تھے۔

چھ ہرٹہ، خالصہ، گورو سر ستلانی، اٹاری اور واہگہ سے گزرنے کے بعد گاڑی جلو، مغل پورہ اور پھر لاہور کے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوگئی۔ یہ 13 اگست کا دن تھا۔

ہماری ٹرین لاہور کے پرانے ریلوے اسٹیشن کے چار نمبر پلیٹ فارم پر آ کر رکی تھی۔ مہاجرین کی راہنمائی کے لئے مسلم لیگ کے رضا کار سبز وردیوں میں ہمارے ڈبے کی طرف بڑھے۔ مہاجرین کو پانی پلایا جا رہا تھا اور روٹیاں تقسیم کی جا رہی تھیں۔ ہم ڈبے میں سے نکل کر اسٹیشن کی لابی والے گیٹ کی طرف بڑھے تو ایک رضا کار نے ہمیں ادھر جانے سے روک دیا اور کہا۔

''پوسٹ آفس والی گلی سے باہر نکلیں۔''

میں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''وہ کس لئے؟''

رضا کار بولا۔

''شہید گنج کی چھت سے سکھ اسٹیشن کی ڈیوڑھی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔''

جس پلیٹ فارم سے آج کل انڈیا کو ریل گاڑی جاتی ہے اس پلیٹ فارم سے ایک

چھوٹی سی گلی ریلوے پوسٹ آفس کے قریب سے ہوتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کے باہر جہاں تانگہ اسٹینڈ ہوا کرتا تھا، وہاں جا کر نکلتی تھی۔ ہم بھی دوسرے مہاجرین کے ساتھ اسی راستے سے گزر کر جب تانگہ اسٹینڈ کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ شہید گنج کی طرف سے اچانک فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم سب سڑک پر لیٹ گئے۔ جب فائرنگ ختم ہوئی تو ہم دوڑ کر سامنے چھوٹے سے پلاٹ میں آگئے جہاں مہاجرین کے لئے عارضی قیام کے لئے کیمپ لگا ہوا تھا۔ یہاں سے مسلم لیگ کے ٹرک مہاجرین کو والٹن کے رفیوجی کیمپ میں لے جاتے تھے۔ جنہیں لاہور میں اپنے رشتے داروں کے ہاں جانا ہوتا تھا انہیں ان کے رشتے داروں کے پاس پہنچا دیتے تھے۔ ایک ٹرک ہمیں بھی دن پورہ بڑی ہمشیرہ کے گھر چھوڑ گیا۔

گھر کے باقی لوگ ابھی امرتسر میں ہی تھے۔ میں دن میں ریلوے اسٹیشن کے کئی چکر لگاتا۔ امرتسر کی طرف سے مہاجرین کو لے کر کوئی ٹرین آتی تو ہر ڈبے میں جھانک کر گھر والوں کی صورتیں تلاش کرتا۔ دس پندرہ دنوں کے بعد وہ لوگ خستہ حالت میں لاہور اسٹیشن پر پہنچے تو خدا کا شکر ادا کیا۔

اس دوران میں نے لاہور ریلوے اسٹیشن پر جو خون آلود منظر دیکھے انہیں میں مرتے دم تک فراموش نہیں کر سکوں گا۔

ایک مہاجر ٹرین ابھی ابھی فیروز پور کی طرف سے آکر پلیٹ فارم پر رکی ہے۔ اس میں سے مسلمانوں کی کٹی ہوئی لاشیں اتار کر خون آلود بوگیوں کو دھویا جا رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر سامان ڈھونے والی ٹرالیوں پر پاکستان کے نام پر شہید ہونے والوں کی لاشوں کو، ان کی لاشوں کے کٹے پھٹے ٹکڑوں کو لادا جا رہا ہے۔ ایک اور ٹرین پلیٹ فارم نمبر 6 پر آکر رکی ہے۔ یہ بھی مسلمانوں کی لاشوں سے بھری ہوئی ہے اور ایک آدمی کو شدید زخمی حالت میں ڈبے سے نکالا جا رہا ہے۔ اس کے دونوں بازو کٹے ہوئے ہیں۔ وہ نزع کی حالت میں بتاتا ہے کہ ''جالندھر، امرتسر کے درمیان سکھوں نے حملہ کر دیا۔ کوئی نہیں بچا۔'' سٹریچر پر ڈالتے ڈالتے وہ آدمی بھی شہید ہو جاتا ہے۔

کاش کچھ دیر کے لئے وقت پیچھے چلا جائے اور میں یہ منظر پاکستان کی نئی نسل کے نوجوانوں کو دکھا سکوں اور انہیں کہہ سکوں کہ جس پاکستان میں وہ امن وسلامتی اور عزت وآبرو کے ساتھ رہ رہے ہیں اس کی خاطر ان کے آباؤ اجداد نے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں اور میں نے ان کی بے گور وکفن خون آلود لاشیں سڑکوں، کھیتوں، گلی کوچوں، ریلوے لائنوں اور ریلوے پلیٹ فارموں پر بکھری پڑی دیکھی ہیں۔

خزاں میں سرد ہوا کے جھونکوں کے ساتھ پیپل کے درختوں پر سے زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور مال روڈ پر دور تک دوڑتے بھاگتے چلے جاتے۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے یہ زرد پتے سڑک پر کھیل رہے ہوں جس طرح بچے کھیلا کرتے ہیں۔ کوئی ویگن، کوئی رکشہ، کوئی لاری انہیں روندتی ہوئی نہیں گزرتی تھی۔ ہوا کا پہلا جھونکا انہیں اپنی ڈالی سے توڑ کر سڑک پر گراتا، دوسرا جھونکا انہیں مال روڈ پر دور تک دوڑاتا لے جاتا اور تیسرا جھونکا انہیں سڑک سے اچھال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیتا۔ ابھی مال روڈ پر ان زرد پتوں میں سے کسی ایک کی بھی کچلی ہوئی لاش نظر نہ آتی تھی۔

شاہ دین بلڈنگ کی دکانوں کے آگے جو برآمدے تھے وہ خالی اور ٹھنڈے ہوتے تھے۔ مئی، جون کی گرمی میں ہم ان ٹھنڈے برآمدوں میں سے ہوتے ہوئے پلازہ سینما تک جاتے تھے۔ ان برآمدوں اور مال روڈ کی فٹ پاتھ کی درمیانی جگہ خالی پڑی رہتی تھی۔ کہیں کوئی کار یا رکشہ یا سکوٹر کھڑا نظر نہیں آتا تھا۔

چیئرنگ کراس کے چوک میں شاہ دین بلڈنگ کے سامنے والے فٹ پاتھ کے اوپر یوکلپٹس کے چار درخت ہوا کرتے تھے جو ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ یہ اصلی یوکلپٹس کے درخت تھے اور ان کی نازک، لچکیلی ڈالیاں ہوا میں لہرایا کرتی تھیں۔ آج ان میں سے صرف ایک ہی درخت باقی رہ گیا ہے، تین درخت اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ بسوں، ویگنوں کے دھوئیں نے انہیں وقت سے پہلے ہلاک کر ڈالا ہے۔ آخری درخت بھی اُداس اور بیمار ہے اور جس بیمار کی کوئی خبر لینے والا نہ ہو، کوئی علاج کرنے والا نہ ہو وہ کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔

مال روڈ کے ریگل چوک میں ہی بھٹی فوٹو گرافر کے پہلو میں شیزان ہوٹل کے شیشوں کے پیچھے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چمکتے ہوئے چہرے نظر آتے تھے۔ شیزان میں بھی کبھی رش نہیں دیکھا تھا۔ آگے سڑک ہمیشہ خالی رہتی اور گرمیوں کی شام کو موتیے کے ہار اور گجرے بیچنے والے آ کر گھوما کرتے۔ چند قدم آگے بائیں جانب ایک چھوٹا سا فرنچ ٹائپ کا کاٹیج نما کافی ہاؤس کھل گیا تھا جس کی نیم روشن فضا بڑی پراسرار لگتی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے کسی ایسے بحری جہاز کی کینٹین میں بیٹھے کافی پی رہے ہیں جو آدھا سمندری ریت میں دھنس گیا ہے اور جس کے مسافر اور عملہ اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ اس کاٹیج کا فرانسیسی نام شالیٹ ہوا کرتا تھا اور اس کی ایک دیوار پر بحری جہاز کا ایک لنگر بھی لٹکا ہوا ہوتا تھا۔ اسمبلی ہال کے سامنے والے قطعے میں اتنے گھنے اور گنجان درخت ہوتے تھے کہ یہ قطعہ جنگل کا ایک ٹکڑا لگتا تھا۔ پلازہ سینما کی طرف سے ان درختوں کی وجہ سے اسمبلی ہال کی عمارت بالکل دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف فری میسن ہال پر ایک پراسرار آسیبی قسم کی خاموشی ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ اس سنسان عمارت سے خاموشی کی لہریں نکل نکل کر مال روڈ کو اپنی بانہوں میں سمیٹتی رہتی تھیں۔ اس خاموشی میں چڑیا گھر میں کوئی مور بولتا تو اس کی آواز دیر تک فضا میں گونجتی رہتی۔ لارنس باغ کی طرف سے پھولوں، سبزے کی خوشبو اور پرندوں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ شہر میں آبادی کا پھیلاؤ اور سیم وزر کی ریل پیل شروع ہوئی تو مال روڈ کا حُسن بکھرنے لگا اور بکھرتا ہی چلا گیا۔ اب شاہراہِ قائداعظم اور شاہ عالمی کی سڑک میں صرف یہی ایک فرق ہے کہ شاہ عالمی سے رنگ محل جانے والی سڑک لوہاری دروازے کے پاس واقع ہے جبکہ شاہراہِ قائداعظم ٹمپل روڈ کے پاس واقع ہے۔ آج کی شاہراہِ قائداعظم کا حال احوال بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ آپ کے سامنے ہے اور اس پر سے آپ اکثر گزرنے کا خطرہ مول لیتے رہتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو صرف اس شاہراہِ قائداعظم کی ایک جھلک دکھائی تھی جو آج آپ کے سامنے نہیں ہے اور جس پر سے شاید ہی آپ کبھی گزرے ہوں۔

لاہور کی ایک اور چھوٹی سی ذیلی سڑک برڈ ووڈ روڈ ہوا کرتی تھی جو جیل روڈ سے نکلتی اور کوئینز روڈ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ بفضلہٖ تعالیٰ یہ سڑک آج بھی اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے لیکن جس برڈ ووڈ روڈ کا میں ذکر کرنے والا ہوں وہ آج کی برڈ ووڈ روڈ سے بہت مختلف تھی۔ جس طرح کسی بڑی نہر سے ایک چھوٹی سی نہر نکال کر پھل دار باغوں میں ڈال دی جاتی ہے بالکل اسی طرح یہ سڑک جیل روڈ سے نکل کر کوئینز روڈ کی طرف ایک خاموش، بے آواز نہر کی طرح چلی گئی تھی۔ اس سڑک پر ہمارے ایک دوست کی کوٹھی ہوا کرتی تھی۔ پرانی طرز کی برآمدوں اور کچی چھت والی کوٹھی تھی جس کے آگے پیچھے ویران باغ تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ٹاہلی اور شہتوت کے درخت سارا دن چپ چاپ کھڑے رہا کرتے تھے۔ ہم کبھی اپنے دوست سے ملنے اس کی کوٹھی کے پرانے گیٹ سے گزر کر کچے راستے پر چلتے ہوئے برآمدے کی طرف جاتے تو ہمیں اپنے قدموں کی آواز اپنا تعاقب کرتی سنائی دیتی۔ اس کوٹھی سے آگے مجھے یاد نہیں کہ کوئی کوٹھی آتی ہو، کافی آگے جا کر بائیں جانب ایک سال خوردہ کوٹھی ضرور آتی تھی جس کے لان میں اتنے درخت اُگے ہوئے تھے کہ کوٹھی کا برآمدہ بمشکل نظر آتا۔ پھر آگے بائیں جانب تالاب آجاتا جہاں کچھ لوگ کناروں پر بیٹھے مچھلیاں پکڑنے کے انتظار میں جیسے پتھر ہو گئے ہوتے تھے۔ تالاب کی سطح پر ہری ہری کائی کی تہہ چڑھی ہوتی تھی۔ کوئینز روڈ پر سامنے پہاڑی کی ڈھلان پر بھی درخت جھک کر خالی سڑک کا نظارہ کر رہے ہوتے تھے۔ کوئینز روڈ بھی جیسے کسی کے انتظار میں چپ چپ سی رہا کرتی۔

مزنگ چونگی والے چوک میں نہ ہونے کے برابر ٹریفک ہوتا تھا۔ یہاں سے جو سڑک ٹمپل روڈ کی طرف جاتی ہے اس کی ایک جانب چھوٹی سی پرانی مسجد کے پیچھے ایک تکونا کھیت ہوا کرتا تھا جہاں عام طور پر تمباکو کی کاشت کی جاتی تھی۔ پہلے تمباکو کے چھوٹے چھوٹے پتے کیاریوں میں نمودار ہوتے جو دھوپ میں چمکا کرتے۔ پھر یہ پودے بن جاتے۔ پتے چوڑے چوڑے ہوتے تھے۔ دھوپ میں کچھ دنوں کے بعد ان کا رنگ گہرا نسواری ہو جاتا پھر فصل کاٹ لی جاتی اور کھیت اگلی فصل تک کے لئے خالی

ہو جاتا۔ پھر ایک کسان نے بتایا تھا کہ ہم یہاں تمباکو بوتے ہیں۔ اس کے بالکل سامنے جہاں آج کل عابد مارکیٹ بن گئی ہے، وہاں اینٹوں کی ایک بوسیدہ دیوار کے پاس کچھ سرکی بندوں کی جھونپڑیاں بنی ہوتی تھیں۔

جیل روڈ پر بھی کوئی رش نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ٹاہلیوں کے درخت بڑے گنجان اور گہری چھاؤں والے ہوتے تھے۔ ایک طرف جیل کی اونچی کچی دیوار نظر آتی تھی۔ آگے جیل کے محکمے کے کچھ رہائشی کوارٹرز ہوا کرتے تھے۔ شادمان کا ابھی کوئی وجود نہیں تھا۔ شادمان کا چوک بھی نہیں بنا تھا۔ جیل کے کوارٹر اس چوک سے بھی آگے تک چلے گئے تھے۔ یہاں ایک جگہ تھی جہاں کبھی پھانسی گھر ہوا کرتا تھا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس جگہ کسی مشہور انقلابی کو پھانسی دی گئی تھی۔ ویسے یہاں عام طور پر موت کی سزا پانے والوں کو پھانسی چڑھایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب شادمان کالونی بنی اور اس کے پلاٹ دھڑا دھڑ بکنے شروع ہوئے تو وہ پلاٹ خالی ہی پڑا رہا جہاں جیل کا پھانسی گھر ہوتا تھا۔ کوئی بھی خوف کے مارے یہ پلاٹ نہیں خریدتا تھا کہ کہیں پھانسی پا چکے مجرموں کی روحیں ان کی کوٹھیوں میں آکر انہیں تنگ نہ کریں۔

شمع سینما سے شادمان چوک کی طرف جاتے ہوئے میں نے خود دیکھا ہے کہ آس پاس کی ساری کوٹھیاں بن گئی تھیں مگر یہ پھانسی کی کوٹھڑی والا پلاٹ ایک مدت تک خالی پڑا رہا۔ لوگ اس جگہ کوڑا کرکٹ پھینکنے لگے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہوتا ہے صنعتی ترقی کے دور کے ساتھ ساتھ لوگوں کے توہمات بھی مدھم پڑ جاتے ہیں اور یہ بھی ہم نے بڑے بوڑھوں سے سنا ہے کہ جیسے جیسے آبادی بڑھتی ہے، جن بھوت جنگلوں ویرانوں کی طرف بھاگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آخر یہ پھانسی کی کوٹھڑی والا پلاٹ بھی فروخت ہو گیا اور وہاں کوٹھی بن گئی۔ آج اس طرف سے گزرتے ہوئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہاں پھانسی کی کوٹھڑی والا پلاٹ کون سا تھا۔

جو سڑک بلکہ چھوٹی سی گلی نما سڑک میکلوڈ روڈ سے نکل کر ناز سینما کی طرف سے ہوتی ہوئی گوالمنڈی چوک کی طرف جاتی ہے اُس کا نام چرچ روڈ ہے۔ قیامِ پاکستان

سے کافی دیر بعد تک یہ چھوٹی سی سڑک ایک ایسے گمنام غار کی طرح ہوا کرتی تھی جس کے اوپر چھت نہ پڑی ہو۔ خال خال ہی ادھر سے کوئی انسان گزرتا تھا۔ رات کے وقت تو جیسے یہ کوئی آسیبی سڑک بن جاتی تھی اور چوکیدار بھی ادھر سے گزرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ یہاں دونوں جانب دیواریں تھیں۔ ایک طرف چرچ کی دیوار اور دوسری طرف میڈیکل کالج کے گراؤنڈ کی دیوار۔ یہ بڑی پرانی دیواریں تھیں اور ان پر کسی پرانے قلعے کی دیواروں کا گمان ہوتا تھا۔ میں اکثر بڑے اُداس شعر گنگناتے ہوئے اس سڑک پر سے گزرا کرتا تھا۔ یہ میرے لئے رومان خیز سڑک تھی۔ لیکن جب گوالمنڈی کی طرف سے ٹریفک کا شور اور گرد وغبار کا دباؤ بڑھ گیا تو گوالمنڈی سے میکلوڈ روڈ کی طرف پیدل آنے کے واسطے اس سڑک کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ ڈھال بھی شکستہ ہوتی گئی۔ چرچ روڈ پر اتنے رکشے، گاڑیاں اور اسکوٹر دوڑنے لگے کہ خود چرچ روڈ سے بچ کر نکلنا مشکل ہوگیا۔ لاہور کی یہ سڑک بھی مجھ سے جدا ہو گئی۔ چونکہ اس سڑک پر کوئی فٹ پاتھ نہیں ہے اور دونوں جانب دیواریں ہیں اور ٹریفک یہاں بھی بڑی تیز رفتاری سے صبح وشام جاری رہتا ہے اس لئے میں پیدل چلنے والے حضرات کو اس سڑک پر جانے کا خطرناک مشورہ نہیں دوں گا۔

چرچ روڈ۔ کس قدر خوبصورت اور پاکیزہ نام ہے اس پتلی سی سڑک کا۔ مگر بڑھتی ہوئی آبادی نے ہم پیدل چلنے والوں اور لاہور کی سڑکوں کے وفادار دوستوں کو اس سڑک سے بھی محروم کر دیا ہے۔ صد افسوس!

جو سڑک لاہور ہوٹل سے منٹگمری روڈ، اسمبلی ہال کی طرف جاتی ہے اس کا حُسن بھی ان دنوں اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا تھا۔ اس سڑک کے دونوں جانب بھی پیپل کے اونچے اونچے اور بڑے پرانے درخت تھے۔ لاہور ہوٹل سے لے کر اسمبلی ہال تک اس سڑک پر کسی جگہ کوئی دکان نہیں تھی۔ ایک دو کھوکھے ضرور تھے جہاں سائیکلوں وغیرہ کی مرمت ہوتی تھی۔ بائیں جانب قلعہ گوجر سنگھ عبدالکریم روڈ کی گلیاں اور مکان تھے۔ جہاں گلستان سینما ہے وہاں ایک پرانی وضع کی کوٹھی ہوا کرتی تھی جو کافی حد تک ڈھے

چکی تھی اور ایک عرصے سے خالی پڑی تھی۔ آگے میڈیکل سکول کا ہوسٹل تھا۔ اس سے آگے ایک ویران ہوٹل تھا جس کا نچلا پورشن پاکستان رائٹرز گلڈ نے کرائے پر لے لیا تھا۔ سامنے وہی کاٹیج نما پراسرار آسیبی ہوٹل تھا جس کے قریب سے بھی لوگ نہیں گزرتے تھے۔ دن بھر اس سڑک پر سے بھی بہت کم لوگوں کا گزر ہوتا۔ خزاں کی آمد کے ساتھ ہی پیپل کے درختوں پر سے زرد رنگ کے پتے گرنے لگتے اور ساری سڑک پر اُڑتے پھرا کرتے۔ ان پتوں کی چمک ایسی ہوتی تھی کہ جیسے ان پر کسی کریم کا پالش کیا گیا ہو۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میں ایک پتا ضرور اٹھا لیتا تھا۔ اس سڑک کا بھی حلیہ بدلنا شروع ہو گیا۔ ایک ایک کر کے درخت کٹنے لگے۔ پہلے اس طرف کے درخت کٹے جدھر قبرستان کی دیوار لگتی تھی۔ مقصد سڑک کو بڑھتی ہوئی ٹریفک کے لئے کشادہ کرنا تھا۔ یہاں کھوکھے پڑنے لگے جنہیں بعد میں لوگوں نے باقاعدہ پکی دکانوں میں تبدیل کر لیا۔ سامنے کی طرف کے درخت بھی کٹ گئے۔ یہاں لوگوں نے پہلے اپنے مکانوں کے نیچے دکانیں کھول لیں پھر یہ دکانیں دفتروں اور چھوٹی چھوٹی مارکیٹوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اس سڑک پر نشانی کے طور پر شاید ایک آدھ پیپل کا درخت ہی رہ گیا ہے۔ دن بھر یہاں بھی لاہور کی دوسری مصروف ترین سڑکوں کی طرح شور مچا رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور شہر نے بڑی ترقی کر لی ہے اور سڑکیں کشادہ اور خوبصورت بنا دی گئی ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ ہم نے لاہور شہر کو پیدل چلنے والوں کے لئے ناممکن بنا دیا ہے۔ جہاں سڑکوں کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ بنے ہیں وہاں یہ حال ہے کہ ہر وقت لوگوں نے اسکوٹر کھڑے کر رکھے ہوتے ہیں۔ گاڑیاں اوپر چڑھائی ہوتی ہیں۔ شاید ہی لاہور شہر کے وسطی علاقے میں کوئی ایسی سڑک ہو جہاں سے آپ سکون کے ساتھ پیدل گزر سکیں۔ ہم امریکہ اور یورپ کی سڑکوں کے ساتھ اپنی سڑکوں کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کا اپنا ماحول، اپنی بیک گراؤنڈ ہے۔ ہمارا خیال، ماحول اور اپنی تہذیبی بیک گراؤنڈ ہے۔ ان ٹھنڈے ملکوں میں رہنے والوں کا دوپہر کو فیکٹریوں

اور ریستورانوں میں کام کرنا بہت ضروری ہے جبکہ ہمارا گرمیوں کی دوپہروں میں درختوں کی چھاؤں میں سونا بھی بہت ضروری ہے۔

لاہور ہی میں ایک سندر داس روڈ ہے جو ڈیوس روڈ والے چوک سے حضرت میاں میرؒ صاحب کی نہر کے پل کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک پر ایچی سن کالج کے بانس کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھکے ہوتے تھے۔ دوسری جانب آم کے درختوں کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں والی قطار شروع سے آخر تک چلی گئی تھی۔ ان درختوں کے نیچے ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ ساون کی بارشوں میں اس سڑک کی خوبصورتی اور حُسن دیکھنے سے تعلق رکھتا۔ بارش ویسے بھی بانس اور آم کے درختوں کی عاشق ہے۔ یہ درخت بھی بارش سے پیار کرتے ہیں۔ یہاں ساون کے دنوں میں کوئلیں ضرور بولتی تھیں۔ بانس کی نازک ہری بھری ٹہنیاں برسات کے سرمئی بادلوں کو دور سے دیکھتے ہی ہاتھ ہلانے لگتی تھیں۔ آم کے درختوں کی ڈالیاں ہرے ہرے، کچے آموں کے گچھوں کے بوجھ سے جھک جاتی تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ اس علاقے میں بڑھتی ہوئی ٹریفک کا دباؤ اس سندر داس روڈ پر بھی پڑنے لگا اور ایک دن درختوں کے جلاد یہاں بھی آرے، کلہاڑیاں اور سیڑھیاں لے کر آ گئے۔ انہوں نے ایچی سن کالج کی دیوار گرا کر اس جانب سے بانس کے درختوں کا صفایا کر دیا۔ اس سے کیا مسئلہ حل ہو گیا؟ نہیں۔ ٹریفک کا دباؤ اب اس سڑک پر بھی بڑھ گیا لیکن اب اسے مزید کشادہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آگے لوگوں کے گھر ہیں۔

کہتے ہیں وہ سڑک لاہور کی سب سے بڑھ کر خوبصورت سڑک ہے جو میاں میرؒ نہر کے ساتھ ساتھ ملتان روڈ کی طرف جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش سڑک ہے اور غیر ملکی سیاح اور سفارت کار اس سڑک کو بہت ہی پسند کرتے ہیں اور یہاں خاص طور پر تصویریں اتروا تے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سڑک کو جن لوگوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے دیکھا ہے وہ اس کے حقیقی حُسن کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ تب اس سڑک پر اتنی موٹر کاریں، رکشا اور ویگنیں نہیں

چلتی تھیں صرف نہر چلتی تھی اور نہر کے چلنے کی آواز بھی سنائی دیا کرتی تھی۔ لیکن اب نہر کم چلتی ہے اور ٹریفک زیادہ چلتی ہے۔ تب اس کے کنارے یہی پاپولر کے درخت نئے نئے لگے تھے۔ پت جھڑ کے دنوں میں یہ نہر کنارے والی رومانٹک خالی خالی سڑک خشک پتوں سے بھر جاتی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی کی طرح پتے درختوں کی ڈالیوں سے گرتے ہی رہتے تھے۔ ان دنوں ٹریفک صرف نہر کے ایک کنارے پر ہی جاری تھا۔ دوسرا کنارا ابھی کچا تھا۔ ادھر کوئی پختہ سڑک نہیں بنی تھی۔ چنانچہ اس کچی سڑک پر سے گزرتے ہوئے جب درختوں پر سے پتے گرتے تو یوں لگتا جیسے پت جھڑ کی بارش ہو رہی ہے۔ ایک جانب لارنس باغ تھا دوسری جانب نرسریاں تھیں جہاں رنگ برنگے پھول پودے گملوں میں لگے مسکرایا کرتے۔

ایسی ہی خاموش اور پرسکون ایمپرس روڈ بھی ہوا کرتی تھی۔ اس کی دونوں جانب بھی پیپل کے درخت تھے۔ یہ درخت آج بھی ہیں مگر پٹرول اور ڈیزل کے دھوئیں نے ان کا حلیہ بگاڑ ڈالا ہے۔ یہ درخت پہچانے نہیں جاتے اور ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر فضا میں ڈیزل اور پٹرول کی آلودگی کا یہی حال رہا تو یہ درخت بہت جلد مر جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ درخت مر چکے ہیں صرف ان کو سپردِ خاک کرنا رہ گیا ہے۔

ایک اور رومانٹک سڑک ہوتی تھی جو شاہدرہ چوک سے دریائے راوی کی طرف نکلتی تھی۔ اس سڑک کو یوکلپٹس کے نازک درختوں نے اپنی گود میں لے رکھا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ یہ درخت جھومتے رہتے تھے۔ یہ پتلی سی سڑک کھیتوں کے درمیان میں سے گزرتی تھی۔ میں کئی بار اس سڑک پر سے گزر کر دریا پر گیا ہوں مگر ادھر کارخانوں کی تعمیر شروع ہوئی تو یہ سڑک غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ اب اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانے نظر آتے ہیں۔ کھاد، رنگ و روغن اور دوسرے کارخانے اس سڑک کو کھا گئے ہیں۔ اب یہ سڑک کارخانے کبھی واپس نہیں کریں گے۔ اسی شاہدرہ چوک سے جو کچی سڑک کھجور کے درختوں کی طرف جاتی تھی اور جس کے دونوں جانب خانہ بدوشوں کی جھونپڑیاں ہوتی تھیں، اس سڑک کا اب کہیں کوئی نشان تک نظر نہیں

آتا۔ اس کی جگہ خدا جانے کیا کیا کچھ بن گیا ہے۔ مستی گیٹ سے بادامی باغ ریلوے اسٹیشن کو جانے والی سڑک بھی قیامِ پاکستان کے وقت بڑی تنہا تنہا اور چپ چاپ سی ہوا کرتی تھی۔ اب تو یہ سڑک پہچانی ہی نہیں جاتی۔ پرانی سڑکیں، پرانے راستے محبتوں کے راستے لگتے تھے۔ درختوں میں گھرے ہوئے خاموش خاموش، پُرسکون راستے۔ نئی سڑکوں اور نئے راستوں پر ایک کمرشل افراتفری مچی ہوئی ہے۔ کوئی کسی کو نہیں پہچانتا۔ بس بھاگے جا رہے ہیں۔ کیا کبھی زندگی پھر سے ان محبت بھرے پُرسکون راستوں پر واپس آ سکے گی؟

پاکستان کے قیام سے صرف سات برس پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے 1939ء کے پراسپکٹس پر ایک نظر دوڑائیں تو تدریسی عملہ کی 42 اساتذہ کی فہرست میں چند ایک انگریز اساتذہ کے سوا اکثریت ہندو پروفیسر حضرات کی نظر آتی ہے۔ جبکہ صرف 12 مسلمان اساتذہ کے نام اس فہرست میں شامل دکھائی دیتے ہیں جو انگریزی ادب، فلاسفی، سائیکالوجی، عربی، فارسی، اُردو اور تاریخ جیسے مضامین پڑھایا کرتے تھے۔ ان میں کوئی استاد سائنسی مضامین نہیں پڑھاتا تھا۔ فزکس، کیمسٹری، باٹنی، زوالوجی، ریاضی اور اکنامکس پڑھانے والے سبھی استاد ہندو تھے۔ بجز ایک مسلمان پروفیسر ایس اے حامد کے جو ریاضی کے استاد تھے۔ ان مسلمان اساتذہ میں جو بعد میں مشہور ہوئے ان میں ڈاکٹر امداد حسین (انگریزی) پروفیسر سراج الدین (انگریزی) اور غلام مصطفیٰ تبسم (فارسی) شامل ہیں۔

شہر لاہور میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن معاشی اعتبار سے اور تعلیمی میدان میں وہ پسماندہ تھے۔ اس کا اندازہ لاہور میں واقع درج ذیل ہندو اور مسلمان تعلیمی اداروں کی تعداد سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سناتن دھرم کالج، ڈی اے وی کالج، دیال سنگھ کالج اور سکھ نیشنل کالج کے مقابلے میں آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں بسنے والے مسلمانوں کے شہر لاہور کا صرف ایک اسلامیہ کالج فار بوائز اور ایک کالج برائے گرلز تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 47-1946ء اسلامیہ کالج فار بوائز میں بیالوجی کا مضمون ایک ہندو پروفیسر لالہ خدمت رائے پڑھایا کرتے تھے۔ متذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ہندو بحیثیت قوم سائنسی علوم

سے مکمل طور پر باخبر تھے۔ یہ مسلمان ہی تھے جو ان علوم کے حصول سے اغماض برت رہے تھے۔ حالانکہ سائنسی علوم کے فروغ کے سلسلے میں برصغیر میں پہلا قدم سرسید احمد خان جو ایک مستقبل بین شخصیت تھے، نے اٹھایا تھا۔ آپ نے علی گڑھ میں ایک عمارت سائنٹفک سوسائٹی کی تعمیر کروائی تھی جہاں مستند اور کارآمد انگریزی سائنسی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا اور مسلمان نوجوانوں کو سائنس اور جدید مغربی علوم پڑھنے کی نہ صرف ترغیب دی جاتی بلکہ مواقع بھی فراہم کئے جاتے۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام 9 جنوری 1863ء کو غازی پور میں عمل میں آیا۔ 1864ء ایک سال بعد، یہ سوسائٹی علی گڑھ منتقل ہو گئی جس کا واحد مقصد مسلمانوں میں فروغ سائنسی علوم تھا۔ سرسید احمد خان کی تقلید میں غالباً انیسویں صدی کے اختتامی برسوں میں یا بیسویں صدی کے اوائل میں ہندو اہل علم و فن نے چند ہندو اہل ثروت حضرات کی اعانت سے لاہور میں ایس۔ پی۔ ایس۔ کے۔ Society for promotion of scientific knowledge کی بنیاد ڈالی اور بیرون موری دروازہ اس سوسائٹی کے دفاتر کے علاوہ ''ایس پی ایس کے ہال'' کی عمارت تعمیر کروائی تاکہ سائنسی علوم کے فروغ کے لئے معاشرہ میں شعور و آگہی پیدا کی جا سکے اور سائنسی مباحثوں کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا جا سکے۔ اس ہال میں مباحثوں کے علاوہ ڈرامے، موسیقی کے پروگرام اور مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے جن میں ہندوستان سے نامور کلاسیکی فنکار اور ممتاز شعراء شریک ہوتے۔ زندہ دلانِ لاہور بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان محفلوں کی رونق کو دوبالا کرتے اور شاعر حضرات کو جہاں پر دل کھول کر داد دیتے وہاں ہنسی اُڑانے میں بھی کسی بخل سے کام نہیں لیا کرتے تھے۔ کلاسیکی موسیقی کے دلدادہ استادانِ فن کو سنتے اور سر دھنتے۔ ایسی مجالس کی یادیں آج بھی لاہور کے پرانے باسیوں کے ذہن و قلب کو گدگداتی ہیں۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد یہ ہال اور اس سے ملحقہ سوسائٹی کے دفتر تادیر پنجاب پولیس کے زیرِ تصرف رہے۔ چند ایک برس تک اس کے ایک حصہ میں سجادیہ ہومیو پیتھک میڈیکل کالج بھی قائم رہا۔ بعد ازاں لاہور میں ٹریفک کے بڑھتے ہوئے دباؤ

کے پیشِ نظر جب اس کی ملحقہ سڑک کو کشادہ کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو اس ہال کی عمارت کو زمین بوس کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی سوسائٹی برائے فروغِ سائنسی علوم ایس پی ایس کے ہال بھی ماضی کی یادیں اپنے سینہ سے لگائے ہمیشہ کے لئے اس کے ملبہ تلے دفن ہو گیا۔

جہاں تک اس عمارت کا میری یادداشتوں سے تعلق ہے میں نے اسے جس وقت دیکھا اس وقت اس کی رنگا رنگ اور ہنگامہ خیز بزم آرائیاں معدوم ہو چکی تھیں اور یہ عمارت پولیس چوکی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ 1948ء میں میری ادبی زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی میرا بیرون لوہاری دروازے میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لاہور کے تقریباً سبھی معیاری ادبی اشاعتی ادارے اسی علاقے میں واقع تھے یعنی ''مکتبہ اُردو، نیا ادارہ، مکتبہ جدید، اُردو مرکز، نقوش، رسالہ سویرا اور رسالے ادب لطیف کے دفاتر بھی اسی جگہ پر تھے۔ چونکہ میرے افسانے اور میری کتابیں میرے پہلے افسانے کی اشاعت کے ساتھ ہی چھپنی شروع ہو گئی تھیں اس لئے مجھے صبح دم پاک ٹی ہاؤس جانے سے پہلے تقریباً روز ہی کچھ وقت کے لئے جانا پڑتا تھا۔ وہاں دوسرے ادیب شاعر دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ ابنِ انشا، احمد راہی، عارف عبدالمتین، ساحر لدھیانوی، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، ان کے علاوہ بزرگ اساتذہ مثلاً جناب وقار عظیم صاحب، پروفیسر عبادت بریلوی، محمد حسن عسکری صاحب، احمد ندیم قاسمی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کس قدر ادبی گہما گہمی ہوتی تھی ان ادبی اداروں میں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان اشاعتی اداروں کی طرف سے اردو ادب کی وہ بلند پایہ کتابیں اشاعت پذیر ہوئیں جن کا شمار آج اُردو کے ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ مکتبہ جدید کے چودھری بشیر احمد اور چودھری رشید احمد مسودے سے لے کر کتاب کی چھپائی تک ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ کی نگرانی کرتے تھے۔ حنیف رامے صاحب بڑی عرق ریزی اور کمال کے ساتھ ان کتابوں کے سرورق اور حاشیوں کی تزئین و آرائش کرتے تھے۔ جتنی حساس اور بولتی ہوئی لائن حنیف رامے صاحب لگاتے

تھے ایسی لائن بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ مکتبہ اُردو کے چودھری برکت علی صاحب کو ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ انہوں نے اسی زمانے میں برصغیر کے نامور ادباء اور شعراء کی کتابیں بڑے اہتمام اور خوبصورتی سے چھاپیں۔ جب کتابیں لیتھو پر چھپا کرتی تھیں۔ اُردو ادب کی صف اول کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب، شاعر یا نقاد ہو کہ جس کی کتابیں مکتبہ اُردو نے نہ چھاپی ہوں۔ مکتبہ اُردو کے ادارے اور اس ادارے کے مشہورِ زمانہ رسالے ''ادب لطیف'' میں صرف وہی ادیب اور شاعر چھپتے تھے جو صف اول کے ادیب اور شاعر ہوں یا ان میں صف اول کے ادیب اور شاعر بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہوں۔ مکتبہ اُردو کے مالک چودھری برکت علی مرحوم ادب کا بڑا گہرا شعور اور ذوق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ کرشن چندر، منٹو، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ جن ادیبوں کے بھی افسانے رسالہ ''ادب لطیف'' میں چھپنے کے لئے آتے چودھری صاحب ان کا ایک ایک لفظ خود پڑھتے تھے۔ شگفتہ مزاج، پُر جوش اور متحرک شخصیت کے مالک تھے۔ مہمان نواز اور کشادہ دل تھے۔ کم از کم میرے ساتھ ان کے کاروباری تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ میں یہ سب کچھ اپنے تجربے کی بناء پر لکھ رہا ہوں کیونکہ میری سب سے زیادہ ادبی کتابیں چودھری برکت علی صاحب نے ہی چھاپی تھیں۔ ان کے بھائی چودھری نذیر احمد، مالک ''نیا ادارہ'' اور ''سویرا'' خوش مزاجی اور ذوق ادب اور فہم شعر میں کسی سے کم نہیں تھے۔ فن طباعت سے انہیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے میں کتاب نہیں چھاپتا، ایک ایک لفظ چھاپتا ہوں۔

میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''منزل منزل'' چودھری نذیر احمد نے ہی شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے سرورق کے لئے وہ مجھے خاص طور پر ساتھ لے کر مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے مکان پر گئے تھے۔ وہاں مجھے پہلی بار ملک کے اس عظیم مصور سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ چغتائی صاحب اس وقت اپنے مکان کی شاید دوسری منزل میں اپنے ہاتھوں سے کوئی رنگ تیار کر رہے تھے۔ یہ مکان راوی روڈ پر گورا

قبرستان کے پہلو میں تھا۔ چودھری نذیر احمد کتابوں اور رسالے کو اعلیٰ ترین زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کے لئے بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ خوش نویس اور آرٹسٹ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ''اُداس نسلیں'' ناول چھاپنے کے واسطے انہوں نے اُردو ٹائپ خاص طور پر حیدر آباد دکن کے جامعہ عثمانیہ سے منگوایا تھا۔ اس زمانے میں ایسا نفیس، خوبصورت اور سادہ اُردو ٹائپ ملنا ناممکن تھا۔ مشہور شاعر سیف الدین سیف کا پہلا شعری مجموعہ، چودھری صاحب نے اسی ٹائپ پر چھاپا تھا جس کا حُسن و جمال آج بھی دیکھنے کے لائق ہے۔

اس ساری تمہید کا مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ بیرون لوہاری دروازے کا یہ علاقہ قیامِ پاکستان سے پہلے بھی اشاعت ادب کا مرکز رہا تھا اور قیام پاکستان کے بعد اس کی رونق میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایس پی ایس کے ہال کی عمارت موری دروازے کے باہر جہاں دو سڑکوں کا اتصال ہوتا تھا اس جگہ واقع تھی۔ اس علاقے میں ہمارا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اس زمانے میں اس تاریخی عمارت کا زوال شروع ہو چکا تھا اس کے لوہے کے گیٹ کا ایک جنگلا جہاں تک مجھے یاد ہے ہمیشہ کھلا رہتا۔ جنگلے کے اندر عمارت کے خستہ حال برآمدے کے آگے کچے صحن میں دو تین چارپائیاں بچھی رہتی تھیں جن پر ایک آدھ پولیس کا سپاہی تہمد باندھے تیل مالش کرواتا نظر آ جاتا تھا۔ ایک دن پولیس کا عملہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر وہاں سے کسی دوسری جگہ پر منتقل ہو گیا۔ اس کے کچھ ہی روز بعد یہ عمارت مسمار کر دی گئی۔

◎......◎

۸

آج سے پچاس برس پہلے کے چوک لکشمی کا تصور کرتا ہوں تو سب سے پہلے لکشمی بلڈنگ کی پیشانی پر لکشمی دیوی کا ایک بُت نظر آتا ہے جسے بعد میں توڑ دیا گیا۔ رائل پارک میں سارے راستے کچے تھے اور کئی جگہوں پر لکڑی کی گیلیوں کے ڈھیر پڑے رہتے تھے۔ ابھی ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والی سرخ عمارت کا نچلا پورشن الاٹ نہیں ہوا تھا۔ ابنِ انشاء نے کیپٹل سینما کی بغل والی کاٹیج الاٹ کرا لی تھی اور وہاں وہ اپنے کنبے کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ احمد راہی کو گوالمنڈی میں مکان الاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ہمارے ساتھ رائل پارک والی بلڈنگ مین رہتا تھا۔ فکر تونسوی تونسہ شریف میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ احمد راہی اور عارف عبدالمتین جان جوکھوں کا سفر طے کر کے تونسہ شریف گئے اور فکر تونسوی کو وہاں سے نکال کر رائل پارک والی بلڈنگ میں لے آئے تھے۔ فکر تونسوی بھی گوپال متل کی طرح لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے لاہور سے بڑی محبت تھی اور میرا خیال ہے کہ فکر تونسوی آخری ہندو ادیب تھا جو لاہور سے گیا۔

نسبت روڈ پر ترک ہوٹل کے سامنے ''جنتا جنتا پبلشرز'' کا دفتر تھا جہاں پہلی بار میں نے راجندر سنگھ بیدی کو دیکھا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ دفتر بھی بند ہو گیا تھا۔ دیوندر ستیارتھی کی کتاب ''میں ہوں خانہ بدوش'' اسی ادارے کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔ سیاہ زرد آنکھوں والے گوپال متل سے میں ''ادب لطیف'' کے دفتر میں ملا تھا۔ انہی دنوں وہ بھی لاہور چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

فکر تونسوی ابھی ہمارے ساتھ رائل پارک والی بلڈنگ میں رہائش پذیر تھا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں اس بلڈنگ کے نچلے پورشن میں ہم لوگ رہتے تھے۔ یعنی میں، احمد راہی، فکر تونسوی، عارف عبدالمتین اور ساحر لدھیانوی۔ دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں صرف خالی پلنگ تھا۔ دوسرے کمرے یعنی ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ سیٹ تھا۔ دروازے کے پردے ہم نے اتار لئے تھے۔ ایک پردہ اوپر لے کر میں اور احمد راہی ننگے پلنگ پر سوتے تھے۔ دوسرا پردہ اوڑھ کر ساحر لدھیانوی کبھی دری پر اور کبھی صوفے پر سوتا تھا اور اسی طرح باری باری فکر تونسوی اور عارف بھی کبھی صوفے پر اور کبھی دری پر سوتے تھے۔ کارنس پر ایک انعامی کپ پڑا ہوا مل گیا تھا جس میں ہم پائی ڈال کر پیا کرتے تھے۔ ہم سارے ہی فاقہ مست تھے۔

غالباً ساحر لدھیانوی کی کتاب ''تلخیاں'' زیر طبع تھی۔ احمد راہی ''سویرا'' کو ایڈیٹ کرتا تھا۔ میرے صرف ابھی تین چار افسانے ہی شائع ہوئے تھے۔ ایک ''سویرا'' میں اور دو ''ادبِ لطیف'' میں۔ رات کو سگریٹ کے ٹوٹے ڈھونڈھا کرتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک رات ہم کو کمرے میں کہیں سے بھی سگریٹ کے ٹوٹے نہ مل سکے۔ ہم سو گئے۔ اچانک مجھے سگریٹ کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں نے راہی کو جگا دیا۔

''کوئی سگریٹ پی رہا ہے۔''

تمباکو کی تیز بو راہی نے بھی محسوس کی۔ ہم پلنگ پر سے اٹھ کر دبے پاؤں ڈرائنگ روم میں گئے تو ساحر لدھیانوی چادر کے اندر سگریٹ سلگائے مزے سے پی رہا تھا۔ ہم نے اسے پکڑ لیا تو وہ مسکرا کر بولا۔

''یار! آتش دان میں سے ایک ٹوٹا مل گیا تھا۔''

جس روز ہمارے پاس پیسے ہوتے ہم ہوٹل میں بیٹھ کر مزے سے چائے پیسٹری اُڑاتے اور اپنی بلڈنگ میں آ کر کیپسٹن میکنم یا گولڈ فلیک کے سگریٹ سلگا کر خوب لطیفہ بازی کرتے۔ عارف عبدالمتین کی تکلف پسندی اوجِ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں اور راہی اسے بہت پریشان کیا کرتے۔ فکر تونسوی نے اپنی کتاب ''چھٹا دریا'' میں ان

محفلوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ مجھے سہگل کانن اور پنکج ملک کے تقریباً سارے گانے یاد تھے اور میری آواز بھی سہگل سے بڑی ملتی تھی۔ چنانچہ میں ایک ایک کر کے سہگل کے سارے گانے سنا ڈالتا۔ ہم سب تباہ و برباد ہو کر انڈیا سے آئے تھے لیکن دلوں میں نیا خون، نیا جوش اور نیا ولولہ موجزن تھا۔ احمد راہی اور ساحر لدھیانوی اپنی زندگی کی بہترین نظمیں اور غزلیں تخلیق کر رہے تھے۔ فاقہ مستی میں بھی ہمارے چہروں پر ولولۂ تخلیق اور جذبۂ عشق کی سرخیاں پھوٹ رہی تھیں۔ لارنس باغ میں سردیوں کی دھوپ میں کھلے ہوئے گلاب اور گل داؤدی دیکھتا تو خوشی سے میرے کان گرم ہو جاتے اور چہرہ سرخ ہو جاتا۔ کوئی زرد پتا ٹوٹ کر میرے کندھے پر گرتا تو میں اسے اٹھا کر چوم لیتا۔ جنوری کی بارشوں میں جب سرد ہوائیں چلتیں تو میں اور انور جلال درختوں میں چھپی ہوئی راہگذاروں پر گھومنے نکل پڑتے۔

ان ہی دنوں بمبئی سے حمید اختر، صفدر میر اور کیفی اعظمی بھی لاہور آ گئے۔ اب ساحر لدھیانوی کو نشاط سینما کے سامنے والی سرخ بلڈنگ کا نچلا پورشن الاٹ ہو چکا تھا۔ حمید اختر سے میری پہلی ملاقات پیراڈائز ریسٹورنٹ چوک لکشمی میں ہوئی۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ اس جگہ ہوا کرتا تھا جہاں اب گارمنٹس ڈرائی کلینرز کی دکان ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں میرے پہلے تین افسانوں نے ہی مجھے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں کھڑا کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ سارے لوگ مجھے مساوی سطح پر آ کر ملتے تھے۔ ہم سے سینئر ادیب کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، دیوندر ستیارتھی، عصمت چغتائی اور اختر حسین رائے پوری تھے۔ انتظار حسین پاکستان بننے سے پہلے بھی لکھا کرتے تھے مگر ان کا نام ہم نے نہیں سنا تھا۔ اشفاق احمد نے ابھی کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔ غالباً وہ ان دنوں جیسا کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کسی ریلیف سنٹر میں کام کر رہا تھا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور دونوں بہنیں نئی نئی لاہور آئی تھیں اور عارف عبدالمتین اور احمد راہی نے انہیں پیسہ اخبار سٹریٹ میں ایک مکان الاٹ کرا دیا تھا۔ اس روز میں بھی عارف اور راہی کے ساتھ تھا۔

پیراڈائز ریسٹورنٹ میں، میں حمید اختر سے ملا تو اس کے سر پر بھورے رنگ کے گنجان بال تھے۔ صد افسوس! اب وہ بال خراب ہو گئے۔ وہ بڑے خلوص اور بے ساختگی سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے وہ اچھا لگا اور جلد ہی ہماری دوستی ہو گئی۔ احمد راہی سے میری دوستی بڑی پرانی تھی۔ چنانچہ ترقی پسند ادیبوں میں ہماری دوستی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ ہم رات گئے تک اکٹھے ہوتے تھے۔ ابنِ انشاء سے بھی میری بڑی دوستی ہو گئی۔ وہ پرانے بغداد اور الف لیلیٰ کی رنگین سرزمین کا عاشق تھا۔ اور میں تو تھا ہی رومانٹک اور قدیم شہروں کی قدیم تہذیبوں سے محبت کرنے والا۔ جس طرح میں پرانے شہروں، پرانی تہذیبوں سے اپنی محبت کا اظہار افسانوں میں کرتا تھا، ابنِ انشاء ایسا نہیں کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ہمارے حلقے میں بڑا کٹر قسم کا ترقی پسند تھا۔ لیکن وہ میرے ساتھ لاہور کے قدیم کوچوں کی سیر کو اکثر جایا کرتا اور پرانے لاہور کی قدیم چھتی ہوئی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے بڑا خوش ہو کر کہا کرتا۔

''اے حمید! ان گلیوں کی سیر کا تیرے ساتھ بڑا مزا آتا ہے۔''

ان دنوں رسالہ ''سویرا'' کا دفتر لکشمی چوک میں اس بلڈنگ میں ہوا کرتا تھا جہاں اب پاپولر پکچرز کا دفتر ہے۔ بلکہ اس دفتر سے دو دفتر مشرقی جانب چھوڑ کر تھا۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ اب گارمنٹس ڈرائی کلینرز والی دکان سے اٹھ کر ''سویرا'' کے دفتر کے عین نیچے آ گیا تھا۔

ترقی پسند ادیب ان دنوں پیراڈائز ریسٹورنٹ میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان ادیبوں میں قیوم نظر اور شہرت بخاری بھی شامل تھے۔ جب ''سویرا'' کا دفتر لکشمی چوک سے اٹھ کر لوہاری دروازے کے باہر مکتبہ اُردو کے پہلو میں آ گیا تو پیراڈائز ریسٹورنٹ اُجڑ گیا۔ ترقی پسند ادیبوں کا سارا ٹولہ وہاں سے اٹھ کر پاک ٹی ہاؤس میں آ گیا۔ لیکن پیراڈائز ریسٹورنٹ چھوڑنے سے پہلے ہمارے کچھ ساتھی بچھڑ گئے۔ مثلاً کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی۔ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود وہ ایک روز والٹن ایئرپورٹ سے ایک ٹرک نما ہوائی جہاز میں سوار ہوئے اور عازمِ بمبئی ہو گئے۔

پیراڈائز ریسٹورنٹ کی یادیں آج بھی میرے ذہن میں تر و تازہ ہیں۔ شروع شروع میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے کچھ ادبی اجلاس اس ریسٹورنٹ کی گیلری میں بھی منعقد ہوئے۔ عبداللہ ملک ان دنوں بڑے پُر جوش انقلابی مضمون لکھا کرتا تھا۔ خاص طور پر جیولس فیوچک پر اس نے جو مضمون لکھا وہ بڑا مشہور ہوا۔ محترمہ حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ان دنوں نسبت روڈ والے مکان میں منتقل ہو چکی تھیں اور بڑے زور و شور سے افسانے بھی لکھ رہی تھیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں بھی باقاعدگی سے شرکت کرتی تھیں۔ اب اس انجمن کو فیض صاحب اور قاسمی صاحب کی سرپرستی میسر تھی۔ سعادت حسن منٹو صاحب ایک سال بعد بمبئی سے لاہور آتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کراچی آ چکی تھیں۔ وہ لاہور آتیں تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں ضرور شرکت کرتیں۔ سید سبط حسن بھی لاہور میں آ چکے تھے۔ ان کا پائپ اور شرمیلی مسکراہٹ ہم لوگوں میں بڑی پاپولر ہو چکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی صاحب نے دہلی سے آ کر کراچی منتقل ہونے کے بعد ''ساقی'' کا اجرا باقاعدہ شروع کر دیا تھا۔ محمد حسن عسکری صاحب کی نگارشات ''ساقی''، ''ادبِ لطیف'' اور ''سویرا'' میں شائع ہو رہی تھیں۔ شفیق الرحمٰن کی شگفتہ تحریریں اپنے عروج پر تھیں اور ہم ان سے بڑے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ ''ان داتا'' اور ''شکست'' کے بعد کرشن چندر اپنی ''پشاور ایکسپریس'' اور ''تین غنڈے'' ایسی کہانیوں میں ہمیں اپنے ساتھ رلا رہا تھا۔ منٹو کے ''گوپی ناتھ'' اور ''مسز ڈی سلوا'' ایسے افسانوں نے لوگوں کو چونکا دیا تھا۔

دو ادب نواز بھائیوں نے نسبت روڈ کی ایک گلی سے ''جاوید'' نام کا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔ میں بھی اس کے عملہ ادارت میں تھا۔ منٹو صاحب اب بمبئی سے لاہور آ گئے تھے۔ ''جاوید'' کے پہلے پرچے میں منٹو صاحب کا افسانہ چھپا۔ اسی میں میرا افسانہ ''راون کے دیس میں'' بھی تھا۔ منٹو صاحب کے تاریخی افسانے پر حکومت نے ''جاوید'' پر مقدمہ دائر کر دیا۔

رسالہ ''جاوید'' کو میں نسبت روڈ پر نصیر انور کے رشتہ داروں کے پاس چھوڑ کر

دوبارہ لکشمی چوک والے پیراڈائز ریسٹورنٹ میں آتا ہوں۔

اس ریسٹورنٹ میں، میں نے پہلی دفعہ م۔حسن لطیفی کو دیکھا۔ ساحر لدھیانوی، حمید اختر اور ابن انشاء کی زبانی میں لطیفی صاحب کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ پہلی بار م۔حسن لطیفی کو دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں فرعون کے زمانے کا کوئی مصری کاہن دیکھ رہا ہوں۔ کانوں کے اوپر تک منڈھا ہوا سر، گہرا گندمی رنگ، بڑا سر، نوکیلی ناک اور تیز چمکیلی ذہین آنکھیں۔ انہیں فرانسیسی اور انگریزی زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ ان دنوں ہیر رانجھے پر انگریزی میں تحقیق کر رہے تھے۔ لدھیانے میں پیدا ہونے پر بے حد فخر تھا۔ لدھیانے کو ارض لد کہہ کر پکارتے اور یہ ثابت کرتے کہ انجیل مقدس میں جس ارض لد کا ذکر ہے وہ دراصل لدھیانہ ہی ہے۔ لدھیانے کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ مجھے م۔حسن لطیفی سے عقیدت سی ہو گئی۔ یہ عقیدت میں نے نہ تو لطیفی پر ظاہر کی اور نہ اپنے دوستوں پر لیکن لطیفی صاحب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں انہیں پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتے اور میں ایک پل کے لئے بور نہ ہوتا۔ چائے سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ چائے کی کیتلی میں سے آخری قطرے بھی پیالی میں نچوڑ لیتے اور پھر فرانسیسی میں چائے پر ایک آدھ شعر پڑھ دیتے۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ دسمبر 1955ء میں اپنی طویل نظم ''صبح کاذب'' خود ہی پمفلٹ کے طور پر چھپوا کر دوستوں میں تقسیم کی جس کی ایک کاپی مجھے بھی دی۔ ان کی دستخط شدہ یہ کاپی اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کا انتساب انہوں نے اپنے پیارے بیٹے میاں محمد پرویز فریدون لطیفی کے نام کیا ہے جس سے لطیفی صاحب کو والہانہ محبت تھی۔ اور جس کی حسرت آیات جواں مرگی نے ستم نصیب باپ کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ پمفلٹ کے دوسرے صفحے پر لطیفی صاحب کی تصویر ہے جس کے نیچے عرفی کے یہ دو اشعار درج ہیں۔

منم آں یوسف گم روزہ کہ تا رفتہ بہ مصر
تا بروں آمدم از چاہ بہ زنداں رفتم

روئے پیشانی صبح طرب ام لیک چہ سود
کہ زغم تیرہ تراز شامِ غریباں رفتم

کمیونزم کی دہریت کے سخت مخالف تھے اور انسانیت کی نجات حضور سرورِ کائنات محمد ﷺ کے نقشِ قدم مبارک کی پیروی میں ہی دیکھتے تھے۔ آخری عمر میں بالکل درویش ہو گئے تھے۔ دوستوں سے اٹھنی روپیہ ادھار لیتے اور اسے غریبوں میں بانٹ دیتے یا مسکینوں کو کھانا کھلا دیتے۔ میں نے انہیں آخری بار بہاولپور روڈ پر دیکھا۔ میں چوبرجی سے مزنگ چونگی کی طرف پیدل آ رہا تھا کہ جنازگاہ کے پاس مجھے مل گئے۔ کندھے پر کپڑے میں لپٹی ہوئی تندوری روٹیوں کا گٹھڑ اُٹھا رکھا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ لطیفی صاحب مسکرائے اور بولے۔

''قبرستان جا رہا ہوں۔''

''یہ کپڑے میں کیا ہے؟''

''روٹیاں ہیں۔ مسکینوں کو کھلاؤں گا۔''

پھر ذرا شرما کر مسکرائے۔ ان دنوں ان کی صحت بڑی کمزور ہو گئی تھی۔ لطیفی صاحب نے ہاتھ ملایا اور قبرستان کی طرف چل دیئے۔ اس کے بعد میں نے سنا کہ لطیفی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے مرحوم لختِ جگر میاں محمد پروین فریدون لطیفی نے اپنے پیارے ابا کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے سامنے لطیفی صاحب کا مسکراتا ہوا اُداس چہرہ آ گیا۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

قیام پاکستان کے بعد امرتسر کے ادیب اور شاعر امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو ایک ایک کر کے گوالمنڈی لاہور کے شیراز ہوٹل اور کشمیر ہوٹل میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ 1947ء میں گوالمنڈی اور نسبت روڈ کے متروکہ مکان تقریباً خالی پڑے تھے اور امرتسری مسلمانوں نے اس علاقے میں آباد ہونا شروع کر دیا۔ گوالمنڈی چوک میں امرتسر کے اسحاق صاحب نے شیراز ہوٹل کھول لیا۔ ادیب اور شاعر ایسے ٹھکانوں کی تلاش میں رہتے تھے جہاں بیٹھ کر وہ ادبی محفلیں گرم کر سکیں۔ چنانچہ اسحاق صاحب کا شیراز ہوٹل امرتسر کے ادیبوں اور شاعروں کا ٹھکانہ بن گیا۔

سیف الدین سیف، ساغر صدیقی، ظہیر کاشمیری، احمد مشتاق، شہزاد احمد شہزاد، صلاح الدین ندیم، علاؤ الدین کلیم، حسن بخت، صدیق کلیم، امین گیلانی، خواجہ پرویز، احمد راہی، عارف عبدالمتین، خواجہ افتخار اور پنجابی کے شاعر استاد عیسیٰ نظامی گنجوی، استاد حاضر، استاد ناظر، استاد محبت اور معراج الدین اختر بھی شیراز ہوٹل میں بیٹھنے لگے۔ ابھی پاک ٹی ہاؤس کا سنہری دور شروع نہیں ہوا تھا۔ ہم سب لوگ مشرقی پنجاب کے آگ اور خون کے دریا میں سے گزر کے آئے تھے۔ قدرتی طور پر شعر و ادب پر کم باتیں ہوتی تھیں۔ امرتسر کے خونیں فسادات کی باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے سے دریافت کرتے تھے کون پیچھے رہ گیا ہے۔ کون کون لوگ آ گئے ہیں۔ زخم ابھی تازہ تھے لیکن پاکستان پہنچ جانے کی سب کو خوشی بھی تھی۔ صورتحال ناصر کاظمی کے اس شعر جیسی تھی

خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں
آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

شیراز ہوٹل کے بالکل سامنے چوک گوالمنڈی میں ہی لالہ شفیع کا پنجاب ہوٹل قائم ہو گیا تھا۔ قریب ہی ریلوے روڈ پر کشمیر ہوٹل تھا۔ شام کے وقت اس ہوٹل میں بھی محفلیں جمتی تھیں۔ کشمیر ہوٹل کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں کشمیری چائے بھی ملتی تھی۔ پنجاب ہوٹل میں کلچے، باقر خانیاں، کھنڈ کلچے، نمکین کلچے لگنے لگے۔ نسبت روڈ پر امرتسری کشمیری ہریسے کی دکان کھل گئی۔ امرتسر کے بے مثال خطیب، عالم دین اور طبیب مولانا غلام محمد ترنم نے امرت دھارا بلڈنگ میں دکان الاٹ کروائی اور طبابت شروع کر دی۔

امرتسر کے عنایتی حلوائی نے چوک گوالمنڈی میں ہی دکان کھول کر قتلمے تلنے شروع کر دیئے۔ شیراز ہوٹل کی بائیں جانب معراج دین کی دکان پر شام کو سیخ کباب اور تکوں کی خوشبوئیں اُڑنے لگیں۔ شیراز ہوٹل ہی کی دائیں جانب دودھ دہی کی دکان پر بڑی بڑی کڑاہیوں میں دودھ ابلنے لگا اور صبح کے وقت دہی کے کونڈے دیکھتے دیکھتے خالی ہو جاتے۔ ہلکے سبز رنگ کی ملائی کے نیچے سفید دودھیا دہی۔ کیا خوب جما ہوا دہی ہوتا تھا۔ چوک گوالمنڈی میں ہی ہم ادیبوں کے یار غار حاجی صاحب نے سری پائے لگانے شروع کر دیئے۔ صبح صبح لوگ سری پائے کا ناشتہ کرتے اور حلوائی کی دکان پر جا کر پیڑوں کی لسی پیتے۔ پیڑوں کی لسی تو اب خواب ہو گئی ہے۔ پیڑوں کی لسی بنانے کی بھی خاص ترکیب ہوتی تھی۔ دو پیڑے ڈولچی میں ڈال کر انہیں مدھانی سے خوب رگڑا جاتا تھا۔ بیچ میں پانی کا چھینٹا مارا جاتا تھا۔ جب پیڑوں کا کھویا خوب گھل جاتا تو اس میں حسب ضرورت پانی ڈال کر مدھانی کو دو تین منٹ تک خوب زور سے چلایا جاتا۔ پھر جب لسی پیالے میں ڈالی جاتی تو پیڑوں کا مکھن کنول کے پھول کی طرح پیالے میں تیرتا نظر آتا۔

امرتسر کے محمد شفیع نے پنجاب ہوٹل کی بغل میں ایک چھوٹی سی سگریٹ پان کی دکان کھول لی۔ چوک میں ہی صوفی صاحب نے اپنا تنور لگا لیا اور صبح کے وقت گرم گرم کلچے، تافتانے اور سہ پہر کو باقر خانیاں لگنے لگیں۔

یوں اس طرح نسبت روڈ، ریلوے روڈ اور گوالمنڈی کا علاقہ ایک چھوٹا سا امرتسر بن گیا۔ شروع شروع میں دوست احباب مل بیٹھتے تو امرتسر کے کمپنی باغ، سکتری باغ اور اپنے اپنے گلی محلوں کی باتیں ہوتیں۔ ان شہیدوں کو یاد کیا جاتا جنہوں نے پاکستان پر اپنی جانیں قربان کر دیں اور ان کی بے گور و کفن میتیں امرتسر کے گلی کوچوں، بازاروں اور مکانوں میں پڑی رہ گئیں۔ دل غمگین ہو جاتے، چہرے افسردہ ہو جاتے۔ لیکن بہت جلد امرتسری مسلمانوں کی زندہ دلی اور نئے وطن پاکستان کی ترقی و تعمیر کا عزم ہجرت کے غم و اندوہ پر غالب آ گیا اور ایک نئے جوش و ولولے کے ساتھ نئی زندگی کا سفر شروع ہو گیا۔

مشہور درویش صفت شاعر ساغر صدیقی نے شیراز ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں اپنا عارضی ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ یہ اس کے آغاز کا زمانہ تھا۔ دبلا پتلا، خوش لباس، چمکیلے بالوں والا نوجوان تھا۔ وہ بھی ہم سب امرتسری دوستوں کے ساتھ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا۔ غزل کا شاعر تھا اور اس زمانے میں ہی بڑے اچھے شعر کہتا تھا۔ شام کے وقت کبھی شیراز ہوٹل، کبھی سامنے والے پنجاب ہوٹل اور کبھی کشمیر ہوٹل میں محفل لگتی۔ شعر و شاعری ہوتی۔ ادب اور سیاست پر گفتگو ہوتی۔ بابو غلام محمد بٹ، جناب ضبط قریشی اور سیف الدین سیف محفل میں ہوتے تو ادب و شعر سے ہٹ کر عروض قافیہ، علم الاخلاق اور فلسفہ عمرانیات پر بحث شروع ہو جاتی۔ اس دوران اگر خواجہ پرویز آ جاتا تو اس کی خوش گفتاری، بزم سنجی اور اس کے بے ساختہ دل میں اتر جانے والے شعروں سے محفل کا رنگ بدل جاتا اور فضا ایک بار پھر شعر گوئی سے ترنم ریز ہو جاتی۔

گوالمنڈی کی ایک گلی میں ہمارے خالو نے ایک مکان الاٹ کروا لیا تھا۔ مکان میں بجلی تھی مگر پنکھے نہیں تھے۔ پنکھے لوٹ مار کرنے والے اتار کر لے گئے تھے۔ چارپائی سارے مکان میں صرف ایک ہی تھی۔ دو چار روز میں نے اور آرٹسٹ بھائی نے زمین پر سونے کی کوشش کی مگر گرمی اور مچھروں نے سونے نہ دیا۔ اس کے بعد میں نے اور

آرٹسٹ بھائی نے یہ معمول بنا لیا کہ رات کو سونے کے لئے بادشاہی مسجد کے سامنے والے حضوری باغ چلے جاتے۔ آرٹسٹ بھائی کو گانا آتا تھا۔ میں بھی سہگل اور پنکج ملک کی پوری پوری نقل اتار لیتا تھا۔ ہم گھاس کے پلاٹ میں بیٹھے رات کے بارہ ایک بجے تک ''چتر لیکھا'' فلم اور نیو تھیٹرز کے گانے گاتے رہتے۔ آرٹسٹ بھائی کو فلم ''چتر لیکھا'' کا ایک گانا بڑا پسند تھا۔ وہ گردن ایک طرف ڈال کر مزے مزے سے گانا سناتا۔

رُت آئے رُت جائے پنچھی
ساون آیا کلیاں مہکیں
شاخوں سے اجلے دستر پہنے
سج دھج کر سب سندریوں نے
پہن لئے پھولوں کے گہنے
گیت سہانے گائے
رُت آئے رُت جائے

یہ کیدار شرما والی ''چتر لیکھا'' فلم تھی۔ میں نے یہ فلم پہلی بار کلکتے کے میٹرو سینما میں دیکھی تھی۔ میں نیا نیا بنگال، برما، لنکا اور جنوب مشرقی ایشیاء کے دریاؤں، جنگلوں اور بارشوں سے جدا ہوا تھا۔ ابھی میرے بالوں میں جنوبی سمندروں کی ہواؤں کی نمی اور کپڑوں میں بارش میں بھیگتے جنگلوں میں کھلنے والے رتنا کلی اور کنول کے پھولوں کی خوشبو باقی تھی۔ ابھی مسلم امرتسر کے کمپنی باغ کے آم کے درختوں اور آدھی رات کو کھلنے والے رات کی رانی کے پھولوں کی خوشبوئیں میرے سانس کے ساتھ سانس لیتی تھیں۔ میں اپنی اُداس آواز میں آرٹسٹ بھائی کو پنکج ملک کا گیت سناتا۔

پیا ملن کو جانا

پھر ہم نیو تھیٹرز کی فلموں کی باتیں کرنے لگتے۔ کمپنی باغ کی چھوٹی نہر کو یاد کرتے۔ نہر پر جھکی ہوئی آم کی ٹہنیوں کو یاد کرتے۔ اپنی گلی محلے کے لوگوں کی باتیں کرتے اور بعض دلچسپ کرداروں کی نقل اتار کر خوب ہنستے۔ اس طرح باتیں کرتے،

ہنستے، اُداس ہوتے پتہ نہیں ہم کب سو جاتے۔

بچپن ہی سے مجھے منہ اندھیرے اٹھ کر باغوں اور کھیتوں کی طرف نکل جانے کی عادت تھی۔ میں سیر کرنے کے خیال سے نہیں جاتا تھا۔ سورج نکلنے سے بہت پہلے مشرقی آسمان پر جو ایک نور سا پھیل جاتا تھا اس نور کی بے معلوم سی روشنی میں اداس ٹپکاتے درختوں، شبنم میں بھیگے پھولوں اور اندھیرے میں ڈوبے امرود کے باغوں کو دیکھنے کا شوق مجھے لے آتا تھا۔ پچھلے پہر کے اندھیرے اور اجالے میں امرود اور ناشپاتی کے باغوں کی طرف سے ہوا آتی تو میں رک کر گہرے سانس لینے لگتا۔ اونچے اونچے گھنے درختوں کے اندھیرے میں کھڑے ہو کر منہ اٹھا کر اداس ٹپکاتی شاخوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ میرے چہرے پر شبنم کی بوندیں گرتیں تو میں بڑا خوش ہوتا۔ منہ اندھیرے کی ہوا میں، نہر کے کناروں کی گیلی مٹی، درختوں سے ٹوٹ کر گرے پڑے شبنم میں بھیگے پتوں، گیندے اور گلاب کے پھولوں کی مہک ہوتی۔ مجھے برما، سیلون اور بنگال کے جنگل اور ان جنگلوں کے بانس اور ناریل کے تیز بارشوں میں بھیگتے، جھومتے درخت یاد آ جاتے۔ میں گوالمنڈی والے مکان میں بھی منہ اندھیرے اٹھ کر لارنس باغ (جناح باغ) کی طرف چل پڑتا۔ مگر گوالمنڈی کے آس پاس کوئی کھیت نہیں تھے، کوئی نہر نہیں تھی۔ امرود اور آم کے باغ نہیں تھے۔ میں گلیوں، بازاروں کے اونچے اونچے مکانوں کے جھرمٹ میں سے تیز تیز قدموں سے گزر کر لارنس باغ پہنچ جاتا۔ یہ 1948ء کا زمانہ تھا۔ بڑی خاموشی ہوتی تھی۔ آسمان پر پھیلتے صبح کے نور کی نیلگوں روشنی اور اندھیرے میں لارنس باغ کے سایہ دار، گھنے درختوں کے خاکے نظر آ رہے ہوتے۔ فضا میں قسم قسم کے پھولوں، گھنے درختوں اور سبزے کی مہک بسی ہوتی۔ چڑیا گھر کے اندر کھجور کے تین درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے لنکا اور بنگال کے جنگلوں کے ناریل کے درخت یاد آ جاتے۔ بالوں میں رتنا کلی کے پھول لگائے، تھالیوں میں کنول کے پھول سجائے، مندروں کو جاتی سنتھالی پجارنیں یاد آ جاتیں۔

میں دیر تک لارنس باغ میں پھرتا رہتا۔ لارنس باغ نے میری یادوں کی افسردگی کو

سنبھال لیا تھا۔ لارنس باغ کے درخت مجھے اپنے دوست، اپنے غمگسار لگنے لگے تھے۔ میں گوالمنڈی کی گلیوں سے نکل کر ان درختوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ درخت بغیر لفظوں کی زبان میں مجھ سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ کہہ رہے ہیں، کچھ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی زبان خاموشی کی زبان تھی۔ جنگل کی زبان تھی۔ کبھی میں اس زبان کو سمجھتا تھا، کبھی میں بھی اس زبان میں ان درختوں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ تب جنگل میرا گھر تھا۔ درخت میرے گھر کی چاردیواری تھی۔ درختوں کی گھنی شاخیں میرے گھر کی چھت تھی۔

پھر آہستہ آہستہ جنگل مجھ سے بچھڑ گیا۔ میں جنگل سے بچھڑ گیا اور میں ان کی زبان، اپنی زبان بھول گیا۔ میں شہروں کی اونچی اونچی بلڈنگوں میں آ گیا۔ جنگل مجھے دور سے آوازیں دیتے۔ مجھے اپنی طرف بلاتے۔ لیکن اب نہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے۔ لیکن محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ عشق میں بڑی بلاخیزی ہوتی ہے۔ میں بار بار لارنس باغ کے دوست درختوں سے ملنے آتا۔ بارشوں میں آتا۔ آندھیوں میں آتا۔ تپتی دوپہروں میں آتا۔ میری محبت رنگ لائی۔ میں درختوں کی زبان اور درخت میری زبان سمجھنے لگے۔ پھر میں درختوں کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ میں بھی خاموش ہوتا۔ درخت بھی خاموش ہوتے اور ہم خموشی کی زبان میں دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔ ابھی لارنس باغ یعنی باغ جناح میں اوپن ایئر کینٹین نہیں کھلی تھی۔ جب باغ کی پہاڑی کے سائے میں اوپن ایئر کینٹین کھل گئی تو پھر میں اور ابنِ انشا وہاں آ کر چائے پیتے۔ شاعری اور افسانوں کی باتیں کرتے۔ اوپن ایئر کینٹین کے سبز رنگ کے کیبن کے پاس املتاس کا ایک سایہ دار درخت تھا۔ مئی جون کے مہینے میں اس درخت پر پھول آتے اور اس کی جھکی ہوئی شاخوں پر املتاس کے زمرد پھولوں کے گچھے لٹکنے لگتے۔ ایسے لگتا جیسے درخت کی شاخوں میں فانوس روشن ہیں۔ دھوپ میں اس درخت کے اردگرد زرد رنگ کی روشنی پھیلی رہتی۔ اس روشنی میں خوشبو ہوتی۔ املتاس کے زرد پھولوں کی خوشبو۔ دھیمی دھیمی، زرد اور دل کو اُداس کر دینے

والی خوشبو۔ اس درخت کے نیچے بیٹھ کر ابنِ انشا نے مجھے اپنی مشہور رومانوی نظم ''بغداد کی ایک رات'' کے کچھ بند سنائے تھے۔ پھر ہمارے دوسرے شاعر ادیب دوست بھی باغ جناح کی اوپن ایئر کینٹین میں آنا شروع ہو گئے اور یہ کینٹین کچھ دیر کے لئے ادبی سرگرمیوں کی آماجگاہ بن گئی۔

پھر جب جدائی کی بے وفا ہوائیں چلنا شروع ہوئیں تو زمرد پتے اپنی شاخوں سے ٹوٹ کر ایک ایک کر کے گرنے لگے اور ہوا انہیں اُڑا لے گئی اور لارنس باغ کی کینٹین کا ادبی ٹھکانہ بھی شاعروں ادیبوں سے خالی ہو گیا۔ کبھی باغ جناح جاتا ہوں تو میرے دوست درخت دور سے مجھے اپنی خاموش آواز میں بلا کر پوچھ لیتے ہیں۔

''تم اکیلے کیوں ہو؟ وہ لوگ کہاں چلے گئے جو تمہارے ساتھ یہاں بیٹھا کرتے تھے، تم سے باتیں کیا کرتے تھے؟''

۹

لاہور کے آسمان نے داتا کی نگری میں ایسے ایسے باکمال فنکاروں، موسیقاروں اور دانشوروں کو گلی کوچوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے کہ جن میں سے کسی ایک کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ علماء کرام اور دانشوروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہاں میں لاہور کے کچھ عظیم فنکاروں اور موسیقاروں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ان میں سے کچھ کو میں نے اپنی آنکھوں سے چلتے پھرتے، باتیں کرتے دیکھا ہے۔ کچھ میری ہوش سے پہلے کے ہیں۔ ان کا ذکر میں ان کی زبانی آپ کو سناؤں گا جو انہیں جانتے تھے اور ان کے فن سے بخوبی واقف تھے۔

ریڈیو پاکستان سے منسلک ہونے کی وجہ سے مجھے بعض نامور فنکاروں کو قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ سب سے پہلے میں لاہور بلکہ مشرق کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی کا ذکر کروں گا۔ چغتائی صاحب کو پہلی بار میں نے غالباً 1949ء میں دیکھا یا ہوسکتا ہے اس سے ایک دو سال بعد دیکھا ہو۔ ان کے فن کی عظمت سے میں واقف تھا۔ وہ افسانے بھی لکھتے رہے تھے اور میں ان کے افسانے جہازی سائز کے رسالے ''ادبی دنیا'' میں امرتسر کی لائبریری میں بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ مگر سب سے زیادہ متاثر میں ان کی تصویروں سے ہوا تھا۔ ان کی لکیر بڑی زندہ اور بولتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دیوانِ غالب کو مرقع چغتائی کے نام سے مصوری کر چکے تھے۔ یہ بھی بڑے کمال کی تصویریں تھیں اور ہر تصویر میں غالب کے متعلقہ شعر کے موڈ

کو پوری طرح قابو کیا گیا تھا۔ لاہور میں 1947ء میں آ کر جب میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو میری شناسائی ادبی حلقوں سے ہو گئی۔ لاہور میں ناشرین کے دو بڑے مستند ادبی ادارے تھے۔ ایک مکتبہ اُردو اور دوسرا نیا ادارہ۔ ان کے علاوہ مکتبہ جدید بھی قائم ہو گیا تھا۔ مکتبہ اُردو کی طرف سے ''ادب لطیف'' رسالہ نکلتا تھا اور نیا ادارہ کی طرف سے رسالہ ''سویرا'' شائع ہوتا تھا۔

نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر احمد طباعت اور شعر و ادب کا بڑا اعلیٰ اور معیاری ذوق رکھتے تھے۔ اپنی خوش مذاقی اور فراخ دلی کے باعث ادیبوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ ہمارے ساتھ وہ اکثر لاہور کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے اور چائے خانوں میں بیٹھ کر چائے بھی پیتے۔ ادیبوں سے ان کی دوستی تھی۔ وہ ان پبلشروں میں سے تھے جنہوں نے پاکستان میں اُردو کی اعلیٰ ترین کتابیں چھاپیں اور اس فن کو آغاز ہی میں ایک معیاری راہ پر ڈالا۔ میرے افسانوں کی پہلی کتاب ''منزل منزل'' (بلکہ میری پہلی کتاب) چودھری نذیر صاحب نے ہی چھاپی۔ اس زمانے میں کتابیں لیتھو پر چھپتی تھیں۔ مگر چودھری نذیر احمد کی لیتھو پر چھاپی ہوئی ادبی کتابیں سارے ملک کے اہل ذوق سے داد وصول کرتی تھیں۔ آج اگر آپ چودھری صاحب کی لیتھو پر چھپی ہوئی کتابیں دیکھیں تو وہ آف سیٹ پر چھپی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

چودھری صاحب کا ارادہ تھا کہ میری کتاب کا سرورق چغتائی صاحب سے بنوایا جائے۔ مگر کچھ ایسا اتفاق ہو گیا کہ چغتائی صاحب کسی اہم کام میں بے حد مصروف تھے۔ میں ذکر چغتائی صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا کر رہا تھا۔ نیا ادارہ کے مالک چودھری نذیر مجھے ساتھ لے کر عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے گھر گئے۔ مجھے یاد ہے یہ گھر بھاٹی اور ٹکسالی دروازے کے درمیان راوی روڈ پر سکھی قبرستان کی ایک بغلی گلی میں تھا۔ چغتائی صاحب کے کمرے میں کتنے ہی کینوس اِدھر اُدھر پڑے تھے اور وہ کھرل میں کوئی رنگ پیس رہے تھے۔ بس اس سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں رہا کہ چودھری نذیر

احمد نے اس عظیم مصور سے کیا باتیں کیں اور انہوں نے کیا جواب دیا۔ چغتائی صاحب کی مونچھیں ہٹلر کی طرح تھیں اور چہرے کے خدوخال مضبوط تھے۔ واپسی پر چودھری صاحب نے مجھے بتایا کہ چغتائی بے حد محنت کرتے ہیں۔ محنت ہی سے کسی فن میں گہرائی آتی ہے۔ چودھری صاحب کی ادب اور فن پر اور زندگی کے بعض دوسرے حقائق پر اس قسم کی تجربہ کارانہ اور دانش مندی کی باتیں میرے لئے بڑی مشعل راہ ثابت ہوئیں اور اس کے لئے ان کا آج بھی ممنونِ احسان ہوں۔ بہر حال اس کے بعد چغتائی صاحب کو میں اکثر دیکھتا۔ کبھی ''سویرا'' اور کبھی مکتبہ اُردو کے دفتر میں اور کبھی کسی ادبی مجلس میں۔ وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ اکثر انگریزی سوٹ میں ملبوس ہوتے اور ان کے سر پر قراقلی ٹوپی ہوتی تھی۔ چہرے پر دانشوروں جیسی متانت چھائی ہوتی۔

تاج الدین زریں رقم کی بیٹھک لوہاری کے اندر مٹی کے برتنوں کی ایک دکان کے اوپر ہوتی تھی۔ یہاں بھی میں چودھری نذیر کے ساتھ ہی گیا اور تاج الدین زریں رقم کے پہلی بار نیاز حاصل ہوئے۔ ایسے خوش نویس زمانہ بڑی دیر کے بعد پیدا کرتا ہے۔ اونچے لمبے، خوش شکل، بھرپور جوان، شگفتہ باتیں، بلند آہنگ آواز، فن میں یکتا۔ فن خوش نویسی کی تدریس اور اس فن کے نومشقوں کے واسطے ''اب ت'' کا قاعدہ لکھا جو آج بھی خوش نویس طلباء کی راہنمائی کرتا ہے۔ میں اس فن کی گہرائیوں سے واقف نہیں ہوں مگر لفظ کے حُسن کا مجھ پر بے پناہ اثر ہوتا ہے۔ زریں رقم سطر پر لفظوں کی صورت میں موتی پروتے تھے۔ خداداد صلاحیت کے مالک تھے۔ بڑی جلدی ہم سے جدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

سید محمد یوسف سدیدی بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ فلک نے ایسا خوش رقم بلکہ پاکیزہ رقم خوش نویس بھی کم دیکھا ہوگا۔ جیسا خوبصورت لکھتے تھے ویسے ہی خود بھی خوبصورت تھے۔ مجھے یاد ہے، شروع شروع میں جب ''امروز'' کو حسرت صاحب ایڈیٹ کیا کرتے تھے تو میں ایک روز یوسف صاحب کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ پھٹے سے ٹیک لگائے اخبار کی کوئی بڑی سرخی لکھ رہے تھے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"حافظ صاحب! آپ بڑے خوب صورت ہیں اور لکھتے بھی خوب صورت ہیں۔"

یوسف صاحب شرما گئے۔ بے حد کم گو اور شرمیلے تھے۔ مگر کیا حُسن اور بلاغت دی تھی اللہ نے ان کے قلم کو۔ ان کا قلم کاغذ پر یوں متوازن اور بھرپور قشقہ کھینچتا چلا جاتا کہ محسوس ہوتا یوسف صاحب کے قلم سے روشنائی نہیں نکل رہی بلکہ پورے کا پورا لفظ اپنی حسین ترین مکمل صورت میں نکل کر کاغذ پر نقش ہوتا چلا جا رہا ہے۔ سعودی عرب میں کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر جب وہ ہسپتال میں پڑے تو یہاں سبھی ان کی صحت یابی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا گو تھے لیکن موت کا تو ایک وقت معین ہوتا ہے، اسے کون ٹال سکتا ہے۔

گوجرانوالہ کے محمد حسین صاحب اپنے فن کے یکتائے زمانہ خوش نویس ہیں۔ مکتبہ اُردو، نیا ادارہ کے شعری مجموعوں کی تقریباً ساری کتابت انہی کے خط زرنگار کی مرہونِ منت ہے۔ میری پہلی کتاب "منزل منزل" کے دونوں الفاظ انہوں نے ہی لکھے تھے اور کیا زندہ جاوید الفاظ لکھ دیئے تھے کہ جو سرورق دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ محمد حسین صاحب زیادہ تر نظم لکھتے تھے اور سرخیاں۔ ان جیسا باکمال خوش نویس اب کہاں ملے گا۔ مجھے یاد ہے ہم "سویرا" کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ یہ 49-1948ء کی بات ہو گی۔ محمد حسین صاحب بھی موجود تھے۔ چودھری نذیر صاحب نے انہیں میری کتاب کا عنوان لکھ کر دیا اور کہا۔

"بس تم نے یہی دو الفاظ لکھنے ہیں اور یہی اس کتاب کا سرورق ہو گا۔"

محمد حسین صاحب مسکرا رہے تھے۔ کاغذ پر لکھے ہوئے "منزل منزل" کے الفاظ پڑھ کر سر کو اثبات کے انداز میں ہلایا اور کہا۔

"گاؤں جا کر لکھوں گا۔"

شاید ہفتہ دس دن کے بعد وہ لاہور آئے تو مطلوبہ الفاظ لکھ کر ساتھ لائے تھے۔ منزل منزل کے کتابت شدہ الفاظ کاغذ پر پڑے سانس لیتے محسوس ہو رہے تھے۔ محمد شفیع خوش نویس تھا۔ مکتبہ اردو اور نیا ادارہ کی اکثر نثری کتابوں کی کتابت اسی نے کی ہوئی

ہے۔ کس قدر بے مثال خوش نویس تھا۔ کس کس کا ذکر کروں۔ اس میدان میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ اب یہ فن بھی گوشہ نشین ہو گیا ہے۔ کیونکہ کتابیں کمپوز ہونے لگی ہیں۔ یہ کام اب مشینیں سرانجام دینے لگی ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں یہ نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔ زمانہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جس فن کی زمانے کو ضرورت ہوتی ہے وہ شکل بدل کر زمانے کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔

میں نے ریڈیو پاکستان سے اپنی وابستگی اور کچھ بے مثال فنکاروں کا ذکر شروع میں کیا تھا کہ جن کو قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ کثیر تعداد ایسے فنکاروں کی تھی جن کا قافلہ میرے سفر شروع ہونے سے پہلے گزر چکا تھا۔ ان کا ذکر میں ان اساتذہ کے حوالے سے بیان کروں گا جو ان سے مل چکے تھے اور جو ان فنکاروں کی فنی گہرائیوں سے بھی واقف تھے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے میں گزرے ہوئے قافلے کے فنکاروں کا ذکر کروں۔

محترم سراج نظامی لاہور کے جانے پہچانے ادیب، صحافی اور دانشور تھے۔ اپنے ایک مضمون میں لاہور کے کچھ نابغہ روزگار فنکاروں کا تذکرہ انہوں نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ لاہور کے نامور کلاسیکل موسیقار استاد کالے خان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''آپ پنجاب کے مردم خیز خطے قصور کے کلاونت خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ استاد کالے خاں کا رنگ بہت سیاہ تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور تن و توش پہلوانوں جیسا تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ انہیں کالے خاں کے نام سے پکارا جاتا۔ طبیعت عجب پائی تھی۔ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ عام لوگوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ ایک مرتبہ اپنے استاد فتح علی خاں سے مل کر گانے لگے تو مقابلے پر اتر آئے۔ فتح علی خان نے شاگرد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جارے پگلے۔'' بس اسی دن سے ان کی طبیعت میں ایک جنون کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

کالے خاں نے پنجاب اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں اپنے فن کا

مظاہرہ کیا اور استادوں سے داد وصول کی۔ آپ خیال یا ترانہ گاتے اور تانیں مارتے تو یوں لگتا جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہے۔ مجھے (محترم سراج نظامی) اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار کالے خاں اور بھائی روڑہ گا رہے تھے۔ میں ان دنوں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ میں پڑھتا تھا۔ مجھے ان کی تانیں بھاٹی گیٹ سکول کی گراؤنڈ میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کالے خاں حویلی میاں خان کے سامنے کٹڑہ نادر شاہ میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن کالے خاں نے خوب گھی اور مصالحے ڈال کر گوشت بھونا اور دیگچی کو الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ اتفاق سے پولیس کسی چوری کی تفتیش کے سلسلے میں محلے میں آ گئی۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ایک کوٹھڑی میں ایک کالا کلوٹا پہلوان لنگوٹ باندھے بیٹھا ہے تو انہوں نے شبہ میں ان کی کوٹھڑی کی بھی تلاشی لینی چاہی۔ کالے خاں اچھل کر کھڑے ہو گئے اور الماری کے ساتھ پشت لگا کر بولے۔

''الماری کے سوا ہر جگہ کی تلاشی لے لو۔''

پولیس والوں کا شبہ یقین میں بدل گیا اور سپاہی الماری کی تلاشی لینے پر مُصر ہوئے۔ لیکن جب تلاشی لی گئی تو اس میں سے بھنے ہوئے گوشت والی دیگچی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ پولیس والے ہنسنے لگے۔ کالے خاں نے کہا۔

''اب یہ گوشت تم ہی لے جاؤ۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ اسے نظر لگ گئی ہے۔''

کالے خاں کا معمول تھا کہ ہر روز گوشت بھونتے، تیل، صابن اور لنگوٹ ایک چھتری میں ڈالتے اور ٹکسالی دروازہ کے باہر کارپوریشن کے باغ میں پہنچ جاتے۔ چھتری زمین میں گاڑ دیتے، لنگوٹ کستے، تیل ملتے اور پھر دونوں ہاتھوں کے نیچے دو اینٹیں رکھ کر ڈنڈ لگاتے۔ ساتھ ساتھ تانیں بھی مارتے جاتے۔ کسرت کے بعد نہر میں نہاتے، گوشت کھاتے اور واپس چل پڑتے۔

ایک مرتبہ اسی حالت میں آ رہے تھے کہ کسی نے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور پردیپکی راگ سنانے کی فرمائش کی۔ کالے خاں کہنے لگے۔ ''یہ کون سا راگ ہے؟'' پھر

چند سیکنڈ کے بعد کہا۔

''لو بھئی، پردیسکی راگ آ گیا ہے۔''

پھر جو راگ شروع کیا تو ایک سماں بندھ گیا۔

ایک دفعہ لاہور کے ایک مشہور ڈیرہ دار نے موسیقی کی محفل منعقد کی اور کالے خان کو بھی گانے کی دعوت دی۔ قصور کے نامور سارنگی نواز استاد غلام محمد سے کالے خاں کی بول چال نہیں تھی۔ لوگوں نے خواہش کی کہ کالے خاں گائیں اور استاد غلام محمد سارنگی نواز ان کے ساتھ سنگت کریں۔ جن لوگوں نے یہ محفل دیکھی ہے اور کالے خاں کا گانا اور غلام محمد کی سارنگی سنی ہے وہ آج بھی سر دُھنتے ہیں۔ دونوں فنکاروں نے اپنے فن کا پورا زور صرف کر دیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں فنکار رونے لگے اور روتے روتے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ یوں دونوں کی صلح ہو گئی۔

کالے خاں کی وفات سے چند روز پہلے کا واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں گانا سنایا جہاں سے کافی انعام ملا۔ کالے خاں سیدھے دریائے گومتی پر پہنچے، پچاس روپے دریا میں پھینک کر کہا۔ ''اے خواجہ خضر! یہ تیری نذر ہیں۔''

اس کے بعد لکھنؤ کے ایک بازار میں سیدھے اصغر علی، محمد علی عطر فروشوں کی دکان پر پہنچے اور آدھی سے زیادہ رقم کا عطر خرید لیا۔ وہیں کھڑے کھڑے تھوڑا سا عطر اپنے کپڑوں پر لگایا اور باقی سارا عطر اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر مل دیا۔ عطر والوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''خان صاحب! یہ کیا، کیا آپ نے؟''

کالے خاں نے کہا۔ ''بھیا! یہ کپڑے تو یہیں رہ جائیں گے۔ مونچھیں تو قبر میں بھی ساتھ جائیں گی۔''

اس کے کچھ روز بعد کالے خاں کا انتقال ہو گیا۔

◎......◎

جہاں تک مجھے یاد ہے خان صاحب فیاض خان صاحب کی جو تصویر ان کے ریکارڈ کے لفافے پر چھپی ہوئی تھی اس میں انہوں نے پگڑی نہیں باندھی ہوئی تھی بلکہ کالے رنگ کی گول ٹوپی پہن رکھی تھی جیسا کہ بعد میں، میں نے کلاسیکل موسیقی کے استادوں کی زبانی سنا۔ فیاض خان صاحب کی گائیکی کا تعلق آگرہ گھرانے سے تھا۔ راگ گانے کا ان کا انداز دوسرے تمام گویوں سے مختلف تھا۔ لڑکپن کے زمانے میں، میں ان کے ریکارڈ ضرور سنا کرتا تھا۔ مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ آگرہ گھرانے کی گائیکی گاتے ہیں۔ ان کے گانے کے انداز میں ایک رعب، گھن گرج اور دبدبہ ہوتا تھا جو مجھے معلوم نہیں کیوں اچھا لگتا تھا۔ والد صاحب کو بھی کلاسیکی گانے کی اتنی سمجھ نہیں تھی۔ لیکن وہ بھی خان صاحب فیاض خان کا گانا بڑے شوق سے سنتے تھے۔

پاکستان کے قیام کے بعد جب میں ریڈیو سٹیشن پر بطور سٹاف آرٹسٹ ملازم ہوا اور میرا اٹھنا بیٹھنا فن موسیقی کے یگانۂ روز اور استاد موسیقاروں کے ساتھ ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ خان صاحب کا تعلق آگرہ گھرانے سے ہے۔ جس طرح کہ ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کا تعلق کیرانہ گھرانے سے تھا اور اس گھرانے کے سب سے بڑے گائیک خان صاحب عبدالکریم خان صاحب تھے۔ خان صاحب عبدالکریم خان کے سُروں کا لگاؤ، ان کی آواز کا درد و سوز برصغیر میں اور کسی گائیک کو نصیب نہیں ہوا۔ ان صاحب کی آواز میں ایک وجد طاری کر دینے والی کیفیت تھی۔

ان کے مقابلے میں خان صاحب فیاض خان کی گائیکی شیر کی گائیکی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی قدرت نے ان کی گھن گرج والی آواز میں ایک رقت سی پیدا کر دی تھی۔ کم

از کم مجھے اس وقت بھی جب میری عمر نو دس برس کی تھی اور آج بھی خان صاحب کی کیسٹ سن کر یہی محسوس ہوتا ہے۔ موسیقی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ خان صاحب فیاض خان آگرہ گھرانے کی گائیکی کے سب سے پہلے اور سب سے آخری باکمال اور بے مثال گائیک تھے۔ ایک سکھ سردار جی فیاض خان صاحب کے شاگرد تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ ایک بار جالندھر ٹی وی پر انہوں نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ میں نے گائیکی کا یہ فن فیاض خان صاحب کی خدمت میں رہ کر سیکھا ہے اور وہ میرے استاد تھے۔ یہ سردار جی بالکل فیاض خان صاحب کی طرح گاتے تھے اور بڑے جذبے اور لگن کے ساتھ گاتے تھے۔ ان سردار جی کے بعد میں نے کسی کو فیاض خان صاحب کی گائیکی گاتے نہیں سنا۔ فیاض خان صاحب نے ایک ریکارڈ میں راگ بسنت گایا تھا جس کے بول اگر میں بھول نہیں رہا تو اس طرح تھے:

"تو بھی گھر والیا پھول"

پاکستان میں خان صاحب امید علی خان لاہور ریڈیو سٹیشن پر کلاسیکل گاتے تھے۔ یہ بات میرے علم میں نہیں کہ ان کا تعلق کس گھرانے سے تھا۔ میں اس بحث میں اس سے آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آگے کلاسیکی موسیقی کا سمندر ہے اور میں چھوٹی چھوٹی نہروں کا تیراک ہوں۔ اس مسئلے پر سعید ملک صاحب زیادہ تفصیل سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ وہ اس سمندر کے تیراک ہیں۔ میں نے میوزک ڈائریکٹر اور نامور موسیقار میاں شہریار کو فون کر کے اس سے آگرہ گھرانے کے بارے میں اپنی ضرورت کے مطابق جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں وہ میں نے لکھ دی ہیں۔ باقی اگر میری طرف سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہو جس کا امکان موجود ہے تو میں اس فن کے استادوں سے معذرت چاہوں گا اور اگر وہ مجھے خط لکھ کر میری کسی غلطی کی تصحیح فرما دیں تو میں ان کا شکر گزار ہوں گا کیونکہ میرا اصل مقصد یہاں کلاسیکی موسیقی کے اسرار و رموز بیان کرنے کی کوشش کرنا نہیں بلکہ برصغیر میں ان مسلمان فنکاروں کے بارے میں لکھنا ہے جو کلاسیکی موسیقی کے بادشاہ بھی تھے اور بادشاہ گر بھی تھے۔

ریڈیو پر موسیقی کے پروگراموں کے سلسلے میں کبھی کبھی مجھے میوزک کے کسی پروڈیوسر کے ساتھ خان صاحب برکت علی خان اور ان کے چھوٹے بھائی خان صاحب مبارک علی خان کی بیٹھک پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ بلکہ جب کبھی مجھے پتہ چلتا تھا کہ ریڈیو کا کوئی پروڈیوسر پروگرام کے سلسلے میں شاہی محلے جا رہا ہے تو میں بھی اس کے ساتھ ریڈیو کی گاڑی میں بیٹھ جاتا تھا۔ خان صاحب مبارک علی خان اپنے دونوں بڑے بھائیوں یعنی بڑے غلام علی خان اور برکت علی خان کے مقابلے میں زیادہ وجیہہ، خوبصورت اور گورے چٹے تھے۔ قیامِ پاکستان سے پہلے ایک پنجابی فلم سوہنی مہینوال میں مبارک علی خان نے ہیرو کا رول بھی ادا کیا تھا۔ مبارک علی خان کلاسیکل بھی گاتے تھے اور ٹھمری غزل بھی گاتے تھے اور خوب گاتے تھے۔ ایک بار ان کی بیٹھک میں دلی کے سردار خان صاحب کے نیاز حاصل ہوئے۔ درمیانی عمر کے دبلے پتلے آدمی تھے۔ مبارک علی خان اور ریڈیو پاکستان کے دوسرے کئی لوگ بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ریڈیو پر وہ کلاسیکل گاتے بھی تھے۔

میاں شہریار سے میں نے سردار صاحب کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ سردار صاحب استادوں کے استاد تھے۔ ان کی گائیکی اگرچہ میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی تھی لیکن وہ جب بھی پروگرام کرنے ریڈیو سٹیشن آتے تو میں بڑے ادب سے انہیں سلام کیا کرتا تھا اور کوشش کیا کرتا تھا جس کمرے میں سردار صاحب بیٹھے ہیں میں بھی وہاں بیٹھوں اور ان کی باتیں سنوں۔

آفتاب احمد خان نے اپنے خط میں دین محمد المعروف دینا قوال جالندھری کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمارے گھر میں قوالیوں کے ریکارڈ بھی تھے۔ ان میں پنجابی کی ایک قوالی کے بول تھے۔

جاگو جاگو جاگو ، جاگو ہوا سویرا

یہ قوالی رمضان المبارک میں روزہ داروں کو سحری کے وقت جگانے کے خیال کو سامنے رکھ کر گائی گئی تھی۔

دوسری قوالی کے بول تھے۔

حجابوں کا پردہ ہٹا دیجئے گا

ذرا رُخ سے پردہ اٹھا دیجئے گا

میرا خیال ہے کہ یہ دونوں قوالیاں دین محمد عرف دینا قوال جالندھری کی گائی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں ہمارے پاس محمد علی فریدی قوال، آغا بشیر احمد فریدی قوال، مبارک علی، فتح علی قوال، تابا قوال، دِلّی والے ممتاز قوال، کلن قوال، کالو قوال اور ایک قوال جس کا نام شاید فیض یا فیاض قوال تھا، ان کی قوالیوں کے ریکارڈ بھی تھے۔ یہ سب مسلمان فنکار تھے اور قوالی کا فن ان لوگوں کے دم قدم سے شہرت کی بلندیوں پر تھا۔ ان کے علاوہ بھائی چھیلا پٹیالے والا اور بھائی دیلسا امرتسری کے ریکارڈ بھی تھے۔ بھائی چھیلا پٹیالے والا کے پنجابی لوک گیتوں اور بھائی دیلسا کے گائے ہوئے مرزا صاحباں کی بڑی شہرت تھی۔ ملکہ پکھراج کے دو ریکارڈ ہمارے پاس تھے۔ ایک ریکارڈ میں انہوں نے حفیظ جالندھری کے گیت ''لو پھر بسنت آئی'' اور ''ابھی تو میں جوان ہوں'' گایا تھا۔ دوسرے ریکارڈ کی ایک جانب انہوں نے غالب کی غزل اور دوسری جانب داغ کی غزل ''زاہد نہ کہہ بری کہ یہ دیوانے آدمی ہیں'' گائی تھی۔ یہ ریکارڈ بھی لوگ بڑے شوق سے سنتے تھے بلکہ ملکہ پکھراج کے گائے ہوئے پہاڑی لوک گیتوں کا بھی بڑا شہرہ تھا۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں اختری بائی فیض آبادی کی گائی ہوئی غزلوں کے دو تین ریکارڈ بھی ہمارے پاس تھے۔ خاص طور پر ان کی گائی ہوئی بہزاد لکھنوی کی غزل ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے'' کی تو بڑی دھوم تھی۔

اس زمانے میں یہ عام رواج تھا کہ گانے کے آخر میں گلوکار اپنا نام ضرور بتاتا تھا۔ یعنی جب گانا ختم ہوتا تھا تو گلوکار انگریزی میں یا اُردو میں اپنا نام بول دیتا تھا۔ مجھے یاد ہے کالو قوال ریکارڈ کے آخر میں اپنی باریک آواز میں کہتا تھا۔

''مائی نیم اِز کالو قوال۔''

اسی طرح اختری بائی فیض آبادی بھی ریکارڈ کے آخر میں اپنا نام دہراتی تھی۔ مگر وہ

صرف اختری بائی فیض آبادی ہی کہتی تھی۔ بھائی چھیلا بھی ریکارڈ کے ختم ہونے پر اپنا نام ''بھائی چھیلا پٹیالے والا'' بولتا تھا۔

ہمارے گھر والا گراموفون فرش سے کوئی چار ساڑھے چار فٹ اونچا تھا اور لکڑی کی ایک بڑی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک سٹول تھا۔ جب گھر میں والد صاحب نہیں ہوتے تھے تو میں اپنی پسند کے ریکارڈ بجا کر سنا کرتا تھا اور ریکارڈ کے آخر میں گانے والے کا نام بڑے شوق سے اور کان لگا کر سنتا تھا۔ ہر گلوکار اپنا نام نہیں دہراتا تھا۔ کلاسیکل راگ گانے والے فنکار ریکارڈ کے آخر میں اپنا نام نہیں بولتے تھے۔

ان روایتی گلوکاروں کے علاوہ کچھ اور مسلمان فنکار بھی تھے جن کا تعلق سینما اور تھیٹر سے تھا مگر ان کے گائے ہوئے نغموں اور غزلوں کے ریکارڈ بھی بازار میں بکتے تھے اور لوگ انہیں شوق سے سنتے تھے۔ ان میں اس زمانے کے مشہور و معروف ہیرو ماسٹر نثار کی فلموں کے اداکار اشرف خان کے گائے ہوئے نغموں اور گیتوں کی گونج ہر جگہ سنائی دیتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ تھیٹر اور فلموں میں بے شمار گانے ہوتے تھے اور کلاسیکی اور نیم کلاسیکی انداز میں گائے جاتے تھے۔ چنانچہ یہ ضروری تھا کہ گانے والا کلاسیکل راگ گانا جانتا ہو۔

میری عمر یہی کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی کہ امرتسر کے امرت ٹاکیز میں فلم لیلیٰ مجنوں لگی۔ اس فلم میں کجن نے لیلیٰ کا اور ماسٹر نثار نے مجنوں کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلمی جوڑی اس زمانے میں بڑی مشہور تھی۔ میں نے اپنے آرٹسٹ بھائی کے ساتھ یہ فلم شاید دو آنے کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس بنچ پر بیٹھ کر دیکھی تھی۔ پوری طرح یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ تھوڑی سی فلم چلتی تھی اور لیلیٰ مجنوں کوئی نہ کوئی غزل ڈوئیٹ کی شکل میں گانا شروع کر دیتے تھے۔ اگر دونوں الگ الگ ہوتے تو تھوڑی دیر بعد گانے کا موقع ہو یا نہ ہو، اکیلی لیلیٰ یا اکیلا مجنوں ہی گانا شروع کر دیتا تھا۔ لوگ اتنے سادہ دل تھے یا اس زمانے میں لوگوں کو موسیقی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ سینما ہال میں خاموشی چھا جاتی تھی اور لوگ کہانی کی سچوایشن کی پرواہ کیے بغیر گانا ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے۔ اس فلم لیلیٰ مجنوں کی

ایک غزل جو مجنوں یعنی ماسٹر نثار نے لیلیٰ کے فراق میں گائی تھی مجھے یاد رہ گئی ہے۔ صرف اس کا مطلع ہی یاد ہے۔ کسی استاد شاعر کا مطلع لگتا ہے۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا
جھونکا ہوا کا جیسے اِدھر سے اُدھر گیا

یہ ریکارڈ بھی ہمارے گھر میں ریکارڈوں کے ڈبے میں موجود تھا اور میں اسے لگا کر سنا کرتا تھا۔ اس کی طرز آج بھی مجھے پوری کی پوری یاد ہے۔

امرتسر کے کمپنی باغ میں ایک بارہ دری ہوا کرتی تھی۔ میں اس بارہ دری میں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ آس پاس پلاٹ میں کوئی آدمی نہیں ہے تو میں گھر میں سنے ہوئے ریکارڈوں کے گانوں کی نقل اُتارا کرتا تھا۔ راگوں کی تو مجھے بالکل سمجھ نہیں ہوتی تھی۔ بس حافظے کے زور پر سہگل، پنکج ملک اور خان صاحب عبدالکریم خان کے گانوں کی نقل اتارنے لگتا تھا۔

ایک دن میں بارہ دری میں بیٹھا کسی کلاسیکل گویے کے گائے ہوئے پکے راگ کی نقل اتار رہا تھا کہ تین چار کوے بارہ دری کے کنارے پر آ کر بیٹھ گئے اور میری طرف منہ کر کے زور زور سے کائیں کائیں کرنے لگے۔ میں نے ان کی بالکل پرواہ نہ کی اور بدستور اونچی آواز میں پکا راگ گاتا رہا۔ کوؤں نے بھی اونچی آواز میں کائیں کائیں کا شور مچانا شروع کر دیا۔ یہ معمہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ کوے پکا راگ گا رہے تھے یا میں کائیں کائیں کر رہا تھا۔

سہگل، کانن دیوی، پنکج ملک، ملکہ پکھراج اور اختری بائی کے گانوں کی نقل میں اپنی طرف سے پوری کی پوری اتار لیتا تھا۔ ان کے ریکارڈ میں گراموفون کے بالکل ساتھ لگ کر شوق سے سنتا تھا۔ جب ریکارڈ پر سوئی اٹک جاتی تو جلدی سے ساؤنڈ بکس کو آگے کر دیتا۔ گراموفون کو چابی دینی پڑتی تھی۔ چابی دینے سے اس کے اندر لگا ہوا لنر کس جاتا اور ریکارڈ کی ایک سائیڈ پوری سنی جا سکتی تھی۔ خطرہ صرف اس بات کا ہوتا تھا کہ کہیں چابی دیتے دیتے لنر نہ ٹوٹ جائے۔ گراموفون کے لنر کا ٹوٹ جانا ایک بہت

بڑا حادثہ ہوتا تھا۔ پھر لٹر نکال کر مستری کے پاس لے جایا جاتا یا سارے کا سارا گراموفون باجہ مستری کی دکان پر لے جانا پڑتا تھا۔ ایک بار میں نے چابی ذرا زیادہ دے دی اور کٹاک کی آواز کے ساتھ گراموفون کا لٹر ٹوٹ گیا۔ میں بھاگ گیا۔ والد صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے اپنے خاص پہلوان ٹائپ کے جاسوس میری تلاش میں چھوڑ دیئے۔ وہ مجھے کمپنی باغ سے پکڑ کر والد صاحب کے سامنے لے آئے۔ والد صاحب نے میری اتنی ٹھکائی کی کہ سارے سہگل، سارے پنکج ملک اور سارے کلاسیکی گویے میرے اندر سے نکل کر بھاگ گئے۔

صوفیانہ کلام اور نعت خوانی میں محمد ایمن آبادی صاحب کا لہجہ سب سے الگ اور سادہ مگر پُر اثر تھا۔ اس دور میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں شاید ہی پنجاب میں کسی مسلمان کا کوئی گھر ایسا ہو گا کہ جس گھر میں مولوی نور محمد ایمن آبادی کا کوئی ریکارڈ نہ ہو۔

اب میں اس استاد فنکار کا ذکر کروں گا جس کے تذکرے کے بغیر برصغیر میں مسلمان فنکاروں کے عظیم ورثے کے موضوع کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس بڑے موسیقی دان کا نام عالمگیر خان تھا اور وہ کلارنٹ نواز تھے۔ ان کا تعلق موسیقی کے کسی بھی گھرانے سے نہیں تھا۔ وہ امرتسری کشمیری تھے۔ سرخ و سفید رنگ تھا۔ صحت مند، بھاری بھرکم بدن تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ کلاہ مشہدی پہنتے تھے۔ سیاہ اچکن میں ملبوس ہوتے تھے۔ ان کی اپنی بینڈ پارٹی تھی جس کا ہر سازندہ صاف ستھری اور اعلیٰ ترین ایک جیسی وردی میں ہوتا تھا اور ساز بجانے میں سازندہ اپنے فن کا ماہر تھا۔ عالمگیر صاحب کی بینڈ پارٹی کی شہرت سارے پنجاب میں تھی اور امراء اور صاحب حیثیت لوگ بیاہ شادی پر دوسرے شہروں سے بھی عالمگیر خان کی پارٹی کو خصوصی طور پر بلاتے تھے۔ عالمگیر خان کو کلارنٹ بجانے میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔ انہیں راگ داری اور کلاسیکی علم موسیقی پر عبور حاصل تھا۔ بارات کے آگے آگے اپنی پارٹی کے ساتھ وہ عام طور پر اس زمانے کی کوئی مشہور فلمی دُھن بجاتے ہوئے جاتے تھے۔ بارات میں اگر کوئی کلاسیکی

موسیقی سے شغف رکھنے والا ہوتا تھا تو اس کے کہنے پر کوئی راگ بھی بجا دیتے تھے۔ لیکن فلمی گیت کی بندش بھی جس راگ میں ہوتی تھی، راستے میں فلمی دھن بجاتے بجاتے رک جاتے تھے اور اس راگ کی سرگم اس انداز سے کرتے تھے کہ راگ جاننے والے تو تڑپ اٹھتے تھے۔ لیکن جو کلاسیکی موسیقی کے رموز سے واقف نہیں ہوتے تھے ان کے بھی سر ہل جاتے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے گوہر نایاب استاد صادق علی خان مانڈو جو کلاسیکی فنِ موسیقی کے استاد تھے اور کلارنٹ نوازی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا اور موسیقی کے بارے میں جن کی رائے کو بڑے سے بڑا گویا بھی مستند سمجھا کرتا تھا، کہا کرتے تھے کہ عالمگیر ایسا کلارنٹ بجانے والا شاید ہی پھر پیدا ہو۔

(تمت بالخیر)